پاکستانی معیشت کی صورت حال
مسائل، اسباب اور لائحہ عمل

پروفیسر خورشید احمد

PRESS

آئی پی ایس پریس، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے
ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
© IPS Press 2021

پاکستانی معیشت کی صورت حال، مسائل، اسباب اور لائحہ عمل

پروفیسر خورشید احمد

انتخاب، ترتیب و تدوین: خالد رحمٰن

معاونت: محمود فاروقی، سلمان طاہر

ISBN: 978-969-448-809-7

جملہ حقوق محفوظ ہیں: آئی پی ایس پریس، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا ترجمہ کی اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹوریج جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جا سکتی۔

۳۳۰،۹۵۴۹۱ پاکستانی معیشت کی صورت حال، مسائل، اسباب اور لائحہ عمل
خ ور خورشید احمد، پروفیسر
اسلام آباد: آئی پی ایس پریس، ۲۰۲۱ء
۲۸۶ صفحات مع اشاریہ
۱۔ پاکستان - معاشی حالات ۲۔ پاکستان اور عالمی مالیاتی ادارے ۳۔ بجٹ ۰۵-۲۰۰۴ء تا ۱۱-۲۰۱۰ء ۴۔ دفاعی اخراجات
۵۔ قیمتیں ۶۔ بجلی ۷۔ زراعت ۸۔ ٹرانسپورٹ ۹۔ مائیگریشن ۱۰۔ ہاؤسنگ پالیسی

آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سینٹر، E-11/3، اسلام آباد
فون: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۱ فیکس: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۰
ای میل: publications@ips.net.pk
ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk
فیس بک: IPSPressInternational

سرورق: آصف تیموری

الفاظ و صفحہ سازی: طاہر احمد عباسی، محمد عالم

طباعت: پریمئر پرنٹرز، راولپنڈی

فہرست

○ پیش لفظ V

○ تعارف VII

حصہ اوّل

- پاکستانی معیشت پر عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملی کے اثرات (۱) ۰۳
- پاکستانی معیشت پر عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملی کے اثرات (۲) ۳۱
- معاشی صورت حال اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بوجھ ۴۱
- پاکستانی معیشت کے مسائل اور ٹیکسوں کا نظام ۵۱
- معیشت کی صورت حال اور حکومتی دعوے [پالیسیوں کی تشکیل میں درست حقائق کی اہمیت] ... ۶۳
- قومی بجٹ اور ملکی معاشی پالیسیاں: صورت حال اور تجاویز ۸۳
- قومی بجٹ میں دفاعی اخراجات کی تفصیلات اور پارلیمنٹ کا کردار ۱۰۵

حصہ دوم

- قومی بجٹ (۰۵-۲۰۰۴): تبصرہ و تجاویز ۱۱۹
- قومی بجٹ (۰۷-۲۰۰۶): تبصرہ و تجاویز ۱۴۵
- قومی بجٹ (۰۹-۲۰۰۸): تبصرہ و تجاویز ۱۵۷
- قومی بجٹ (۱۰-۲۰۰۹): تبصرہ و تجاویز ۱۷۹
- قومی بجٹ (۱۱-۲۰۱۰): تبصرہ و تجاویز ۱۹۳

حصہ سوم

- قیمتوں میں اضافہ کا رجحان: اسباب اور لائحہ عمل ۲۰۹
- تیل کی قیمتیں اور فراہمی کے مسائل ۲۲۱
- بجلی کی پیداوار، قیمتوں کا تعین اور تقسیم کا نظام ۲۳۳
- زراعت و خوراک کے مسائل ۲۴۳
- ادویات کی قیمت، قلت اور معیار ۲۵۱
- ٹرانسپورٹ، مائیگریشن اور ہاؤسنگ پالیسی ۲۵۷
- اشاریہ ۲۶۳

پیش لفظ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ ایک جانب دیگر ہزاروں مخلوقات کی طرح اس کی جسمانی اور طبعی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام فرمایا، تو دوسری جانب اس کا رتبہ ان تمام مخلوقات سے بلند کر کے اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی نشوونما کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سوا لاکھ کے قریب انبیاء علیہم السلام دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں مبعوث فرمائے، یہ سلسلہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا۔ ان انبیاء کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ ہدایت کے لیے وحی کا ایک سلسلہ شروع کیا جو قرآنِ کریم پر منتج ہوا۔ آخری پیغمبر ﷺ کی آمد کے ساتھ جہاں کارِ نبوت تکمیل کو پہنچا، وہیں قرآنِ کریم کی تکمیل کے ذریعے الہامی ہدایت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ یوں قرآن و سنت کی صورت میں ایک ایسا نقشۂ زندگی انسانیت کو میسر آگیا جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر دائرے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور علم و عمل کے نئے ذرائع کی دریافت نے انسان کو کسی حد تک آزادیِ فکر سے نوازا تو وہ اس خام خیالی کا شکار ہو گیا کہ وہ اب الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ظلم، عدم مساوات اور طاغوتی طاقتوں کے غلبے کی صورت میں نکلا۔ اسی خام خیالی نے دنیا کو اس استعماری نظام کے شکنجے میں لا ڈالا جس کی ہر صورت افراد اور اقوام کے استحصال پر منتج ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے فی زمانہ انسانی زندگی کے تمام دائرے اور تمام شعبے اس سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اس پر مستزاد وہ ذہنی پسماندگی اور مغلوبیت کی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی متبادل کی تلاش میں انسانوں کی اکثریت سرگرداں ہونے کے باوجود محروم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تحقیق، تصنیف و تالیف، اور سیاسی تحرّک میں گزارا ہے۔ اس پورے عرصے میں میری کوشش یہی رہی کہ حتمی الہامی ہدایت یعنی قرآن و سنت کی

جامع تعلیمات کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ علمی و عملی جدوجہد کے دوران یہ مقصد میرا مرکزِ نگاہ تھا کہ اپنی صلاحیت اور دائرہ اختیار کے مطابق وطنِ عزیز پاکستان کو بالخصوص اور عالمِ انسانیت کو بالعموم استعماری گرفت سے آزاد کروا کر فلاح و ہدایت کے اس راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کیا جاسکے جو الہامی ہدایت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ضمن میں نظریاتی و عملی پہلوؤں پر میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں اور بے شمار مواقع پر گفتگو کی صورت میں اپنے خیالات کا ابلاغ کیا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ گزشتہ دہائیوں میں مربوط صورت میں شائع بھی ہوا ہے لیکن ایک بہت بڑا لوازمہ ابھی ایسا موجود ہے جسے ترتیب دینے کی ضرورت باقی ہے۔ یہ فرض انجام دینے کی خواہش میں کئی برس سے اپنے اندر پاتا ہوں لیکن صحت کی صورت حال کے باعث یہ ممکن نہ ہوسکا کہ اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے کر اسے اشاعت کے لیے مرتب کرسکتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ساتھیوں نے برادرم خالد رحمٰن کی سربراہی میں اس ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ پہلے مرحلے میں پاکستان کی نظریاتی اساس، ملک میں آئینی جدوجہد، طرزِ حکمرانی کے سوال، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون، اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق اور جاری کشمکش، اور معاشی صورت حال اور امکانات جیسے موضوعات پر سات کتب مرتب ہوچکی ہیں۔ کچھ دنوں میں تین اور کتب بھی مکمل ہونے کو ہیں، ان شاء اللہ۔ ان کتب کا حصہ بننے والے بیشتر مضامین میری سینیٹ کی تقاریر پر مبنی ہیں جبکہ دیگر مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے جن کو اب یکجا کردیا گیا ہے۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ یہ لوازمہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنے لیے خالص کرلے۔

پروفیسر خورشید احمد

لیسٹر، برطانیہ

۲۸ مئی ۲۰۲۱

تعارف

پاکستان کی معیشت پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کی ابتدا بہت کمزور تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اساسی ڈھانچہ میں بہت سی بہتری آئی اور دوسری جانب ایک طویل عرصہ تک پاکستان کی گروتھ کا مجموعی اوسط بھی مناسب یعنی ۵ فیصد سالانہ رہا ہے۔ تاہم بعد کے سالوں میں بہتری کا یہ عمل مسلسل اتار چڑھاؤ کا شکار رہا ہے۔ اس وقت تو بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ معیشت کے دائرہ میں پاکستان شدید دباؤ کا شکار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں معیشت کا دباؤ محض معیشت تک محدود نہیں رہتا بلکہ سیاسی وسماجی دائروں میں بھی اس کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاتے ہیں۔ زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ مجموعی صورت حال بہتری کی بجائے مسلسل ابتری کی جانب جارہی ہے لیکن حکومتوں کی تبدیلی کے باوجود بنیادی مسائل جوں کے توں محسوس ہوتے ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد نے سینیٹ آف پاکستان کے رکن کی حیثیت سے کم وبیش ۲۱سال خدمات انجام دی ہیں۔ اپنے وسیع مطالعہ اور تجربہ کی بنیاد پر وہ دستور قانون، مذاہب عالم، تعلیم، سماجیات، سیاسیات سمیت زندگی کے بہت سے اہم دائروں میں اعلیٰ علمی و عملی استعداد کے حامل ہیں اور اسی لیے سینیٹ کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے ان میں سے ہر ہر میدان میں قومی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ معاشیات ان کا خصوصی میدان ہے، چنانچہ ملک کی دگرگوں معاشی صورت حال، نظام کی خرابیاں اور اصلاح احوال کے لیے تجاویز سینیٹ میں ان کی گفتگوؤں اور تقاریر کا مسلسل عنوان رہا ہے۔ زیر نظر کتاب پروفیسر صاحب کی ان ہی میں سے کچھ منتخب تقاریر پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چند تقاریر ۱۹۹۰ کے عشرے سے متعلق ہیں لیکن زیادہ تر وہ ہیں جو ۲۰۰۰ء کے عشرے میں سینیٹ میں کی گئی ہیں۔

سینیٹ کی کاروائی سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ یہاں گفتگو کے اپنے قواعد وضوابط

ہوتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر بحث کرانی مقصود ہو تو اسے تحریک پیش کرکے متعارف کرانا ہوتا ہے اور اگر وہ مسئلہ بحث کے لیے منظور ہو جائے تو اس پر مفصل گفتگو کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس کتاب میں دونوں ہی طرح کی تقاریر شامل ہیں۔ انتخاب کرتے وقت یہ پہلو سامنے رہا ہے کہ تقریر مختصر ہو یا نسبتاً طویل، اس میں کہی گئی بات کی محض وقتی اہمیت نہ ہو بلکہ وہ آج کے پالیسی مباحث میں بھی اہمیت کی حامل ہو۔

دوسرے کسی بھی موضوع کے مقابلہ میں معاشیات کا معاملہ یہ ہے کہ اس پر گفتگو میں اعدادوشمار کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بیشتر صورتوں میں یہ اعدادوشمار کسی خاص وقت سے متعلق ہوتے ہیں اور یوں سیاق وسباق کا حصہ ہوتے ہیں۔ ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے اعدادوشمار کو اب پڑھا جائے تو وہ مذاق معلوم ہونے لگتے ہیں کہ محض چند لاکھ یا چند ملین روپوں کے حوالہ سے کسی خاص پالیسی یا حکومتی اقدام کو اس قدر تفصیل سے کیوں زیر بحث لایا جارہا ہے۔ جبکہ اب ان ہی معاملات میں بات اربوں روپے سے بڑھ کر کھربوں روپے تک پہنچنے لگی ہے۔ ایسے میں آج کے سیاق وسباق میں بعض پرانے اعدادوشمار کسی حد تک غیر متعلق اور غیر اہم ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب اعدادوشمار سے بھری تحریر بہت سے قارئین کے لیے بوجھل ہوتی ہے۔

ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے کوشش کی ہے کہ تجزیہ اور دلائل کو متاثر کیے بغیر اعدادوشمار کو حذف یا کم از کم کر دیا جائے۔ جبکہ ساتھ ہی بعض مقامات پر حاشیہ قائم کر کے تازہ ترین اعدادوشمار کی جانب اشارہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اس مشق سے اضافی طور پر یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ پاکستانی معیشت کے حوالہ سے اعداد و شمار کے حجم میں تو بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں لیکن مسائل کی نوعیت میں بہت کم کوئی فرق پڑا ہے، اور اگر فرق پڑا بھی ہے تو اس کی سمت بالعموم منفی ہے۔ بلاشبہ یہ تشویش کی بات ہے اور اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے کہ ملکی معیشت میں خرابی ایک دن میں رونما نہیں ہوئی بلکہ آج یہ جس مقام پر ہے اس کی ذمہ داری ان تمام افراد اور حکومتوں پر عائد ہوتی ہے جو مختلف ادوار میں فیصلہ سازی کرتے رہے ہیں۔

موجودہ ابتر صورت حال کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں اقتصادی منصوبہ بندی کی اپروچ اور پالیسی سازی میں بنیادی اور بہت گہرے نقائص موجود ہیں۔ اور اسی لیے ضرورت ہے کہ اصلاح احوال کے لیے ان تجاویز کو بار بار دہرایا جائے جو پروفیسر خورشید احمد تسلسل کے ساتھ سینیٹ کے ایوان کے ذریعہ پالیسی سازوں کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔

یہ پس منظر سامنے ہو تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ ایسی کسی کتاب میں تکرار کا احساس ہو سکتا ہے۔ بالعموم ہم نے اسے بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض اوقات سیاق وسباق کے تناظر میں اسے قبول کرنا ناگزیر تھا۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ پروفیسر خورشید احمد کی یہاں پیش کی گئی تقاریر کسی خاص وقت میں حکومتی پالیسیوں اور اقدامات پر تبصرہ ہے۔ اگرچہ ان مواقع پر بھی انہوں نے معیشت کے حوالہ سے اسلامی نقطہ نظر کو وقتاً فوقتاً بیان کیا ہے تاہم اصلاً یہ گفتگوئیں اسلامی نظام معیشت پر نہیں ہیں۔ یہ موضوع اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور اس پر پروفیسر خورشید احمد نے دیگر بہت سے مواقع پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے جو شائع بھی ہو چکا ہے۔

اسی طرح یہ بات دہرالینا بھی مناسب ہے کہ کتاب میں شامل تمام ابواب میں ایک منطقی ربط کے باوجود ان میں سے ہر باب اپنی جگہ ایک یا ایک سے زائد تقاریر پر مبنی ہے اور یوں اپنے سیاق وسباق کی روشنی میں وہ خود ایک مکمل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ کتاب کا عنوان پیش نظر رکھا جائے تو اس عنوان کی روشنی میں کتاب کے ہر باب میں مسائل اور اسباب کے ساتھ ساتھ لائحہ عمل کی بھی نشان دہی ہوئی ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ ان بڑے عنوانات سے متعلق ہے جو مجموعی معاشی حکمت عملی اور معاشی منصوبہ بندی اور پالیسیوں کی تشکیل میں کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا حصہ مختلف سالوں میں پیش ہونے والے سالانہ بجٹ کے پس منظر میں تبصرہ اور

تجاویز پر مشتمل ہے۔ ان میں وہ تجاویز بھی علیحدہ سے شامل ہیں جو پروفیسر خورشید احمد نے مجموعی طور پر سینیٹ یا اس کی کمیٹی کے نمائندہ کے طور پر پیش کی ہیں۔ کتاب کا تیسرا حصہ بعض متفرق لیکن اہم موضوعات پر انفرادی عنوانات کے تحت بحث پر مبنی ہے۔

جیسا کہ سینیٹ تقاریر کے اس سلسلہ کی دوسری کتب کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اس کتاب میں بھی لوازمہ کی ضروری ایڈیٹنگ کے باوجود تقریر کے لب ولہجہ کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اسی تسلسل میں اعداد وشمار کے بیان میں لاکھوں اور کروڑوں کے ساتھ ساتھ ملین اور بلین کی اصطلاحات کا استعمال بھی بالعموم تبدیل نہیں کیا گیا۔

پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ کی منتخب تقاریر اور تحریروں پر مبنی سیریز کی یہ چھٹی کتاب ہے، اور کسی بھی دوسری کتاب کی طرح اپنے متعین موضوع کے ساتھ ساتھ یہ پاکستان کی سیاسی و معاشی تاریخ اور آج کے پاکستان پر اس کے اثرات کو بیان کرتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ پالیسی سازوں کے لیے ایک آئینہ ہے اور دوسری جانب آنے والی نسلوں اور قومی امور میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تعلیم اور تربیت کا بہت غیر معمولی لوازمہ ہے۔

خالد رحمٰن

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

حصہ اوّل

معاشی امور میں حکومتی پالیسیاں اور اقدامات، خواہ وہ کسی خاص شعبہ اور محدود عنوان سے متعلق ہوں، مجموعی حکمت عملی، فریم ورک اور اپروچ سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔ اسی سے جڑا معاملہ یہ ہے کہ حکومتی پالیسی فیصلوں کے لیے دستیاب حقائق اور معلومات کی نوعیت کیا ہے۔ نیز معاشی حوالوں سے حکومتی ڈھانچہ پر منحصر ان فیصلوں میں اداراتی شرکت کی نوعیت کیا ہے۔ اس پس منظر میں کتاب کے پہلے حصہ میں درج ذیل عنوانات کے تحت گفتگو شامل ہے:

- پاکستانی معیشت پر عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملی کے اثرات (۱)
- پاکستانی معیشت پر عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملی کے اثرات (۲)
- معاشی صورت حال اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بوجھ
- پاکستانی معیشت کے مسائل اور ٹیکسوں کا نظام
- معیشت کی صورت حال اور حکومتی دعوے [پالیسیوں کی تشکیل میں درست حقائق کی اہمیت]
- قومی بجٹ اور ملکی معاشی پالیسیاں: صورت حال اور تجاویز
- قومی بجٹ میں دفاعی اخراجات کی تفصیلات اور پارلیمنٹ کا کردار

پاکستانی معیشت پر عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملی کے اثرات (۱)

۱۹۹۰ء کے عشرہ کے آغاز میں اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف اور صدر غلام اسحاق خان کے درمیان تناؤ کا ایک نتیجہ نواز شریف کی وزارت عظمیٰ سے فراغت کی صورت میں نکلا تھا۔ اس موقع پر آئندہ انتخابات کے انعقاد سے قبل دستور کے مطابق نگران حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نگران وزیر اعظم کے طور پر پاکستانی سیاست کے لیے ایک بالکل غیر معروف شخصیت معین قریشی کو نامزد کیا گیا جو ورلڈ بینک کے عہدیدار تھے۔ چنانچہ ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء تک معین الدین قریشی پاکستان کے نگران وزیر اعظم رہے۔

نگران وزیر اعظم کی حیثیت سے معین الدین قریشی نے ایک اقتصادی پیکج پیش کیا۔ زیر نظر تحریر میں پروفیسر خورشید احمد نے نگران حکومت کی آئینی حدود و قیود کے ساتھ ساتھ اس کے پیش کردہ معاشی پیکج اور اس میں تجویز کی گئی حکمت عملی پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ڈھائی عشرے سے زائد گذر جانے کے باوجود یہ اظہار خیال آج کے حالات سے پوری طرح متعلق نظر آتا ہے۔

جناب چیئرمین! اس وقت ملک کو ایک بڑا ہی گھمبیر مسئلہ درپیش ہے اور وہ اس نئے اقتصادی پیکج سے متعلق ہے جس کا نگراں وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے۔ درحقیقت اس کی وجہ سے پورے ملک میں اضطراب اور بحران کی کیفیت ہے۔ تاہم اقتصادی پیکج پر بات کرنے سے قبل میں نگراں حکومت کی آئینی حدود و قیود پر بات کرنا چاہوں گا جس نے یہ پیکج پیش کیا ہے۔

نگران حکومت: آئینی حدود و قیود

جناب والا! سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نگران حکومت دستور کے تحت نہ صرف یہ کہ ایک عارضی حکومت ہے بلکہ یہ اس پورے سیاسی عمل کو نظر انداز کر کے بنائی جاتی ہے جو دستور میں رکھا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جمہوریت کی روح یہ ہے کہ صرف منتخب افراد اقتدار کی ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں۔ اور اسی لیے دستور میں یہ بات طے ہے کہ ملک کا وزیر اعظم صرف براہ راست قومی اسمبلی سے منتخب ہو سکتا ہے۔ سینیٹ بھی اگرچہ اپنی جگہ ایک منتخب ادارہ ہے لیکن وزیر اعظم سینیٹ سے بھی منتخب نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص منتخب ممبر نہ ہو اور اس پر ذمہ داری ڈالی جائے تو وہ ملک کے اقتدار کو سنبھالنے اور زمام کار کو چلانے کی ذمہ داری قبول تو کر سکتا ہے لیکن اسے ایک مدت کے اندر لازماً منتخب ہو نا پڑتا ہے۔ نگران حکومت کے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، چاہے کہ وہ منتخب لوگوں پر مشتمل ہو اور خواہ تعیناتی کے وقت وہ ملک میں ہوں یا ملک سے باہر ہوں اور ان کا نام ملک میں ووٹرز کی فہرست میں درج ہو یا نہ ہو اور پاکستانی پاسپورٹ بھی اس کے پاس ہو، نہ ہو، ان ساری باتوں کو نظر انداز کر کے جس کو چاہیں آپ نگران وزیر اعظم[1] یا نگران وزیر بنا سکتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ نگران حکومت ہمارے عمومی ڈھانچہ سے ایک اخراج ہے اور یہ اخراج صرف کسی متعین مقصد اور محدود اختیارات کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ عمومی حکومت کی طرح یہ غیر محدود اختیارات اور ذمہ داریاں اپنے اوپر نہیں لے سکتی۔ اس کے لیے وقت مقرر ہے کہ ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات ہونے ہیں اور صرف اس مدت تک کے لیے جب تک کہ نئی اسمبلی آکر اپنی ذمہ داری سنبھال نہیں لیتی یہ اختیارات استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کی

---

[1] قانونی بحث سے قطع نظر ان سطور میں دراصل اشارہ معین الدین قریشی کی طرف ہے جو (جولائی ۱۹۹۳ء تا اکتوبر ۱۹۹۳ء) نگران وزیر اعظم رہے۔ قریشی، امریکی شہریت رکھتے تھے اور ورلڈ بینک کے سابق نائب صدر رہنے کے علاوہ وہ آئی ایم ایف میں بھی کام کر چکے تھے اور جس وقت انہیں وزیر اعظم بنایا گیا ان کے پاس پاکستانی پاسپورٹ بھی موجود نہ تھا اور نہ ہی ووٹرز کی فہرست میں اس وقت ان کا نام شامل تھا۔

بنیادی ذمہ داری دراصل انتخابات کرانا ہے اس کے بعد انھیں چلے جانا ہوتا ہے۔

پھر آپ یہ بھی سامنے رکھیں کہ اس مرتبہ تو ملک میں ایک خاص پس منظر تھا، جس میں ایک مصنوعی بحران پیدا کیا گیا اور اس مصنوعی بحران سے فی الحقیقت ملک کی معیشت، سیاست اور ملک کے دستوری ادارے تک متاثر ہوتے۔

ان مخصوص حالات کے اندر یہ بات بالکل واضح ہونی چاہیے کہ نگران حکومت کی صرف دو ذمہ داریاں ہیں پہلی چیز یہ کہ انتخابات کرانا اور دوسری چیز یہ کہ اس عارضی وقت میں روزمرہ کاموں کی دیکھ بھال کرنا۔ نگراں وزیراعظم اور ان کی ساتھی کابینہ آسمان سے اس لیے نازل نہیں ہوئے کہ ملک کو کوئی نیا نظام دیں یا کوئی نیا مالیاتی اور معاشی ڈھانچہ دیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نگران حکومت اپنے دستوری، قانونی، سیاسی اور اخلاقی دائرہ کار سے برابر باہر جارہی ہے اور وہ اپنے طور پر 'اصلاحات' اور کچھ مخصوص تبدیلیاں یہاں کرنا چاہتی ہے۔ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہ صحیح ہے یا غلط یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور میں اس پر بھی بات کروں گا لیکن میری نگاہ میں پہلا مسئلہ نگراں حکومت کی حدود کار اور اس کے اقدامات کا جواز ہے۔ اس ملک میں اگر سیاسی روایات، دستور، جمہوریت اور عوام کی خواہشات کے مطابق نظام حکومت بنانا ہے تو نگران حکومت کو اپنی حدود کے اندر رہنا ہوگا اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ ان حدود کو برابر پامال کر رہی ہے۔

جناب والا! یہ بات کہ ملک میں کسی نئے معاشی نظام کے لیے غور و بحث کی ضرورت ہے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی موجودہ نگران وزیراعظم دو سال قبل پاکستان تشریف لائے تھے، اس وقت انہوں نے یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز میں ایک تقریر میں، اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ آج بھی انہیں اس بات کا حق ہے کہ وہ اس ایوان میں آئیں اور یہاں مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور قوم کے اندر مباحثہ کروائیں۔ لیکن یہ اختیار انہیں حاصل نہیں ہے کہ وہ اندھادھند انداز میں اس ملک میں بنیادی مالیاتی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں کریں جس کا انھیں اختیار حاصل نہیں ہے اور جو

صرف ایک منتخب حکومت ہی کر سکتی ہے۔

جناب والا! قومی اخبارات نے ان کے پیکج کے کچھ پہلوؤں پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور میری نگاہ میں بھی اس کے چند پہلو ایسے ہیں جو پسندیدہ ہیں۔ لیکن ان پر منتخب حکومت کی موجودگی میں قومی بحث اور اس کے بعد فیصلہ ہونا چاہیے اور اس لیے یہ بالکل الگ ایک چیز ہے۔ جو بات کہی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ نگران حکومت کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اور اس زمانے میں ہم ایسی بنیادی تبدیلیاں کر دیں گے کہ جو منتخب حکومتیں نہیں کر سکتیں۔ جناب والا! یہ بڑی خطرناک دلیل ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مطابق خود وزیر اعظم کی تقریر کے اندر یہ بات موجود ہے کہ ہم ایسے تلخ فیصلے کرنے کو تیار ہیں، جو عام حالات میں جمہوری حکومت نہیں کرتی۔

جناب والا! آپ غور فرمائیں ان کے اس بیان کے کیا معنی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک میں جمہوریت کے اندر صحیح معاشی فیصلے نہیں کیے جاسکتے، اس کے لیے آمریت اور ایک زورآور حکومت کی ضرورت ہے، ایسی حکومت جو عوام کے سامنے اور پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ نہ ہو اور جس پر کوئی احتساب نہ کیا جا سکے۔ درحقیقت اگر ہم ان دلائل کو مان لیں تو پھر دستور کو بھی اور جمہوریت کو بھی لپیٹ دینا پڑے گا۔ پھر تو آپ کسی بادشاہت اور آمریت کی طرف جائیں گے۔ اس لیے یہ ایک سنگین مسئلہ ہے کہ نگران حکومت ان دستوری حدود سے متجاوز ہو، نہ اسے یہ کرنا چاہیے اور نہ ان شاءاللہ ہم اسے کرنے دیں گے۔ قومی بحث ضرور کیجیے، دلیل سے بات لایئے ہم آپ کو دلیل سے جواب دیں گے لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس ملک پر ایک آمرانہ نظام اور اندھی طاقت لائے اور پھر دلیل بھی یہ لائے کہ جمہوری ادارے اور دستوری ادارے یہ کام نہیں کر سکتے۔

دوسری جانب جناب والا! اگر یہی بات ہے تو پھر میں یہ یاد دلاؤں گا کہ بڑی سے بڑی نگران حکومت بھی، کوئی بڑی سے بڑی تبدیلی کر دے لیکن وہ تبدیلی باقی نہیں رہ سکتی جب تک کہ منتخب پارلیمنٹ اس کی تائید اور توثیق نہ کرے۔ اگر آج آپ نے ایک مشورہ اور ایک

وعظ کیا ہے اور اگر اس کے پیچھے آپ ایک قانون آرڈیننس کی صورت میں لے بھی آئیں تو اس آرڈیننس کی عمر بھی چار مہینے ہو گی۔ کوئی مستقل تبدیلی اس آرڈیننس کے بنیاد پر نہیں لائی جاسکتی۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ نگران حکومت کو ۹۰ دن کی حکومت ہاتھ آگئی اور اب وہ یہ اختیار رکھتی ہے اور وہ مجاز ہے اس بات کی کہ جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے اکھاڑ پھینکے اور ڈھانچے کی جو تبدیلی چاہے وہ یہاں پر لے آئے، کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جناب والا! یہ دروازہ آپ نے کھولا تو یہ اس ملک کے لیے بڑا خطرناک ہو گا اور ایک نگراں حکومت کو سوچنا چاہیے کہ اگر وہ ایک قانونی اور مستند جواز والی حکومت نہیں ہے تو اس کے یہ فیصلے سندِ جواز نہیں رکھتے اور ان کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہو گی۔ جناب والا! میرا پہلا پوائنٹ یہ ہے کہ اگر ہم نے اس کو چیک نہ کیا، اس پر قومی بحث نہ کی اور اس کے اوپر ہم نے عوام کی اور ملک کی رائے کا اظہار نہ کیا تو ہم قومی مجرم ہوں گے۔

حکومت کا پیش کردہ معاشی پیکج اور حکمت عملی

جناب والا! جو پیکج آیا ہے اس کا ایک حصہ وہ جامع پیکج ہے جو تین دن پہلے والی تقریر کے اندر پیش کیا گیا ہے اور جسے چار نکات کے تحت وزیر اعظم نے مرتب کیا ہے۔ یہ پورا پیکج مل کر ان کا نیا معاشی تصور اور اسی کے تحت ایک نیا معاشی پروگرام بنتا ہے۔ پھر جناب والا! وہ ایک نیا بجٹ تجویز کر رہے ہیں۔ وہ محض معاشی خیالات کا اظہار نہیں کر رہے بلکہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کے نتیجے کے طور پر حکومت کی آمدنی متاثر ہو رہی ہے اور اس کی بناء پر ملک میں قیمتوں، روزمرہ اخراجات اور پیداواری لاگت پر اثرات ہوں گے اور درآمدات، برآمدات، صنعت کاری ہر چیز متاثر ہو گی۔

بجٹ کی منظوری: پارلیمنٹ کا استحقاق: جناب والا! بجٹ کے بارے میں آپ اس امر سے واقف ہیں کہ تاریخی اعتبار سے یہ وہ اختیار ہے جو عوام نے طویل جنگ کے بعد بادشاہوں سے چھینا کہ قانون سازی کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں۔ اس اصول کے معنی ہی یہ ہیں کہ بادشاہت کے

نظام میں تو ٹیکس لگانے کا حق بادشاہ کو ہوتا ہے لیکن جمہوری نظام کے اندر کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کوئی ٹیکس لگا سکے اور یوں عوام کی جیب سے ان کی مرضی کے بغیر کوئی چیز نکال سکے۔ اس کا راستہ قانون سازی ہے۔ اس لیے جناب والا! بجٹ پر بحث کے بعد ایک فنانس بل ہوتا ہے اور جب تک فنانس بل پاس نہ ہو جائے اس وقت تک بجٹ نافذ نہیں ہو سکتا۔ اس کی بنیادی دلیل یہی ہے کہ آپ پارلیمنٹ کی منظوری لیے بغیر کوئی ٹیکس نہیں لگا سکتے ہیں یعنی وہ چیزیں کہ جن سے عوام کا استحقاق اور طاقت متاثر ہو رہی ہو یا ان کا بنیادی معاشی کنٹری بیوشن متاثر ہو رہا ہو ان کے نمائندوں کے ذریعہ تائید حاصل کیے بغیر ان کے بارے میں آپ کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔

اس تناظر میں جو کچھ بھی کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ آپ کا معمول کا روایتی بجٹ جون میں پاس ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس نئے بجٹ کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ بجٹ کو پیش کرنے پر مباحثہ کرنے کا جو طریقہ دستور میں طے کر دیا گیا ہے اور بعد ازاں فنانس بل کی صورت میں جو طریقہ کار طے کیا گیا اس سے آپ نے انحراف کیا ہے۔

پھر جناب والا! بات صرف ایک بجٹ کی بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ بجٹ کا عرصہ تو ایک سال کا ہوتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کی دستاویز میں تو تین سال سے لے کر ۱۰ سال تک کا ایک پورا متناسب منصوبہ موجود ہے۔ اس ایک اقدام کے ذریعہ وہ اصلاحات بھی طے کی جا رہی ہیں جن کا آغاز ایک سال کے بعد ہوگا حالانکہ اس حکومت کی مدت عمر محض ۶۰ دن باقی رہ گئی ہے۔ یہ ایسی اسکیمیں لا رہے ہیں جو ایک سال سے تین سال میں پوری ہوں گی اور کچھ ایسی ہیں جو دس سال میں پوری ہوں گی۔ اس طرح گویا انھوں نے ایک نئے تناظر میں منصوبہ یا کم از کم اس کا خلاصہ دے دیا ہے اور یہ بجٹ اور منصوبہ سازی کے اصول کے واضح طور پر خلاف ہے۔

معاشی آزادی اور عالمی اداروں کا کردار: جناب والا! کسی بھی ملک کی سیاسی آزادی اس کی معاشی آزادی کے بغیر ناممکن ہے۔ معاشی فیصلہ سازی عوام، عوام کے نمائندوں اور ملک کی

مصلحت سے ہٹ کر اس نقطہ نظر سے کی جائے کہ ہمیں کس طرح قرضہ دینے والے بین الاقوامی ساہوکار یعنی ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، کنسورشیم ممالک کو مطمئن کرنا ہے تو یہ ملک کی معاشی آزادی پر شب خون مارنے کے مترادف ہے۔ یہ طرز عمل ملک کی معیشت کو رہن رکھنے سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے کہ ہماری توجہ اس پر ہو کہ واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے پالیسی میکرز کو کسی طرح مطمئن کر سکیں، ان کی خوشنودی حاصل کر سکیں اور کس طرح ہم ان کی شرائط کو پورا کریں اور زیادہ سے زیادہ قرضے حاصل کر لیں۔ جناب والا! یہ طرز عمل حقیقت میں ہماری فیصلہ سازی کو اسلام آباد سے واشنگٹن منتقل کرنا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہ جن چیزوں کو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف عام حالات میں قبول نہ کرواسکا انھیں اس طرح پچھلے دروازے سے آکر منظور کروایا جارہا ہے[1]۔

جناب والا! معاشیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں شاید ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی شرائط اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی متنازعہ چیز ہے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نے دنیا کے مختلف ممالک کو مختلف طرح سے اپنی شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کیا لیکن اس کے جو نتائج نکلے ہیں وہ اتنے خوش آئند نہیں ہیں۔ درحقیقت آج اس کے بارے میں ایک نہیں دسیوں بین الاقوامی مطالعات، کمیشنوں کی رپورٹس اور سکالرز کے مطالعے موجود ہیں۔ آئی ایم ایف کی شرائط افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں بحیثیت مجموعی ناکام رہی ہیں۔ کوئی ایک نمونہ ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا جہاں آئی ایم ایف کی شرائط کی بناء پر خوشحالی آئی ہو اور معاشی ترقی حاصل ہوئی ہو۔

ہمیں دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ اس پیکج کے اندر بنیادی بات یہ نہیں ہے کہ

---

[1] موجودہ آئی ایم ایف پروگرام (۲۲-۲۰۱۹ء) کی شرائط کی بھی یہی نوعیت ہے۔ جیسا کہ توانائی کی قیمتوں میں اضافہ جو صنعتوں کو براہ راست اثرانداز کرے گا۔ شرح سود کو ۲۵ء۱۳ فیصد پر کافی عرصے کے لیے رکھنا بھی ملکی معیشت کو بڑھنے سے روکتا رہا ہے۔ ۹ مارچ ۲۰۲۱ء کو سٹیٹ بینک کی خود مختاری کے حوالہ سے کابینہ نے جس آرڈیننس کی منظوی دی، اس نے تو اس عمل کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

ملک کی حقیقی ضروریات کیا ہیں۔ ہم اپنے نگراں وزیراعظم سے جو ماہر معاشیات ہیں اور اپنے مضمون پر ان کو بڑی دسترس حاصل ہے یہ توقع رکھتے تھے کہ اس پورے پیکج کا رخ ملک کی معاشی ترقی اور معاشی ضروریات کی تکمیل پر ہو گا۔ توجہ اس پر ہو گی کہ ملک میں بے روزگاری اور غربت ہے، اور ترقیاتی حکمت عملی کی خامیاں رہی ہیں انہیں کیسے دور کیا جائے گا۔ اس کے برعکس ہمیں نظر آتا ہے کہ ترقیاتی حکمت عملی کا وہی رخ برقرار ہے جس میں آپ کی معاشی ترقی بیرونی قرضوں پر منحصر ہو اور جس کی وجہ سے آج ملک قرضوں اور ان پر ادائیگی کے بحران میں مبتلا ہے۔ جس بجٹ پر قرضوں اور سود کی ادائیگی کا اتنا بڑا رہن موجود ہو وہ بجٹ کبھی بھی معیشت کو تقویت نہیں دے سکتا۔ اگر آج دفاع اور سود کی ادائیگی پر اخراجات کے بعد آپ کے پاس بچتا ہی نہیں ہے کہ آپ اس ملک میں معاشی ترقی کے لیے کچھ خرچ کر سکیں تو اس کی وجہ وہ حکمت عملی ہے جس سے ہمیں نجات پانی ہے۔ لیکن اس پیکج کا سارے کا سارا رخ یہ ہے کہ کسی طرح ہم اپنے قرضہ دینے والے عالمی اداروں اور بینکرز کو راضی کر لیں، ان کی شرائط کو مان لیں اور وہ جن باتوں پر اصرار کرتے ہیں ان کو ہم یہاں لے آئیں۔ جس چیز کو وہ صارف کی لاگت کہتے ہیں جو ایک بڑا خوبصورت لفظ ہے لیکن دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں مفادعامہ کی سہولیات کو عوام کی ضروریات اور استطاعت کی روشنی میں طے نہ کریں بلکہ ملکیت اور نجکاری کے بارے میں مغربی اقوام کے تصورات کی روشنی میں کام چلائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ اپنے یہاں زراعت کے اوپر زر تلافی (Subsidy) دیتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی صنعت کو تحفظ دیتا ہے۔ چنانچہ دو سو سال کی صنعت کاری کی بنیاد کے بعد بھی پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کی مصنوعات کی ایکسپورٹ کے لیے کوٹہ مقرر کرتا ہے کہ وہ امریکہ کی ٹیکسٹائل انڈسٹری اور کامرس انڈسٹری کے لیے خطرہ ہیں۔ یورپی اقتصادی برادری کی پوری خارجہ پالیسی اسی طرح تحفظ پر مبنی ہے۔ یوروگوئے نے مالی

سمجھوتے کو آج تک نافذ نہیں کیا۔ GATT[1] تیس سال سے چلاّ چلاّ کر تھک گئی ہے لیکن اس کے تصور کو نہیں مانا جارہا ہے۔ لیکن اس کے بر عکس ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ درآمدات کو آزاد کرو اور ان پر سے زر تلافی ختم کرو۔ زراعت چاہے خاک میں جائے جو بھی مسائل پیدا ہوں، قیمتیں بڑھیں، عوام تکلیف اٹھائیں، وہ فسادات کرنے لگیں، بغاوت کریں لیکن درآمدات کو آزاد کرو۔

جناب والا! اس پورے پیکج کا اصل رُخ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو مطمئن کرنا ہے اور آپ نے دیکھا کہ اعلان کے فوراً بعد ان کی جانب سے سر ٹیفکیٹ بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ آئی ایم ایف نے ہی نہیں امریکی سفیر نے بھی سر ٹیفکیٹ دے دیا اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بھی بغلیں بجانا شروع کر دیں۔ جناب والا! میں پوچھنا چاہتا ہوں کیا اب پاکستان خدانخواستہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں ایک دیوالیہ کمپنی بینک کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہے کہ اس کے اوپر وصول کنندہ مقرر کیا جائے یا تحلیل کنندہ (Liquidator) مقرر کیا جائے۔ کیا ہم اس مقام پر ہیں کہ ورلڈ بینک نے نگراں حکومت کی شکل میں ہمارے اوپر ایک وصول کنندہ مقرر کیا ہے۔ اس ملک کی اقتصادی آزادی کے لیے اقتصادی فیصلہ سازی کو یہاں ہی ہونا چاہیے، اس کے فیصلے یہاں ہونے چاہییں نہ کہ دوسروں کی مرضی پر اور محض زیادہ سے زیادہ قرضے حاصل کرنے کے لیے۔ اس وقت نظر تو یہی آر رہا ہے کہ ساری کوشش کسی طرح کنسور شیم اور ورلڈ بینک وغیرہ سے پیسے حاصل کرنے کی ہے۔

جناب عالی! میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس خود انحصاری اور عزت نفس کی جس پر یہ ملک قائم ہے، خلاف ورزی ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یہ بات عرض کروں گا کہ خود انحصاری کمیٹی بھی کچھ عرصہ پہلے یہاں بنی تھی مجھے اس کا چیئر مین بنایا گیا تھا۔ خود انحصاری

---

[1] General Agreement on Tariffs and Trade

کمیٹی [۱] نے تین مہینے میں حکومت کو ایک مربوط پروگرام [۲] دیا کہ کس طرح ہم راست بنیادی حکمت عملی سے ایک متبادل کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ جہاں ہمارا انحصار بیرونی ممالک پر کم ہو اور ہم فی الحقیقت اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ لیکن کمیٹی کی رپورٹ پر مبنی چھ گھنٹے کی پریزنٹیشن سابق وزیر اعظم اور ان کی پوری معاشی ٹیم نے سنی اور اس کے بعد سب کچھ ان سنی کر دی۔

جناب عالی! اس پیکج میں ہم کو جو چیزیں نظر آرہی ہیں ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے، اور اس پر ہمیں دکھ ہوتا ہے، کہ نہ صرف نگراں حکومت بلکہ سابق دو وزرائے اعظم جناب میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر کو بھی، اس پیکج کے اعلان سے پہلے اعتماد میں لیا گیا ہے اور ان سے مشورہ ہوا ہے۔ کل وزیر اعظم معین قریشی نے کراچی میں صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ میں نے ان (نواز شریف اور بے نظیر بھٹو) کے سامنے اپنے پروگرام کو رکھا اور انہوں نے اس کے اوپر اعتراض نہیں کیا۔ تو نظر یہ آرہا ہے کہ دونوں بڑی پارٹیاں اور نگراں حکومت امریکہ کے مسلط کیے ہوئے معاشی پروگرام کو قبول کر چکی ہیں اور نگراں حکومت کو ایسے اقدامات کرانے کے لیے، جس کی وہ مجاز نہیں ہے اور جس کو بالکل بھی برحق ثابت نہیں کیا جا سکتا، ہماری یہ سیاسی لیڈر شپ بھی استعمال ہو رہی ہے۔

معاشی پیکج اور ملکی حالت کا تعلق

اس کے بعد میں چاہتا ہوں جناب والا! کہ آپ ان اصلاحات کی تفصیلات کی طرف آئیں کہ فی الحقیقت وہ ہیں کیا اور ان کے کیا اثرات ہوں گے۔

---

۱ Prime Minister's Committee on Self Reliance (1990)

۲ اس کمیٹی کے بنانے کے اغراض و مقاصد میں اہم امر پاکستان کا بیرونی امداد پر بڑھتے انحصار کو جانچنا اور ایسے مختصر مدتی اہداف کا تعین کرنا تھا جو اس انحصار کو کم کریں اور خود انحصاری کی پالیسی کو ترتیب دیں۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر خورشید احمد تھے۔ کمیٹی نے اپنی سفارشات اپریل ۱۹۹۱ء میں ایک رپورٹ کی شکل میں ترتیب دے کر اس وقت کے وزیر اعظم کو پیش کی تھیں۔

روپے کی قدر میں کمی: ان میں سب سے پہلی چیز روپے کی قدر میں کمی ہے۔ بلا شبہ پاکستانی روپے کی قیمت بین الاقوامی مارکیٹ میں برابر کم ہو رہی ہے[1]۔ ہمارے ہاں جو نظام ہے وہ آزاد بہاؤ (Free Floating) کا نہیں بلکہ وہ نظام ہے جسے معاشیات کی اصطلاح میں ہم کنٹرولڈ بہاؤ (Fixed Exchange Rate) کہتے ہیں۔ اس نظام میں مالیاتی مقتدرہ کو اس بات کا اختیار حاصل رہتا ہے کہ وہ مختلف عوامل کو سامنے رکھ کر روپے کی قدر کو متعین کرے۔ ان عوامل میں سے بہت سے خاص طور پر باسکٹ بوجوہ خفیہ رکھے جاتے ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اس وقت جناب والا! ہوا یہ ہے کہ پچھلے آٹھ مہینوں میں روپے کی قدر میں تقریباً ۱۶ فیصدی کمی ہوئی ہے۔ سولہ میں سے ۶ فیصدی نگراں حکومت کے آنے سے پہلے اور ۱۰ فیصدی اس کے آنے کے بعد ہوئی ہے۔ مجھے اعتراف ہے اس بات کا جناب والا! کہ ہماری ادائیگیوں کے توازن اور زر مبادلہ کے ذخائر[2] کی صورتحال خراب ہے اور اس کے بہت سارے اسباب ہیں، میں اس وقت ان میں نہیں جارہا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت تجارت میں فرق جو پیدا ہوا ہے اور جس کو بہانہ بنا کر قدر میں کمی کی گئی ہے، اس کی وجوہات کیا ہیں؟

جناب والا! حقائق یہ ہیں کہ پچھلے سال سیلاب کی وجہ سے آپ کی کپاس اور چاول کی پیداوار[3] اور اس کے نتیجے کے طور پر ان کی ایکسپورٹ میں کمی واقع ہوئی۔ یہ دونوں آپ کے

---

[1] یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور اس وقت ایک ڈالر پاکستانی ۱۶۱ روپے (۲۸ اکتوبر ۲۰۲۰ء) کا ہو گیا ہے۔

[2] ۲۰-۲۰۱۹ء کے اختتام پر زر مبادلہ کے ذخائر ۸ء۱۸ ارب ڈالر تھے جو ۱۶-۲۰۱۵ (۰۹ء۲۳ ارب ڈالر) کے مقابلے میں بھی کم ہیں۔

[3] اگرچہ چاول کی فصل میں پچھلے چند سالوں میں کچھ بہتری دیکھی گئی ہے لیکن کپاس کی پیداوار موجودہ ادوار میں بھی بتدریج کم ہو رہی ہے۔ سال ۱۶-۲۰۱۵ء میں ۹۹۱۷۰۰۰ گانٹھیں تیار ہوئیں۔ یہ تعداد سال ۲۰-۲۰۱۹ء میں کم ہو کر ۹۱۷۸۰۰۰ گانٹھوں پر آگئی ہے۔ (پاکستان اقتصادی سروے ۲۰-۲۰۱۹ء)

بر آمدی آمدنی کے بڑے ذرائع ہیں۔ دوسری جانب آپ نے پیلی ٹیکسی اور اس سے متعلقہ ٹرانسپورٹ گاڑیوں کی در آمد آزاد کی، ڈیوٹیز کی معافی دی اور ایک خاص طریقے سے اس کو فروغ دیا۔ ان خود روزگار اصولوں کی بنیاد پر روزگار فراہم کرنے کی سکیموں کا میں قائل ہوں۔ لیکن جس انداز میں پوری سکیم چلائی گئی اور اس میں صرف حقدار ہی نہیں بلکہ مفاد پرستوں نے جس طرح سے فائدہ اٹھایا اس کی وجہ سے آپ کی امپورٹس اس سے کہیں زیادہ بڑھیں جو آپ کے اہداف میں دی گئی تھیں۔ یہ ایک خاص صورتحال ہے۔ اس خاص صورتحال کو اگر آپ روپے کی قدر میں کمی سے نمٹنا چاہتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ خالص معاشی اعتبار سے بھی یہ بڑی بُری پالیسی ہے۔

قدر میں کمی کے لیے آپ کو یہ دیکھنا چاہیے کہ آپ کی جو مصنوعات ہیں ان کی بر آمداتی لچک کیا ہے۔ آپ کتنا ان کی پیداوار میں اضافہ کر سکتے ہیں اور بین الاقوامی مارکیٹ کتنا اس کو قبول کر سکتی ہے۔ آپ کو یہ دیکھنا ہو گا کہ بحیثیت مجموعی آپ کے کون مقابل ہیں اور بین الاقوامی مارکیٹ میں ان چیزوں کی طلب کی کیا صورتحال ہے۔ اور کیا ان حالات کے اندر فی الحقیقت اس بات کا امکان ہے کہ آپ روپے کی قدر میں کمی کے ذریعہ بر آمدات کو اتنا بڑھا لیں کہ قدر میں کمی کی بنا پر جو نقصانات ہیں وہ بھی پورے ہو جائیں اور اس کے بعد پھر آپ کچھ فوائد حاصل کر سکیں۔ میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ جو مطالعات میری نگاہ سے گزرے ہیں ان کی بنیاد پر تکنیکی طور پر روپے کی قدر میں کمی کا کوئی جواز نہیں ہے[1]۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف آپ نے روپے کی قدر میں کمی کی اور اس امید پر کی کہ اس طرح بر آمدات کو فروغ ملے گا۔ لیکن ساتھ ہی آپ نے قرضے کی حد بدل دی۔

---

[1] حالیہ سالوں میں بھی روپے کی قدر کو بہت زیادہ گرا دیا گیا اور ایک مرحلہ پر تو یہ ۱۶۸ روپے کی حد تک چلا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بر آمدات میں کوئی اضافہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکی معیشت کے مسائل میں بھی کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی اور ان کے حل (جو بیرونی امداد کے ساتھ آتے ہیں) بھی نہیں بدلے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ملکی معیشت کے مسائل جوں کے توں ہیں۔

بر آمد پر جو مارک اپ تھا وہ آپ نے بڑھا دیا۔ آپ اس بات کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ صنعت کاری کی ترقی اور ملک میں سرمایہ کاری کو بڑھانے اور روزگار پیدا کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ کم شرح سود پر سرمایہ دستیاب کیا جائے۔ میں سود کا اصولاً مخالف ہوں، لیکن یہاں میں تکنیکی طور پر بات کر رہا ہوں، کہ شرح سود جب تک آپ کم نہیں کریں گے آپ سرمایہ فراہم نہیں کر سکیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جرمنی، انگلستان، امریکہ، جاپان سارے ممالک اس سے نکلنے کے لیے مسلسل اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ شرح سود[1] کو نیچے لائیں اور سرمایہ کاری کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے کہ اس وقت ۱۸ سے ۲۲ فیصدی اصل شرح سود ہے۔ اس شرح سود کے اوپر آپ خوشحال معیشت کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ روپے کی قدر میں کمی سے مدد ملے گی اور دوسری طرف آپ نے قرضہ کی حد لگا کر، نقد کی طلب بڑھا دی اور مارک اپ کی شرح بڑھا کر گویا اس کا دروازہ بند کر دیا، یہ کیسے تضادات ہیں؟

جناب والا! یہ بات واضح ہے کہ روپے کی قدر میں کمی کی وجہ سے آپ کی درآمدات مہنگی ہوتی ہیں۔ آپ کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ درآمدات میں انتخاب کا موقع کتنا ہے۔ اگر آپ مجبور ہیں کہ خوردنی تیل اور تیل کے بیج منگوائیں[2]، مشینری، پرزہ جات اور خام مال منگوائیں تو انتخاب کا موقع ہے کہاں؟ یہ درآمدات تو جاری رہیں گی، اس میں آپ کہاں تک کمی کر سکیں گے؟ روپے کی قدر میں کمی کے باوجود درآمدات میں کمی تو نہ ہوگی لیکن آپ ساری درآمدات کو مہنگا بنا دیں گے جس کے معنی یہ ہیں کہ پیداواری لاگت بڑھے گی اور نتیجتاً آنے والے دنوں میں صنعت کاری کا عمل متاثر ہوگا، جس سے آپ کی بین الاقوامی مسابقت

---

[1] پاکستان میں سال (۱۹-۲۰۱۸ء) سے شرح سود انتہائی بلند سطح پر رہی (۲۵ء۱۳ فیصد) جو اب (۲۰۲۰ء) کم کر کے ۷ فیصد پر آگئی ہے۔ لیکن یہ شرح ابھی بھی سرمایہ کاری کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ جبکہ اسکے مقابلے میں (ستمبر ۲۰۲۰ء) امریکہ میں یہ شرح ۰۹ء۰، انگلستان میں ۱ء۰ فیصد اور چین میں ۲۵ء۲ فیصد ہے۔

[2] خوردنی تیل اور بیجوں کی درآمدات کی صورتحال عدم توجہی کی بنا پر مزید خراب ہوتی جا رہی ہے۔ سال ۱۹-۲۰۱۸ء میں خام خوردنی تیل اور بیجوں کی مد میں پاکستان نے تقریباً ۱۸ء۳ ارب ڈالر کی درآمدات کی۔

مجروح ہو گی۔ در حقیقت اگر پیداواری لاگت بڑھتی ہے اور یوں آپ کے ملک میں افراط زر[1] ہوتا ہے تو پھر بین الاقوامی مسابقت میں آپ کی حیثیت نہ صرف یہ کہ کرنسی کی قدر میں کمی سے اور بھی خراب ہو جائے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ پہلے سے زیادہ نقصان کی پوزیشن میں آجائیں۔

افراط زر کا مسئلہ: میں سمجھتا ہوں جناب والا! روپے کی قدر میں کمی کا یہ فیصلہ عاجلانہ فیصلہ رہا ہے۔ اس فیصلہ سے سنجیدہ مسائل کا وقتی حل نکالنے کی کوشش کی گئی ہے، جو صحیح نہیں۔ پھر صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی۔ یہ نہیں سوچا گیا کہ روپے کی قدر میں اس کمی کے نتیجے میں ملک میں افراط زر تو پیدا ہو نا ہی ہے، تیل کی قیمتیں اس کا پہلا نشانہ بنیں گی۔ اس لیے کہ آپ جیسے ہی نئی در آمدی قیمتوں کے اوپر تیل منگواتے ہیں تو آپ کو اس کی قیمتیں بڑھانا پڑتی ہیں۔ پھر اس سے متضاد یہ نئی پالیسی ہے جس نے صارف کے چارجز کو بڑھا دیا گیا ہے اور زر تلافی ختم کر دی گئی ہے۔ اس طرح گندم اور پٹرول کی مصنوعات اور گیس اور بجلی کی قیمتیں بڑھا کر، آپ نے ایک عام آدمی کے لیے زندگی گزارنا اجیرن بنا دیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس وقت بھی آپ کے افراط زر کی شرح ۱۱ فیصد ہے لیکن وزیر خزانہ کی بات ریکارڈ پر ہے کہ انھوں نے افراط زر کی شرح ۱۰ فیصد سے ۱۵ فیصد کہا ہے۔ ۱۵ فیصد افراط زر بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن میں اس سے آگے بڑھوں گا اور یہ بات ہم نے پہلے بار بار کہی ہے اور سابقہ وزیر خزانہ نے اسے قبول بھی کیا ہے کہ ہمارے یہاں حقیقی افراط زر کی شرح کی عکاسی نہیں ہوتی۔

ہم جس مقام پر آج کھڑے ہیں اس کا لازمی نتیجہ کم از کم ۲۰ فیصدی افراط زر کی شرح ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس سے بھی زیادہ ۲۵ فیصدی تک ہو۔ یہ بیانات اور اندازے

---

[1] ایسی ہی صورت حال پچھلے دو سال (۲۰-۲۰۱۸ء) سے پاکستان کو درپیش ہے۔ مہنگائی کی شرح دوہرے عدد میں رہی (جو اب اکتوبر ۲۰۲۰ء میں ۹۱ء۸ فیصد پر ہے)۔ لیکن صورت حال کو انتہائی غافلانہ انداز سے جانچا گیا اور یکسر اُلٹ 'درآمد' کر کے، معاملے کو مزید خراب کیا، جس کا اثر بہت شدت سے غریب طبقہ پر پڑا۔

ہمارے سامنے آچکے ہیں کہ روپے کی قدر میں کمی اور اس کی بناء پر تیل، بجلی اور گیس کی قیمتیں اور ٹرانسپورٹ کے کرائے کے بڑھنے سے پیداواری لاگت میں تقریباً ۴۰ فیصد تک اضافے کا خطرہ ہے۔ دوسری جانب اس عرصہ میں ۲۶ فی صد مالیاتی توسیع ہوئی ہے۔ جناب والا! معاشیات کا عام طالب علم بھی جانتا ہے کہ وقت کے ساتھ مالیاتی توسیع کا نتیجہ افراط زر ہوتا ہے۔ مالیاتی توسیع، روپے کی قدر میں کمی اور پھر قیمتوں میں اضافہ صرف ان تین عوامل کو آپ لے لیں تو ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں افراط زر رونما ہو گا، لوگوں کی قوت خرید کم ہو گی اور اس سے ساری آبادی متاثر ہو گی۔ ایک دو یا زیادہ سے زیادہ ۵ فیصد لوگ جو اتنی مہنگائی برداشت کر سکتے ہیں ان کی خاطر آپ ملک کی ۹۵ فیصد آبادی کو سزا دے رہے ہیں۔

خدارا! اپنے ان اقدامات کے نتائج پر غور کیجیے۔ محض واشنگٹن کو خوش کرنا آپ کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کا مقصد ہونا چاہیے کہ اپنے ملک کے عوام کی خدمت کریں، ان کے لیے زندگی کو آسان بنائیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ضروریات زندگی کی فراہمی کو بڑھائیں اور قیمتوں کو مناسب حد کے اندر رکھیں۔ جناب والا! میں قیمتوں کے تعین کی قومی پالیسی کا قائل ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لمبے عرصے کی ترقی کے لیے قیمتوں کے تعین کی قومی پالیسی بے حد ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک منصفانہ آمدنی پالیسی بھی ہونی چاہیے۔ اگر آپ کے پاس ایسی پالیسی نہیں ہے اور آپ افراط زر دوگنا کر کے لوگوں کی طفل تسلی کے لیے ان کی آمدنی میں کوئی علامتی اضافہ کر دیتے ہیں تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ مجھے ڈر ہے جناب والا! کہ عوام اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ مہنگائی ان کو مجبور کرے گی کہ وہ احتجاج کریں اور سڑکوں پر آئیں۔ مجھے معاف رکھیں اگر میں آپ سے کہوں کہ عوامی احتجاج کے آگے بڑی مضبوط حکومتیں بھی ہل جاتی ہیں یہ حکومت تو بڑی کمزور حکومت ہے یہ تو احتجاج نہیں برداشت کر سکتی۔ یہ دعوے تو کرتی ہے کہ ہم سخت فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن یہ صرف ان کی غلط فہمی ہے۔

ٹیکنو کریٹس اپنے میدان میں بڑے اچھے ہیں لیکن ٹیکنو کریٹس کو سمجھنا چاہیے کہ حقیقی دنیا کیا ہے۔ اس حقیقی دنیا میں جب تک احتساب نہ ہو اور عوام کو ساتھ لے کر نہ چلیں تو مطلوبہ نتائج کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ریگن[1] ''کوئی ٹیکس نہیں'' کی پالیسی پر جیتا تھا، اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ بجٹ خسارہ ختم کر دے گا لیکن آٹھ سال کی حکومت کے باوجود بھی وہ خسارے کے بجٹ کو ختم نہیں کر سکا۔ کلنٹن[2] جس بنیاد پر جیتا تھا اس پر عملدرآمد میں جو مشکلات تھیں ان کی وجہ سے پہلے ۱۰۰ دن میں ہی اس کے حواس اکھڑ گئے تھے یہ سیاسی حقائق ہیں اور ٹیکنو کریٹس کو چاہیے کہ وہ سیاسی حقائق کو نظر انداز نہ کریں۔

غیر حقیقی دعوے: جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس پیکج میں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ جن کی حیثیت محض خیالات اور خواہشات کی ہے۔ مثال کے طور پر بڑے دعوے کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ ہم سوشل ایکشن پلان کی حوصلہ افزائی کریں گے اور اس کے لیے وسائل فراہم کریں گے۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اس پروگرام پر اس وقت کیا خرچ ہو رہا ہے؟ آپ کو کتنی اضافی رقوم حاصل ہوں گی جو آپ اس پروگرام کے لیے فراہم کریں گے اور کون سے پراجیکٹس کے مطابق ان پر خرچ کریں گے۔ اس حوالہ سے مقداری توسیع کا کوئی نقشہ موجود نہیں ہے۔

جناب والا! کہا گیا ہے کہ ہم بڑے بڑے پراجیکٹس کو بند کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں نہیں بتایا گیا کہ وہ کون سے پراجیکٹس ہیں، ان کی کل لاگت کیا تھی، کتنا خرچ ہو چکا ہے، ان کو مکمل کرنے میں کتنا خرچ مزید درکار تھا اور خود اب ان کو ختم کرنے کی کیا لاگت ہو گی۔ ان تمام سوالات کے جواب میں کوئی بات نہیں کہی گئی۔ کسی بھی طرح یہ منصوبہ اور پیکج نہیں، یہ تو خیالات اور تمناؤں کا اظہار ہے۔ اس کو آپ کسی بھی طرح معاشی پروگرام یا معاشی پیکج نہیں کہہ سکتے۔

---

[1] رونلڈ ریگن، جنوری ۱۹۸۱ء سے جنوری ۱۹۸۹ء تک امریکہ کے ۴۰ویں صدر رہے ہیں۔

[2] بل کلنٹن، جنوری ۱۹۹۳ء سے جنوری ۲۰۰۱ء تک امریکہ کے ۴۲ویں صدر رہے۔

جناب والا ! اس ملک میں زراعت کی ترقی کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے پروگرام کی بنیادی خرابی یہی ہے کہ ہم نے زراعت کی حقیقی ضروریات کو محسوس نہیں کیا اوراس کے لیے منصوبہ نہیں بنایا۔ اگر کبھی کمیشن نے تھوڑا بہت کام کیا تو ان پر عمل نہیں کیا گیا۔ بلاشبہ زرعی اشیاء کی قیمتوں کی پالیسی بڑی اہم چیز ہے، لیکن ہمیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ ہمارے یہاں قیمتوں کی غلط پالیسی کی بناء پر کاشت کار کو اس کی پیداوار کی حقیقی قیمت نہیں مل سکی۔ بد قسمتی سے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام دونوں میں احساس رہا ہے کہ صنعت کاری کو آگے بڑھانے کے لیے زراعت کو اس کی مالی مدد کرنا چاہیے اور ہمارے ہاں عملاً یہی ہوا ہے۔ اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کی گئی۔

ملک میں بے روزگاری کو آپ دیکھیں۔ سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں اس وقت تقریباً ۲۸ لاکھ افراد بے روزگار[1] ہیں اور یہ صرف رجسٹرڈ محنت کش قوت کا وہ حصہ ہے جو مکمل بے روزگار ہے۔ اگر اس میں آپ کمتر روزگار (Underemployed) کو شامل کر لیں تو سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بے روزگاری ۱۳ فیصد بنتی ہے۔ اس معاملے میں آئی ایل او کے جائزے بھی شاہد ہیں کہ ملک میں حقیقی بے روزگاری ۱۵ تا ۲۰ فیصد ہے۔ جس ملک میں ۱۵ تا ۲۰ فیصدی بے روزگاری ہو اس میں آپ روزگار پیدا کرنے کا وہ راستہ اختیار کر رہے ہیں جس میں ایک روزگار پیدا کرنے کے لیے کئی کئی ملین کے وسائل درکار ہوتے ہیں۔ آپ کی نئی زرعی ترقیاتی حکمت عملی کی خرابی یہ ہے کہ گھریلو اور چھوٹی صنعتوں اور غیر رسمی شعبوں کی ترقی کے لیے کوئی مدد نہیں دے سکتی۔ اس حکمت عملی کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ ملک مستقل بے روزگاری کا شکار رہے گا اور نتیجتاً معاشرہ لاقانونیت اور منشیات کے فروغ میں گھرا رہے گا۔ جناب والا! اس پیکج کے نتیجہ میں ہمیں یہ تو معلوم ہوتا کہ بے روزگاری کا جن کیسے قابو ہو گا،

---

[1] لیبر فورس سروے (۱۸-۲۰۱۷ء) کے اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد بڑھ کر تقریباً ۳۸ لاکھ ہو گئی ہے اور اندیشہ ہے کہ حالیہ سالوں (۲۰-۲۰۱۹ء) کی بدترین معاشی حالت جس میں جی ڈی پی کی شرح محض منفی ۰ء۳۸ فیصد رہی اور اس پر کرونا وبا کے اثرات کی بنا پر ان اعداد میں اور بھی اضافہ ہو گا۔

روزگار کی تخلیق کن عوامل سے ہوگی اور فی الحقیقت غربت کو کیسے دور کیا جاسکے گا؟ اس میں اس کے برعکس ان چیزوں کے حوالہ سے کوئی پروگرام نہیں۔ زور اسی پر نظر آتا ہے کہ کس طرح ہم آئی ایم ایف اور عالمی بینک کو مطمئن کریں اور ان کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

جناب والا! اقتصادی پیکج کے نام پر جو کچھ ہمارے سامنے آیا ہے یہ اس ملک کے لیے اقتصادی پلاننگ نہیں ہے۔ یہ واشنگٹن میں عالمی بینک کی ۴۲ویں منزل پر بیٹھ کر تھرڈ ورلڈ کے لیے منصوبہ بندی کا ایک نمونہ ہے اور اس سے حالات نہ ماضی میں بدلے ہیں نہ آج بدل سکتے ہیں۔ جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ زرعی آمدنی اور دولت پر ایک ٹیکس کی تجویز لائی گئی ہے۔ میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے جہاں زرعی آمدنی پر عمومی ٹیکس کی مخالفت کی وہاں اس بات کو ضروری قرار دیا کہ زراعت کے شعبے سے متعلق بڑے بڑے جاگیر دار اور زمیندار افراد پر ٹیکس لازماً ہونا چاہیے۔ یہ فرق کہ شہر کی آبادی کے لیے آپ کا ایک، اور دیہی کے لیے دوسرا معیار ہے یہ غلط ہے۔ اسی ہاؤس کی ٹیکس کمیٹی کی رپورٹ، جس کا میں چیئرمین تھا، ریکارڈ میں موجود ہے۔ اس رپورٹ میں ہم نے اس کے لیے ایسے فارمولے تجویز کیے ہیں جن پر عملدرآمد سے ایک معقول صورت اختیار کی جاسکتی ہے لیکن جناب والا! یہاں جو کچھ کیا گیا وہ دستور کے خلاف ہے اور وہ حقیقت پسندی سے بھی مطابقت نہیں رکھتا، وہ ایک قسم کا دکھاوے کا کام تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آسکتی ۔ جناب والا! زراعت ہمارے ملک میں خسارے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے۔ آپ دیکھیں کہ بالواسطہ ٹیکس جتنے بھی ہیں وہ شہری ہو یا دیہی آبادی سب ادا کرتی ہیں۔ اور ۸۵ فیصد کل ٹیکسوں کا یہ بالواسطہ ٹیکس ہیں[1]۔ جاگیر دار اور زمینداروں کی آمدنیوں پر بھی اسی طرح براہ راست ٹیکس ہونا چاہیے جس طرح غیر زرعی شعبہ کی آمدنیوں پر ہوتا ہے۔

---

[1] بالواسطہ ٹیکسوں کے تناسب میں حالیہ دور میں کمی آئی ہے. (۲۱-۲۰۲۰ء) کی بجٹ دستاویز میں ایف بی آر کے کل ٹیکسوں میں سے ۵۹ فیصد ٹیکس بالواسطہ دکھائے گئے ہیں لیکن تمام ماہرین معیشت متفق ہیں کہ یہ تناسب اب بھی بہت زیادہ ہے۔

زکوٰۃ اور ٹیکس کا نظام: یہاں میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ایک طرف غربت کو دور کرنے کے لیے زکوٰۃ کے نظام کو لائے ہیں اور اس میں بہت سی خامیوں کے باوجود اس کے کچھ نہ کچھ مثبت اثرات رونما ہوئے ہیں[1]۔ جو اصلاح طلب امور ہیں اور جس کے معاملے میں سینیٹ کی کمیٹی نے تفصیلی سفارشات پیش کی تھیں ان پر عمل ہونا چاہیے۔ آپ چاہیں کہ ایک آدمی بیک وقت زکوٰۃ بھی دے اور اس پر دولت ٹیکس بھی لگایا جائے، یہ اسلام کے اصولوں کے مطابق بھی درست نہیں ہے اور یہ اصول ٹیکس کے حساب سے بھی غلط ہے کہ اس طرح آپ ایک ہی دولت کے اوپر دہرا ٹیکس عائد کر دیتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح آپ نے عشر کا نظام متعارف کیا ہے۔ عشر زرعی پیداوار کے اوپر عائد ہوتا ہے۔ اب اگر عشر کے ساتھ ساتھ آپ زمین کے اوپر دولت ٹیکس لگا دیتے ہیں تو میری نگاہ میں یہ بھی دہرا ٹیکس ہے اور یہ خود عشر کے مقاصد کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ہاں جو لوگ زراعت کے میدان میں دولتمند ہیں اور ان کی تعداد بھی کافی ہے، ان کی شان و شوکت اور اسراف سب کے سامنے ہے ان پر ضرور ٹیکس ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا طریقہ وہ اختیار کیا جائے جس سے زراعت متاثر نہ ہو، بدعنوانی نہ بڑھے اور انکم ٹیکس کے نظام میں ایک بڑی خرابی دور ہو جائے۔ دوسری جانب ٹیکس انتظامیہ میں بھی، جس کے ذریعہ آپ ٹیکس وصول کرتے ہیں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اس انتظامیہ نے انکم ٹیکس کے نظام کو اور اندرون ملک آمدنی کے نظام کو ظلم اور کرپشن کا نظام بنا دیا ہے۔

پی آئی یو[2] کے بارے میں مجھے اتفاق ہے کہ وہ ایک ایسا اقدام ہے کہ جس سے ہم ٹیکس کا نظام منصفانہ بنا سکتے ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی جو حد رکھی گئی

---

[1] بعد کے سالوں میں زکوٰۃ کا نظام مسلسل تنزلی کا شکار ہوتا رہا ہے۔ یہ تنزلی عمومی طور پر حکومت پر بداعتمادی اور بالخصوص زکوٰۃ کے حوالہ سے حکومتی نظام پر بداعتمادی کا مظہر ہے۔ جہاں تک انفرادی اور اجتماعی سطح پر ادائیگی اور استعمال ہے، پاکستان میں چلنے والے بے شمار فلاحی ادارے اس نظام میں موجود امکانات کی گواہی دیتے ہیں۔

[2] Produce Index Unit (PIU)

ہے، وہ محل نظر ہے۔ زراعت کے اوپر جو کچھ کام میں نے کیا ہے اس کی روشنی میں میرا خیال یہ ہے کہ یہ حد بہت کم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زرعی ٹیکس یا زرعی آمدنی پر ٹیکس کے بارے میں بجائے اس کے کہ عجلت میں کوئی فیصلہ کیا جائے، ضرورت ہے کہ اس پر بحث و مباحثہ ہو، ریسرچ ہو اور پارلیمنٹ میں بحث ہو۔ پھر یہ بھی نہ بھولیے کہ ہمارے دستور میں زراعت پر ٹیکس کے بارے میں کچھ پابندیاں اور کچھ حدود ہیں۔ مرکزی حکومت یہ کام نہیں کر سکتی۔ کرنا چاہے تو صوبائی خود مختاری کو متاثر کیے بغیر یہ بات ممکن نہیں۔ چنانچہ نگراں حکومت کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ وفاقی حکومت کی حیثیت سے ایک پالیسی پیش کرے اور صوبوں کو مجبور کرے کہ وہ اس کی تائید کریں یا اسے مجبوراً قبول کریں۔ یہ بات اصول اور سیاست عامہ کے خلاف ہوگی۔ اس بناء پر میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک اچھی چیز تھی بھی تو جس طرح یہ لائی گئی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کو قومی بحث کا ذریعہ بنانا چاہیے۔

اسٹیٹ بینک کی خود مختاری: مجھے اصولی طور پر اس بات سے اتفاق ہے کہ اسٹیٹ بینک کو خود مختار ہونا چاہیے۔ میں نے اس بات کو خود بھی بار بار اپنی تحریر کردہ مختلف رپورٹوں میں کہا ہے لیکن جناب والا! مجھے اس کے ساتھ ساتھ یہ بات کہنے کی بھی اجازت دیں کہ اس ملک کے مالیاتی نظام کے بگاڑ کا ایک بہت بڑا سبب یہ رہا ہے کہ آپ نے پورے بینکنگ سسٹم کو یعنی اسٹیٹ بینک، کمرشل بینکوں اور قومیائے گئے بینکوں کو وزارت خزانہ کے ماتحت رکھا ہے۔ یہاں سے ان کی ڈوریاں ہلائی جاتی ہیں اور پورا مالیاتی نظام متاثر ہوتا ہے۔ بلاشبہ اسٹیٹ بینک کی خود مختاری کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے قانون سازی ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جرمنی[1] کا اور امریکہ کا سنٹرل بینک[2] اپنی خود مختاری کی بناء پر کس طرح افراط زر کو روکنے اور اچھی معاشی پالیسیوں کو فروغ دینے میں مثبت کردار ادا کرتا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بینک آف انگلینڈ اپنی چار سو سالہ روایت کو بدل کر

---

[1] Deutsche Bundesbank

[2] Federal Reserve

اب سنٹرل بینک کی خود مختاری کی طرف آرہا ہے۔ یہ ایک اچھی چیز ہے لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آپ کا اسٹیٹ بینک قابل اعتماد ہاتھوں میں ہو، ایسے ہاتھوں میں جو قوم کے سامنے جوابدہ ہوں۔ ان کے چارٹر کو واضح ہونا چاہیے کہ ان کے اختیارات کو استعمال کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کیا جائے گا۔ آپ نے تو عملاً یہ کیا ہے کہ آپ نے اسٹیٹ بینک کے بعد ایک کمیٹی بنادی اور اس طرح سے جو کچھ اختیار سٹیٹ بینک کو اس سے قبل ملکی بینکوں پر حاصل تھا، وہ نہ صرف الجھاؤ کا شکار ہوا بلکہ مفقود ہو گیا۔ چنانچہ میں اسٹیٹ بینک کی خود مختاری کے حق میں ہوں لیکن اس کی بھی ضرورت ہے کہ اسٹیٹ بینک کی سربراہی قابل اعتماد ہاتھوں میں ہو اور اس کا بورڈ آف گورنر اس طرح تشکیل کیا جائے کہ وہ ایماندار و باصلاحیت لوگوں پر مشتمل ہو اور وہ کسی نہ کسی پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے جوابدہ ہوں۔ یہ بات واضح طور پر سامنے آئے کہ کن لوگوں کو بورڈ کا رکن بنایا جارہا ہے، ان کا پورا ریکارڈ سامنے آئے تاکہ لوگوں کو ان ارکان کے پس منظر اور اہلیت کا اندازہ ہو۔ میں کسی خاص فرد کے بارے میں کوئی بات نہیں کہتا لیکن آج تو عالم یہ ہے کہ جسے دیکھیں آئی ایم ایف سے چلا آرہا ہے۔ اسٹیٹ بینک کا گورنر دو سال پہلے آئی ایم ایف[1] سے آیا اور اب نگراں وزیر اعظم بھی اسی ذریعہ سے چلا آرہا ہے۔ فنانس منسٹری کے لیے جو قطار لگی ہوئی ہے اس میں بھی آئی ایم ایف کی جھلک نمایاں ہے۔

جناب والا! اس طرح اگر آپ خود مختاری دیں گے تو اس پر قوم کبھی اعتبار نہیں کرے گی۔ خود مختاری ضرور دیجیے اس کے لیے قانون سازی کیجیے لیکن ساتھ ساتھ جہاں ایمانداری اور صلاحیت ضروری ہے وہیں جوابدہی بھی یقینی بنائیے۔ پارلیمانی جوابدہی کا راستہ بنایا جائے تاکہ وزارت خزانہ کی بجائے قوم کے سامنے جوابدہی ممکن ہو سکے۔

---

[1] بدقسمتی سے یہ سلسلہ رُکا نہیں اور موجودہ گورنر اسٹیٹ بینک (رضا باقر) بھی گورنر بننے سے پہلے آئی ایم ایف سے وابستہ رہے ہیں۔

وسائل کا ضیاع: جناب والا! اخراجات کم کرنے کے بارے میں بہت سی باتیں اس پیکج کے حوالہ سے سامنے آئی ہیں لیکن یہاں پر ابہام ہے۔ مجھے توقع تھی کہ معاشی پس منظر رکھنے والا وزیر اعظم بتائے گا کہ اس وقت ضیاع کہاں کہاں ہو رہا ہے اور اس وقت میں اتنی رقم یہاں یہاں سے بچاؤں گا۔ یہ فی الواقع قابل تعریف بات ہو گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ اکانومی کمیٹی نے اس سے پہلے یہی کام کیا ہے اور جناب والا! آپ نے اس کمیٹی کی خود صدارت کی ہے، جس نے میرے علم کی حد تک بڑی مثبت تجاویز دی تھیں لیکن بد قسمتی سے خود انحصاری کمیٹی کی طرح آپ کی اس کمیٹی کی رپورٹ بھی سرد خانے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس پر مجھے خوشی ہے کہ اس کو شاید بحال کیا گیا ہے۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ کام محض اعلانات اور خوشنما الفاظ سے نہیں ہو سکے گا ایسے تمام معاملات میں آپ کو قطعیت سے چلنا پڑے گا۔

اسی طرح جناب والا! آپ نے فارن مشنز کے بارے میں کہا تھا کہ ہم ان کی تعداد یا اخراجات کم کر رہے ہیں، ضرور کم کیجیے میں اس کے حق میں ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی دیکھیے کہ ضیاع فی الواقع کہاں ہے۔ ضیاع ختم ہونا چاہیے لیکن ملک کے باہر پروجیکشن کے لیے جہاں جہاں آپ کی نمائندگی ضروری ہے وہاں آپ کی مؤثر نمائندگی ہونی چاہیے۔ یہ آپ کی سیکورٹی کا امتیازی پہلو ہے اور یہ محض لوگوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں کیا جانا چاہیے۔ نہ ہی یہ کام جلد بازی سے کرنے کا ہے۔ اسے سلیقے سے اس طرح ہونا چاہیے کہ اس سے بیروزگاری پیدا نہ ہو اور باصلاحیت افراد کے لیے روزگار کی فراہمی کے متبادل ذرائع موجود ہوں۔ آپ نے روزگار کی فراہمی کا منصوبہ نہیں بنایا اور اعلان کر دیا کہ ہم کارپوریشنز کو بند کر دیں گے۔ حالانکہ ایک ایک کارپوریشن میں کئی کئی ہزار افراد ملازم ہیں۔ ان افراد کے لیے آپ کیا کریں گے؟ بجائے اس کے کہ آپ کارپوریشن کو بند کریں آپ کو سوچنا چاہیے کہ ہم کس طرح ایک تبدیلی کا راستہ اختیار کریں اور کس طریقے سے لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کا راستہ اختیار کریں۔ یہ کام محض اس طریقے کے اعلانات سے نہیں ہو گا۔

ممبران پارلیمنٹ کا کوٹہ: جناب والا! میں اصولاً اس بات کے خلاف رہا ہوں کہ پارلیمنٹ کے

ارکان کو کوئی کوٹہ دیا جائے۔ اس لیے کہ میری نگاہ میں پارلیمنٹ کا کام قانون سازی اور پالیسی سازی ہے، سڑکیں بنانا اور نالیاں صاف کرنا نہیں ہے۔ لیکن ماضی میں اس معاملے میں یہ روایت قائم ہو گئی اور ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنے اپنے مقاصد کی خاطر اسے استعمال کیا۔ اب اگر آپ ایک پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں تو اس کو مناسب جائزہ اور یہ دیکھے بغیر ختم نہ کیجیے کہ پائپ لائن میں کتنے منصوبے ہیں۔ یکمشت ختم کرنے سے پائپ لائن میں موجود کئی منصوبے ضائع ہو جائیں گے۔ اس ضمن میں اپوزیشن اور حکومتی ارکان کے درمیان کوئی امتیاز بھی نہیں ہونا چاہیے۔

قرضوں کی وصولی: جناب والا! اس موقع پر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس پیکج میں کچھ چیزیں ایسی بھی رکھی گئی ہیں جو میری نگاہ میں پیکج کا حصہ نہیں ہیں۔ گو یہ بات بہت ضروری ہے کہ نادہندگان سے قرض وصول کیا جائے، خواہ وہ نادہندگان واپڈا کے ہوں یا کسی اور یوٹیلٹی سروس کے اور یا بینکوں کے۔ مجھے اس سے بھی سو فیصدی اتفاق ہے کہ جن لوگوں نے قوم کے وسائل کو غلط طور پر اپنی معاشی حیثیت کو بلند کرنے کے لیے استعمال کیا ہے، جنہوں نے بینکوں سے لاکھوں کروڑوں اور اربوں کے قرضے لیے ہیں اور بروقت ادا نہیں کیے، جنہوں نے قرضے معاف کروائے ہیں، جنہوں نے بلاجواز ری شیڈول کروائے ہیں ان سب پر گرفت ہونی چاہیے اور ان سب کو سزا ملنی چاہیے۔

لیکن جناب والا! اس پوری تقریر میں مجھے کہیں بھی کسی سزا کا ذکر نہیں ملا۔ اگر فی الحقیقت آپ حالات کو بہتر بنانے میں سنجیدہ ہیں تو یہ لوگ تو قومی مجرم ہیں، ان کو سزا ملنی چاہیے۔ اس کے برعکس آپ تو ان کے ناموں کو اخفا میں رکھ رہے ہیں یا یہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ نام خاموشی سے الیکشن کمیشن کو بتا دیں گے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے، قوم کو اعتماد میں لیجیے، ان کو مجرموں کو کٹہرے میں کھڑا کیجیے اور ان سے یہ پیسے وصول کیجیے۔ اور جو نہیں دیتے ان کو قرار واقعی سزا دیجیے۔ محض الیکشن کے لیے نااہل قرار دینا کافی نہیں ہے۔ میں اس کے بارے میں یہ سمجھتا ہوں اس کا تعلق محض آپ کے اس پیکج سے نہیں ہے بلکہ یہ تو

دراصل ملک میں ایک صاف ستھری گورنمنٹ کے قیام کے لیے ضروری ہے۔

جناب والا! اسی طرح یہ بات کہ واپڈا جس کے غیر اداشدہ بلز اگر میری معلومات درست ہیں تو اس وقت دس ارب روپے ہیں[1]۔ آپ اس روپے کو وصول کرنے کے لیے کوئی پروگرام نہیں بناتے ہیں لیکن قیمتوں میں اضافہ کر کے عام صارفین پر اس کا بوجھ ڈال دیتے ہیں۔ اور یہ محض ایک دفعہ نہیں ہے، واپڈا نے ایک سال میں تین بار قیمتیں بڑھائی ہیں اور اس کے باوجود بھی یہ لنگڑی لولی دلیل دی جاتی ہے کہ اس طرح اسے ترقیاتی وسائل مل جائیں گے۔ جناب والا! میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ وہ وسائل کبھی بھی دستیاب نہیں ہو سکیں گے جب تک کہ آپ اس نظام اور اس کی خامیوں کو درست نہیں کریں گے اور جہاں خرابی ہے وہاں آپ اصلاح نہیں کریں گے۔

عالمی اداروں کا خوف

جناب والا! ایک بات میں آپ سے دوبارہ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ ہم ایسی اصلاحات لا رہے ہیں جن کو کوئی نہیں بدل سکے گا۔ اس کی جو دلیلیں دی گئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا خوف رہے گا اور کل آنے والی کسی حکومت کے لیے یہ بات ممکن نہیں ہو گی کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ناراضگی لے کر ان اصلاحات کو بدلے۔

جناب والا! میں اس کو چیلنج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ملک ایک آزاد ملک ہے ہم ایک غیور اور باعزت قوم ہیں۔ محض اس بناء پر کہ ورلڈ بینک ناراض ہوتا ہے یا خوش ہوتا ہے ہم اپنی معاشی پالیسیاں نہیں بنائیں گے۔ ہم اپنی معاشی پالیسی اپنے نظریات اور مقاصد اور اپنی ضرورتوں اور حالات کی روشنی میں بنائیں گے۔ اس پر اگر ورلڈ بینک خوش ہوتا ہے تو وہ اپنے

---

[1] توانائی کے گردشی قرضے اس وقت ایک دیو ہیکل آفت کی صورت اختیار کر گئے ہیں جو ۲۰۳۰۶ء کھرب روپے (نومبر ۲۰۲۰ء تک کے اعداد) تک پہنچ چکے ہیں۔

گھر خوش رہے ہم اپنے گھر خوش۔

دوسری بات یہ کہی جارہی ہے کہ آنے والی حکومتیں مجبور ہوں گی کہ جو چیزیں ہم کر رہے ہیں وہ ان کو لے کر چلیں۔ میں صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس نگراں حکومت کے فیصلوں کی عمر اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی اس حکومت کی ہے۔ اگر یہ کوئی آرڈیننس پاس کرتے ہیں تو اس آرڈیننس کو بھی جب تک نئی پارلیمنٹ قبول نہ کرلے وہ ختم ہو جائے گا۔ تو یہ کہنا کہ ہم نے جو تبدیلی کر دی ہے وہ کوئی تزویراتی تبدیلی ہے کہ اب آسمان گر جائے یا زمین پھٹ جائے اسے کوئی نہیں بدل سکے گا یہ ایک خوش فہمی ہے۔

ٹیکنوکریٹس پر مبنی حکومت کا اس طرح دھوکا دینا انھیں کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔ انہیں تو اس ملک کے قانون اور سیاسی نظام کو اپنی مہارت اور تجربہ سے اوروں سے بہتر بنانا چاہیے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان تمام معاملوں پر آئندہ پارلیمنٹ میں بحث ہو۔ مجھے توقع تھی کہ پروفیشنل پرائم منسٹر وہ راستہ اختیار نہیں کرے گا جو دھاندلی سے آنے والے ڈکیٹر اختیار کرتے ہیں، اسے زیب نہیں دیتا کہ محض اپنی مرضی یا زیادہ سے زیادہ اپنی کابینہ کی مرضی لے کر دور رس اثرات پر مبنی فیصلے کرلے۔ خود کابینہ کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ بہت سے فیصلوں میں اس کی مرضی شامل ہے یا نہیں۔ لیکن روپے کی قدر میں کمی کے فیصلے کے بارے میں تو میں جانتا ہوں کہ وہ فیصلہ کابینہ کے مشورے کے بغیر اور کسی قومی مباحثہ اور ملک کے مختلف مکاتب فکر کو غور کی دعوت دیے بغیر کیا گیا۔ محض یہ بات کہ میاں نواز شریف اور بے نظیر اور ان کے اکنامک ایڈوائزر وی اے جعفری سے بات کرلی گئی تھی یہ قوم کو اعتماد میں لینے کے مترادف نہیں ہے۔ اس طرح قومی مباحثہ کے بغیر کسی بھی پالیسی سازی کی مدت بڑی قلیل ہو گی اور نہ ہی یہ کبھی کامیاب ہو گی۔

اقتصادی پیکج ایک تباہ کن ایجنڈا: جناب والا! اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اس پیکج میں چند اچھے خیالات اور اچھے مشورے ہیں، اور بلاشبہ ہیں، تو اس کا اصل مقام قومی مشاورت اور پارلیمنٹ میں بحث ہے۔ ملک کے سامنے اس طرح ایک اکنامک ایجنڈا لانا

ہے کہ کل کی پارلیمنٹ اور کل کی حکومت صحیح راستے پر چل سکے۔ لیکن جہاں تک خصوصیت سے اس پیکج کا مرکزی تصور ہے، جو عبارت ہے، بندشوں کو کھولنے، نجکاری، صارفین کے خرچ کو بڑھانے، زر تلافی کو ختم کرنے اور اس کے نتیجہ میں ملک میں افراط زر پیدا کرنے اور قیمتوں کو بڑھانے سے، یہ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کا فریم ورک ہے۔ اس حکمت عملی نے دوسرے ملکوں کو بھی تباہ کیا ہے اور یہ ہمارے ملک کو بھی تباہ کرے گا۔ اور یہ تباہی محض معاشی اعتبار سے نہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی ہوگی (خدانخواستہ)۔ اس مرکزی فورم پر میں تنقید بھی کرتا ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس ملک کو جب تک کہ آئی ایم ایف کی ڈکٹیٹ کرتی ہوئی ترقی کی حکمت عملی سے آزاد نہ کیا جائے، ہم نہ معاشی طور پر آزاد ہو سکیں گے اور نہ حقیقی طور پر خود کفیل ہو سکیں گے۔

جناب والا! اس پورے پیکج کے اندر عوام کے حقیقی مسائل کے فہم کی کمی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے وافر وسائل دیے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر یہ 'اصلاحات' کر دیں اور ٹھیک ہے جو لوگ بہت چیخیں چلائیں گے ان کے لیے کچھ معمولی سہولت کا اعلان کر دیا جائے۔ شاید وہ اس سے خاموش ہو جائیں۔ جناب والا! اس سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ آپ نے عوام کے حقیقی مسائل، ان کے اصل رد عمل، ان کے دکھ درد اور ان کی ضرورتوں کا خیال نہیں کیا اور اس کے مقابلے میں آپ کے سامنے صرف ایک بات رہی ہے اور وہ یہ کہ کس طرح آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ناخداؤں کو خوش کریں۔

جناب والا! یہ راستہ معاشی غلامی کا راستہ ہے اور مجھے ڈر ہے کہ یہ راستہ سیاسی غلامی کا بھی راستہ ہے۔ آج آپ سے وہ صرف یہ شرائط منوا رہے ہیں کل وہ آپ سے جو دوسری چیزیں منوانا چاہتے ہیں ان میں اس معاشرہ میں رائج اسلامی قدروں کی بیخ کنی، ملک کی فوجی صلاحیت کا خاتمہ اور اس علاقے میں ہندوستان کی بالا دستی کو منظور کرانا ہے۔ اسی ایجنڈے کے تحت وہ کشمیر کے معاملے میں آپ کا گلا گھونٹ رہے ہیں کہ آپ اپنے ان بھائیوں کی جو آپ کی جگہ لڑ رہے ہیں تائید بھی نہیں کر سکتے۔ ایٹمی دفاعی صلاحیت جیسی چیز دباؤ کے تحت

آپ سے چھڑوانا چاہیں گے اور آپ مجبوری کا نام لیتے ہوئے پیچھے ہٹتے چلے جائیں گے۔ لیکن جناب والا! میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ قوم اس راستے کو بھی قبول نہیں کرے گی۔ وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ ہمیں نئی پالیسیوں کی ضرورت ہے لیکن وہ پالیسیاں بنانے والے ہم ہونے چاہییں۔ ان کا ہدف اس ملک میں انصاف پر مبنی ایک ایسا صحت مند نظام ہونا چاہیے جو اسلام اور لوگوں کی حقیقی ضرورت کے مطابق ہو۔

امریکہ کا سیارہ بن کر جناب والا! ہم کوئی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ معاشی غلامی سیاسی غلامی کی طرف لے جانے والی چیز ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا بروقت احتساب کیا جائے اور اسے روکا جائے۔ اس کے لیے ہم ہر وہ طریقہ اختیار کریں گے جو اخلاقی، جمہوری اور قانونی دائرہ میں ہمیں دستیاب ہے۔ ہم اس طرف بڑھنے والوں کا ہاتھ روکیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ یہ ملک اپنی اصل منزل اور اصل مقصد کی طرف آگے بڑھے۔ اس کے جمہوری ادارے کام کریں۔ اس کے دستوری طریقہ کار اور عوام اور ان کی ضروریات سے کوئی انحراف نہ ہونے پائے۔ میں نے جو بات کہی ہے وہ نصیحت کے جذبے سے کہی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اگر ان باتوں میں صداقت ہے تو وہ ہماری نگران حکومت کے دلوں کو بھی کھول دے۔ میں ہمیشہ تیار ہوں گفتگو کے لیے، بحث کے لیے، دلیل کے لیے اور میں چاہتا ہوں کہ دلیل کا جواب دلیل سے ملے۔

(۲۲ اگست ۱۹۹۳ء)

پاکستانی معیشت پر عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملی کے اثرات (۲)

فروری ۲۰۰۸ء میں قومی انتخابات کا انعقاد ہوا۔ انتخابات کے نتیجہ میں وفاق میں وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی کی قیادت میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ جبکہ کچھ عرصہ میں فوجی صدر جنرل پرویز مشرف کی صدارت بھی ختم ہوئی اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین آصف علی زرداری صدر پاکستان کے منصب پر فائز ہوئے۔ زیر نظر تحریر اس حکومت کے قیام کے ۸ ماہ بعد پروفیسر خورشید احمد کی تقریر پر مبنی ہے۔ اس سے قبل گزشتہ باب میں پروفیسر خورشید احمد کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ۱۹۹۳ء میں اس وقت کے نگراں وزیر اعظم کے اقتصادی پیکج پیش کرنے پر کی تھی۔ یوں دونوں تقاریر کے درمیان پندرہ سال کا وقفہ ہے۔ لیکن کیا پندرہ سال کے عرصہ میں اور سیاق وسباق کی تبدیلی کے باوجود معاشی مسائل کی نوعیت اور معاشی پالیسیوں کی تشکیل میں عالمی اداروں کو راضی کرنے کے لیے حکومتی حکمت عملیوں میں بھی کوئی فرق واقع ہوا؟ سینیٹ میں ۲۰۰۸ء میں کی گئی اس تقریر سے نہ صرف اس سوال کا جواب حاصل ہو جاتا ہے بلکہ آئندہ کے لیے سوچ بچار میں بھی مدد ملتی ہے۔

جناب چیئرمین! اس وقت معاشی صورت حال بڑی گھمبیر ہے اور ہم سب بڑی مشکل میں ہیں۔ اسے ہرگز معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلاشہ اس صورت حال کے بنانے میں بڑا حصہ ماضی کی حکومت کا تھا۔ اسی لیے ہم یہ بار بار کہتے ہیں کہ محض اس کی مذمت کرنا، اس کو سامنے لانا کافی نہیں ہے بلکہ سابقہ دور کے ذمہ داران جنرل مشرف، شوکت عزیز اور بیوروکریسی سے تعلق رکھنے والے ان تمام مشیروں کا بھی احتساب ہونا چاہیے اور انہیں

قرار واقعی سزا ملنی چاہیے جن کا اس صورت حال کو پیدا کرنے میں بھی کوئی بھی کردار رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے یہ جو معافی کی اسناد دی جارہی ہیں اس سے کام نہیں بنے گا۔ جب تک کہ آپ دستور، قانون اور اس ملک کے مفاد سے کھیلنے والوں پر گرفت نہیں کریں گے، اس وقت تک یہ کھیل ختم نہیں ہو گا۔

اس لیے جہاں میں اعتراف کرتا ہوں کہ خرابی کا بڑا حصہ ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے، وہیں مجھے یہ کہنے کی اجازت بھی دیجیے کہ ۸ مہینے جو آپ کو ملے، یہ کوئی کم مدت نہیں۔ ان ۸ مہینوں میں حقیقت یہ ہے کہ آپ حالات کے اوپر اپنی گرفت ثابت نہیں کر سکے۔ آپ اس وقت تک اس معاملے میں ناکام رہے ہیں کہ کوئی معاشی پالیسی، معاشی پیکج، مالیاتی پالیسی، تجارت، پیداوار، غریبوں کو ریلیف یعنی ان ساری چیزوں کو ایک پیکج کی شکل میں لے کر آئیں۔ اس ناکامی کی ذمہ داری آپ کو قبول کرنی چاہیے اور اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔

مسائل کی نوعیت

جناب چیئرمین! اس وقت ہمارا مسئلہ ہے کیا؟ ہمارا مسئلہ افراط زر ہے، بجٹ کا خسارہ ہے، تجارت اور ادائیگیوں میں عدم توازن ہے، پیداواری شعبہ ہے اور خصوصاً زراعت اور پیداوار میں کساد بازاری ہے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اس صورت حال کو جمود کہتے ہیں۔ یعنی وہ صورت حال کہ جب افراط زر کے ساتھ ساتھ معاشی سرگرمیوں میں جمود بھی ہو۔ مسئلہ صرف اوپری سطح کے استحکام کا نہیں ہے جو آپ کو آئی ایم ایف سمجھا رہا ہے۔ میں بڑے دکھ سے یہ بات کہہ رہا ہوں، یہ معاشی پالیسی کا مسئلہ ہے۔ بینکرز جن کی تربیت ضمانت اور ادھار دینے کے نکتہ نظر سے ہوتی ہے، وہ اس کی اصل اہمیت اور سنجیدگی کو نہیں سمجھ سکتے۔ نہ ہی وہ مشکلات اور اس کی کثیر جہتی نوعیت سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کے پاس ماہرین معاشیات موجود ہیں، انہیں بٹھایئے اور ان کی مشاورت سے جمود کی اس صورتحال کے مقابلہ کے لیے اقدامات کیجیے۔ جب تک کہ پیداواری سرگرمی آگے نہیں بڑھتی اور زرعی پیداوار میں اضافہ

نہیں ہوتا، آپ افراط زر کو بھی قابو نہیں کر سکیں گے۔

افراط زر کی بنیادی وجہ بلاشبہ یہ ہے کہ بجٹ کا خسارہ مسلسل بڑھ رہا ہے[1]۔ اس کی وجہ آپ کا مجموعی حکومتی خرچہ ہے جس میں پچھلے سات سال کے اندر پانچ گنا اضافہ ہوا ہے جو غیر منصفانہ ہے۔ اس کی وجہ نقدر قم کی فراہمی ہے۔ نقدر قم کی فراہمی ۵ سے ۶ فیصد کے اندر رہنی چاہیے وہ ۲۰ فیصد تک گئی ہے[2]۔ اس کی وجہ بینکاری نظام سے لیا گیا ادھار ہے۔ یہ تمام باتیں صحیح ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ سامان اور خدمات کی پیداوار میں کمی اور زراعتی و صنعتی آلات کا مہنگا ہونا ہے۔ اس کی وجہ بے روزگاری اور وہ ماحول ہے جس کی بنا پر آپ کی بچت کی شرح دنیا کے ملکوں میں کم ترین شرح میں سے ہے۔ اس وقت بھارت کی شرح بچت ۳۰ فیصد سے زیادہ ہے، چین کی ۴۰ فیصد ہے، ملائشیا کی ۳۴ فیصد ہے اور آپ کی بمشکل ۱۲-۱۳ فیصد ہے[3]۔ یہ انتظامی ڈھانچے کا نقص اور ادارہ جاتی مسائل ہیں اور اس سے جمود پیدا ہو رہا ہے۔ یہ جو آئی ایم ایف کے دیے ہوئے نسخے کی روشنی میں آپ میکرو استحکام(Macro Economic Stability) کی بات کر رہے ہیں، اس سے مسئلہ کبھی حل نہیں ہو گا۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم ملک کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے حکمت عملی بنا رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آئی ایم ایف کا ساٹھ سال کا ریکارڈ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ پچاس سے زیادہ ممالک میں اس کی پالیسی چلی ہے اور ناکام ہوئی ہے اور خود ہم بھی اس کو بھگت چکے ہیں۔

آئی ایم ایف: ایک تباہ کن راستہ

آج سے ایک ہفتہ پہلے آپ نے خود یہ بات کہی کہ رعایتی شرح نہیں بڑھنی چاہیے

---

[1] سال ۲۰۲۰ء کے حکومتی اعداد کے مطابق بجٹ خسارہ کل جی ڈی پی کا ۷ فیصد تک پہنچ گیا ہے۔

[2] اسٹیٹ بینک پاکستان کے اعداد کے مطابق سال (۲۰-۲۰۱۹ء) میں یہ شرح ۷ء۱۷ فیصد ہے، جو ابھی بھی بہت زیادہ ہے۔

[3] پاکستان کی شرح بچت اس وقت بھی بہت کم ہے۔ جون ۲۰۲۰ء کے اعداد کے مطابق یہ محض ۴ء۸ فیصد رہی۔

لیکن آج وہ بڑھا دی گئی ہے۔ اس لیے بڑھائی گئی ہے کہ آئی ایم ایف کے نسخے کے اندر جو اہم ترین چیز ہے وہ رعایتی شرح کا بڑھانا، سبسڈی کو ختم کرنا، غیر ملکی زرمبادلہ کے لیے آسان ماحول بنانا اور نجکاری پر سے پابندیاں ہٹانا۔ حتّٰی کہ وہ تیسری دنیا کے ممالک سے جن کی سرمایہ دارانہ منڈیاں اپنی بنیادوں کے اوپر استوار ہی نہیں ہیں، اعتدال اور ضابطوں کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جس ملک نے اپنے آپ کو ضابطوں کی پابندیوں سے آزاد کیا ہے، اس کی معیشت تباہ ہوئی ہے۔ یہ ان کا طریقہ ہے اور آپ اسی راستے پر جا رہے ہیں۔ اس لیے میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آئی ایم ایف کی طرف جانا نقصان دہ اور تباہ کن ہے، اب بھی وقت ہے کہ ہوش کے ناخن لیں اور یہ کام نہ کریں۔

منڈی کی معیشت اور نجکاری: میں اگلی بات نجکاری کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ بلاشبہ منڈی کی معیشت ایک کامیاب نظام ہے اور ہر معیشت کی ضرورت ہے، کیوں کہ وسائل کی مؤثر فراہمی کے لیے منڈی ایک مؤثر ادارہ ہے۔ لیکن صرف منڈی کافی نہیں، منڈی کے ساتھ ساتھ ان قوانین اور ان حالات کی بھی ضرورت ہے جن میں منڈی کے نقائص اور ناکامیوں کو سنبھالا جاسکے۔ نیز منڈی چونکہ نفع کی بنیاد پر کام کرتی ہے اور اسی سے متاثر ہوتی ہے، اس لیے بہت سی کم یا غیر نفع بخش خدمات اور کاموں میں وہ کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔ چنانچہ جن میدانوں میں وہ پیداوار نہیں لاسکتی اور یوں کامیاب نہیں ہوسکتی وہاں ریاست کو آنا پڑتا ہے۔ اس طرح ریاست کا ایک اہم اور مثبت کردار ہے۔ یہ محض ایک نظری خیال ہے کہ ہر چیز منڈی پر چھوڑ دیں۔ آج کل کے معاشی ماہرین نے اس کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ منڈی تو درست ہے لیکن منڈی کی بنیاد پرستی، تباہ کن ہے۔ چنانچہ آئی ایم ایف جو آپ کو راستہ دکھا رہا ہے، وہ منڈی کی بنیاد پرستی کا راستہ ہے اور آج یہ خود امریکہ، برطانیہ اور یورپ میں ناکام ہو رہا ہے۔

آپ کو پتا ہے کہ وہاں جو بحران پیدا ہوا ہے[1]، اس بحران میں آج امریکی حکومت بینکوں کو اپنا رہی ہے اور بیمہ کمپنیوں کو ضمانت دے رہی ہے۔ ۷۰۰ بلین ڈالر کا پیکج وہ دے چکے ہیں اور یہ ناکافی ہے۔ برطانیہ نے تقریباً ایک ٹریلین ڈالر، فرانس اور جرمنی نے تقریباً چھ چھ سو بلین ڈالر کے پیکج مالیاتی اداروں کے لیے دیے ہیں۔ دنیا میں حکومتیں یہ کردار ادا کر رہی ہیں اور آپ ہمیں منڈی کی معیشت بتا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت اور ریاست کی شرکت کے بغیر سرمایہ دارانہ نظام خود اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا، ہمارا کیا ہوگا۔ میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ بند آنکھوں کے ساتھ نجکاری کی پالیسی غلط ہے۔ البتہ کچھ مقامات پر نجکاری مناسب بلکہ ضروری ہوتی ہے وہاں ہونی چاہیے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں ریاست ناکام ہے۔ یعنی جو ادارے نقصان میں جا رہے ہیں اور جن کو تزویراتی اعتبار سے اہم قرار نہیں دیا جاتا، وہاں آپ نجکاری کر سکتے ہیں۔

جناب چیئرمین! میرے پاس وہ اعداد و شمار بھی موجود ہیں، جنہیں دیکھ کر آنکھیں کھلتی ہیں کہ جن اداروں کی نجکاری کی گئی ہے انہوں نے ابھی تک ان معاہدوں کی کتنی پاسداری کی ہے جن کے تحت یہ ادارے نجی شعبے کو دیے گئے تھے۔ مزدوروں نے جو تکلیف اٹھائی وہ الگ ہے اور پیداوار میں جو نقصان ہوا وہ الگ ہے۔ نجکاری ہونے والے ایک تہائی اداروں کی صورت یہ ہے کہ وہاں مالکان نے کاروبار کو بند کر کے زمینوں کو بیچ دیا ہے۔ اور زمین بیچ کر جتنے میں اداروں کو خریدا اس سے کئی گنا نفع کما لیا۔ میرے پاس ۲۹ اداروں کی فہرست موجود ہے کہ جن کا معاہدہ تھا کہ وہ بعد میں ادائیگی کریں گے، وہ ادائیگی آج تک نہیں ہوئی ہے اور یہ رقم کروڑوں میں بن جاتی ہے۔

اس سارے ریکارڈ کو سامنے رکھ کر میں کہنا چاہتا ہوں کہ نمبر ایک دفاعی اہمیت کے اداروں کی نجکاری نہ کیجیے۔ وہ سرکاری شعبہ میں رہنے چاہییں البتہ ان کے انتظامی معاملات

---

[1] اشارہ ہے ۲۰۰۸ء کے عالمی مالیاتی بحران کی طرف

پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ چلانے چاہییں۔ بیورو کریسی کا کنڑول یا سیاسی مداخلت غلط ہے لیکن پیشہ ورانہ بنیادوں پر، شفافیت کے ساتھ اور پارلیمانی احتساب کے ساتھ ان اداروں کو رہنا چاہیے۔ دوسری جانب جو ادارے نفع بخش ہیں ان کو نجی شعبے کو نہیں دینا چاہیے۔ ان دونوں بنیادوں پر میری نگاہ میں قادر پور گیس فیلڈ کو نجی شعبے کے حوالے کرنا ایک قومی جرم ہو گا۔ میں دہراتا ہوں، یہ قومی جرم ہے۔ قادر پور گیس فیلڈ کے میرے پاس جو اعداد و شمار موجود ہیں، میں آپ کو بتلاؤں کہ پچھلے سال رائلٹی میں اس گیس فیلڈ نے ۴۰ء۵۷ ملین ڈالرز، ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس میں بالترتیب ۵۹ء۱۰ ملین ڈالر اور ۵۳.۵۲ ملین ڈالر، جبکہ انکم ٹیکس میں ۰۸ء۹۷ ملین ڈالر کا آپ کو فائدہ پہنچایا ہے۔ میں یہ بھی بتادوں کہ پہلے بھی اس ادارہ کے ۲۵ فیصد حصص غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہیں، صرف ۷۵ فیصد ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ اگر انتظامیہ سمیت مزید ۳۷ فیصد حصص آپ نجی شعبے کے حوالے کر دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نفع بخش اور دفاعی طور پر اہم ادارہ آپ کے ہاتھوں سے چلا جائے گا۔

جناب چیئر مین! گیس اور تیل کی تلاش میں ایک بین الاقوامی مافیا شامل ہے۔ گیس اور تیل کی کثیر بین الاقوامی کمپنیاں اپنے مقاصد کے لیے ذخائر تلاش کرتی ہیں اور نفع کما کر چلی جاتی ہیں یہ اس ملک کے مفاد میں نہیں ہوتا جہاں ذخائر دریافت ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بات ضروری ہے کہ گیس اور تیل سرکاری تحویل میں رہے۔ انڈیا میں آج بھی اس شعبہ میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کا زیادہ سے زیادہ تناسب ۲۰ سے ۳۰ فیصد ہے۔ ملائشیا میں ۱۰۰ فیصد ریاست کی ملکیت ہے کیونکہ یہ ایک دفاعی اثاثہ ہے۔ ساتھ ہی میں آپ کو یہ بھی بتلادوں کہ اس وقت ہمارے ملک میں تیل اور گیس صرف دس سے پندرہ دن ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے[1]۔ اگر یہ ادارے غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں تو جب چاہیں وہ آپ کی تیل اور گیس کی فراہمی کو متاثر کرسکتے ہیں جس سے آپ کا دفاع، نقل و حمل اور ہر چیز متاثر ہو سکتی

---

[1] سال ۲۰۱۶ء میں یہ گنجائش معمولی سے اضافہ کے ساتھ ۲۰ دنوں پر آگئی تھی۔ پاکستان کی تیل کی کھپت ۸۶۴ء۴۴۵ بیرل فی دن ہے (سال ۲۰۱۹ء)

ہے۔ یہ ایک بڑا نازک مسئلہ ہے، اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی نجکاری ہر گز نہیں ہونی چاہیے۔

جناب چیئر مین! میری یہی رائے چھوٹی اور درمیانی صنعتوں کے بارے میں ہے اس لیے کہ SME مائیکرو فنانس کا ادارہ ہے اور مائیکرو فنانس نچلی سطح پر کم آمدنی والے چھوٹے کاروباری طبقے کے لیے ہے، اگر آپ اس سطح کے اداروں کی نجکاری کریں گے تو حقیقت یہ ہے کہ یہ سارے کا سارا طبقہ مشکل میں آجائے گا۔ جناب والا! حکومت کو کوئی معاشی پالیسی خوف، بے یقینی، دباؤ اور گھبراہٹ کے تحت نہیں بنانی چاہیے۔ بد قسمتی سے اس وقت یہ چاروں کیفیات آپ پر مسلط ہیں۔ بے یقینی ہے، دباؤ ہے، خوف ہے اور گھبراہٹ ہے، خدا کے لیے اس سے نکلیے اور زمینی حقائق پر مبنی معاشی پالیسی بنائیے۔

خود انحصاری کا راستہ

دوسری بات یہ ہے کہ خود انحصاری ہمارا بنیادی نکتہ ہونا چاہیے۔ بلا شبہ ملک میں غیر ملکی زر مبادلہ کے ذخائر کی حالت اس وقت مخدوش ہے۔ جس وقت اس حکومت نے چارج لیا ہے اس وقت غیر ملکی زر مبادلہ کے ذخائر ۱۲ بلین ڈالرز تھے، گزشتہ سال سترہ بلین ڈالر تک گئے۔ اس وقت ساڑھے چھ بلین ڈالر کی خطرناک حد تک گر گئے ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے لیکن حل کیا ہے؟

خسارہ میں کمی اور زرعی و صنعتی شعبہ میں تحرک: فوری حل یہ ہے کہ آپ اپنا خرچہ کم کیجیے، بجٹ کے خسارہ میں کمی لائیے ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے وسائل سے زیادہ خرچ کر رہے ہیں اور جب تک آپ اسے متوازن نہیں کرتے، آپ اس دلدل سے نہیں نکل سکتے۔ اس ضمن میں اگلی بات یہ ہے کہ درآمدات پر قابو پائیے۔ آپ نے کچھ سطحی اور عارضی کام کیا ہے اس سے بمشکل ایک بلین ڈالر کی بچت ہوگی جبکہ آپ کا تجارتی خسارہ ۲۰ بلین ڈالر سے زیادہ کا

ہے[1]۔ آپ کو سختی سے اس کو چیک کرنا پڑے گا۔ پھر آپ کو شرح سود کو کم کرنا پڑے گا۔ آپ اس کو بڑھا رہے ہیں یہ خود کشی کے مترادف ہے، اسے آپ کو کم کرنا پڑے گا تا کہ صنعتی اور زرعی شعبے میں تحرّک پیدا ہو۔ آپ کو اس کے لیے ترغیب دینی ہوگی اس کے بغیر اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

بیرونی اکاؤنٹس میں پاکستانی سرمایہ: میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے سیاستدان، بیورو کریٹس، جرنیل اور پاکستان کے کاروباری حضرات کے جو غیر قانونی غیر ملکی اکاؤنٹس (کھاتے) ہیں، ان کو گرفت میں لانے کے لیے ہمیں اخلاقی اور قانونی دونوں اقدام کرنے چاہییں۔ جو اعداد و شمار اخبارات میں آئے ہیں اس کی رو سے صرف پنتالیس افراد کے ۲۳ بلین ڈالر ملک سے باہر ہیں، اسے ملک میں واپس لائیے۔ اگر آپ یہ مثال قائم کریں گے کہ ہم اپنا پیسہ باہر سے واپس لا رہے ہیں تو لوگوں میں اعتماد پیدا ہو گا۔ پھر آپ تمام پاکستانیوں سے اپیل کریں کہ وہ بھی ملک کی مدد کریں۔ مدد کرنے والے ان پاکستانیوں کو آپ تحفظ دیں اور آئندہ کے بارے میں قابلِ عمل اسکیمیں لائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے پاس ڈیڑھ سو سے دو سو بلین ڈالر بیرونی کھاتوں میں موجود ہیں، وہ پاکستان میں اپنا پیسہ لائیں گے۔ آپ کو آئی ایم ایف کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے پاس یہ راستہ موجود ہے۔

قرض بمقابلہ معاشی منصوبے: اسی طرح ایک اور راستہ جناب چیئرمین! یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ قرض مانگیں آپ معاشی منصوبے بنائیں، ان کی امکانی رپورٹ تیار کریں اور ان کی تشہیر کریں۔ ان کی بنیاد پر آپ سرمایہ لانے کی کوشش کریں اور سرمایہ آئے گا۔ اس لیے کہ اس وقت امریکہ اور یورپ سے سرمایہ کاری کو متوجہ کرنے کے مواقع موجود ہیں۔ اگر

---

[1] موجودہ (۲۰۲۰ء) کے اعداد کے مطابق تجارتی خسارہ کچھ ماہ میں مثبت ہو گیا تھا لیکن یہ کسی دیرپا پالیسی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ کرونا وبا کی وجہ سے قرضوں کی ادائیگی میں تاخیر، تیل کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی، درآمدات میں کمی (لاک ڈاؤن کی وجہ سے ملکی معیشت رکی ہوئی تھی) اور ترسیلات زر میں اضافہ کی بناء پر تھا۔

آپ کے پاس قابل عمل منصوبے ہوں گے اور آپ ان کی ٹھیک طرح تشہیر کریں گے اور دوسری جانب ملک میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہو گی اور لوگوں کو سرمایہ کاری کی گارنٹی ہو گی تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ آپ کے پاس اتنے وسائل آئیں گے کہ آپ کے لیے ان کو پوری طرح استعمال کرنا بھی مشکل ہو گا۔ تو راستہ یقینی طور پر موجود ہے اگر آپ کے پاس بصیرت ہو اور آپ اسے استعمال کریں۔ آپ کی ٹیم واقعی ماہرین پر مشتمل ہو جسے جامع پالیسی کی بنیاد پر آپ ساتھ لے کر چلیں۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ناجائز دباؤ ڈال کر مجبور کیا گیا ہے۔ آپ کے ۸۰۰ ملین ڈالرز امریکہ پر اُدھا پر ہیں جو مارچ سے اس وقت تک کی خدمات (دہشت گردی کے خلاف جنگ) کے عوض انہوں نے ادا کرنے ہیں وہ انہوں نے نہیں دیے۔ دوسری جانب عالمی بینک نے تین سو ملین ڈالر کا معاہدہ کر لیا تھا اسے طے ہونا اور عملی شکل میں آنا تھا لیکن اسے رکوا دیا گیا۔ اس طرح ا۱ء۱ بلین ڈالر کی مار دے کر آپ کو مجبور کیا جارہا ہے کہ آپ آئی ایم ایف میں آئیں اور آپ فرمارہے ہیں کہ یہ ہم اپنے قومی مفاد میں کر رہے ہیں، اس سے بڑی غلط بیانی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ خدا کے لیے اس راستے نہ پر چلیں، ہمیں جو خطرہ تھا کہ آئی ایم ایف شرح سود بڑھائے گا وہ آج سٹیٹ بینک نے کر دیا۔ اس سے ہمارے خدشات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس راستے کو اختیار نہ کیجیے۔ یہ نقصان دہ راستہ ہے۔ یہ ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ اگر آپ بالغ نظری، آزادی اور خود مختاری کا راستہ اختیار کریں گے تو اپوزیشن آپ کے ساتھ تعاون کرے گی اور کوشش کرے گی کہ ملک میں ایک ایسی معاشی پالیسی بنائی جا سکے جو ایک طرف پیداوار اور اس میں اضافے پر مبنی ہو اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ ایک صاف منصفانہ، خوشحالی کی ضامن اور غریب طبقات کو اوپر اٹھانے کے لائق ہو۔ جناب والا! یہ ہے ترقی کا راستہ۔

(۱۲ نومبر ۲۰۰۸ء)

معاشی صورت حال اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بوجھ

۲۰۰۱ء میں امریکہ کی قیادت میں کی جانے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس وقت کی پاکستانی حکومت نے تعاون کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کے نظریاتی اور سیاسی ہی نہیں اقتصادی، سماجی اور سلامتی کے نقطہ نظر سے بھی بہت سے غیر معمولی منفی اثرات کا قوم کو سامنا کرنا پڑا۔ ان حوالوں سے پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ تقاریر پر مبنی دو جلدیں "دہشت گردی کے خلاف جنگ: پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر تحریر ان کی ایک ایسی تقریر پر مبنی ہے جس میں ملک کی معاشی صورت حال پر بحث کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران ملک پر پڑنے والے معاشی بوجھ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

جناب چیئر مین! پوزیشن یہ ہے کہ کم از کم پچھلے آٹھ مہینے میں جسے آپ موجودہ میزانیہ سیشن کے دوٹرم کہہ سکتے ہیں، افراط زر میں برابر اور غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ مجلس قائمہ برائے خزانہ کے سامنے ۲۷ جنوری کو میٹنگ میں وزیر خزانہ نے جو تازہ اعداد و شمار پیش کیے ہیں، وہ غور کرنے کے لائق ہیں۔ ماہ بہ ماہ افراط زر کی صورتحال یہ ہے کہ جولائی اور اگست ۲۰۰۹ء جو اس کے پہلے دو ماہ ہیں ان میں افراط زر ۵ء۰ اور ۳ء۰ فیصد ہے۔ ستمبر میں یہ بڑھنا شروع ہوتا ہے ۷ء۰، جناب چیئر مین! ایک بڑی چھلانگ کے بعد اکتوبر میں ۸ء۳، نومبر میں ۵ء۱۲ اور دسمبر میں ۱۵ فیصد ہو جاتا ہے۔ پھر اگر اس افراط زر کے مرکزی اجزاء کو

دیکھیں تو اس میں اشیائے خوراک اور حساس اشیاء کا حصہ نمایاں طور پر زیادہ ہے[1]۔ اس لیے غریب طبقہ پر اس کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہے اور ظاہر ہے سب سے کم اثر امراء پر پڑا ہے۔ جناب چیئرمین! اس پس منظر میں آپ مجھے یہ بات کہنے کی اجازت دیں کہ جرم، دہشت گردی، انتقام، خون خرابہ، لوٹ مار اور چوری چکاری کے جو واقعات ہم دن بدن بڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ان میں بھی بڑھتی ہوئی مہنگائی کا دخل ہے۔

جناب والا! ان اعداد و شمار کے بارے میں مجھے تحفظات رہے ہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی اور اعداد و شمار نہیں ہیں، اگر ہم پرانے دور کے اعداد و شمار کو مانیں تو شوکت عزیز صاحب کا دعویٰ یہ تھا کہ ۲۰۰۶ء میں غربت ۳۱ فیصد سے کم ہو کر ۲۲ فیصد یا ۲۰ فیصد رہ گئی ہے لیکن اب تقریباً تمام سروے اور خاص طور پر ایشیائی ترقیاتی بینک اور عالمی بینک کے سروے، جو نسبتاً زیادہ معروضی کہے جا سکتے ہیں، ظاہر کر رہے ہیں کہ اس وقت غربت کی سطح ۴۰ فیصد ہے اور اگر آپ ۲ ڈالر یومیہ آمدنی کو غربت کو شمار کریں تو غربت کی سطح ۷۰ فیصد سے اوپر ہے۔ آپ اس صورتحال کا اندازہ کیجیے کہ ملک میں ایک لاوا پک رہا ہے، غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو رہا ہے۔ جناب چیئرمین! ہمارے یہاں اس وقت بڑھتے ہوئے تفاوت کی میں صرف ایک مثال دوں گا۔

ایک ڈالر آمدنی والے کا معنی یہ ہے کہ اس کی یومیہ آمدنی ۸۴ سے ۸۵ روپے ہے، اگر دو ڈالر یومیہ آمدنی مان لی جائے تو ۱۷۰ روپے ہے۔ دوسری جانب اگر آپ بجٹ دستاویز کو دیکھیں تو پچھلے سال وزیر اعظم اور ان کے وزراء کے جو بیرونی ممالک دورے ہوئے ہیں، ان پر یومیہ ۳ لاکھ روپے خرچ ہوا ہے۔ اگر آپ اس میں صدر محترم کے دوروں کو شامل کر لیں تو یہ یومیہ خرچ ۳ لاکھ سے بڑھ کر ۵ لاکھ روپے ہو جاتا ہے۔ آپ اس تضاد کے اثرات سے کیسے

---

[1] حالیہ (۲۱-۲۰۲۰ء) کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو اشیائے خوراک اور حساس اشیاء میں ہی زیادہ افراطِ زر دیکھا گیا ہے۔ دسمبر ۲۰۲۰ء کے اعداد کے مطابق عمومی مہنگائی کی شرح ۸ فیصد رہی اور Sensitive Price Index ۱۹ء۹ فیصد رہا۔

بچ سکتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ تفاوت جاری رہتا ہے تو خدانخواستہ، لاقانونیت، لوٹ مار، انتقام اور خون خرابا بڑھے گا۔ اس لیے براہ مہربانی اس کی فوری فکر کیجیے۔

جناب والا! دو سال میں، بجلی، گیس اور پٹرول کی قیمتوں میں ۲۰ فیصد سے لے کر ۵۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے[1] جبکہ اس زمانے میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمتیں بڑھی نہیں ہیں کم ہوئی ہیں[2]۔ سپریم کورٹ کی کمیٹی نے جو رپورٹ تیار کی ہے، اس میں آپ دیکھیے کہ قیمتوں میں اس اضافے کی بناء پر حکومت صرف تیل کی مد میں تقریباً ۱۸۰ ارب روپے سالانہ کما رہی ہے[3]۔ جبکہ تیل کی قیمتیں بڑھنے کی وجہ سے ٹرانسپورٹ کی قیمت، بجلی کی قیمت، مشین پر اشیاء کی تیاری کی قیمت، ٹیوب ویل کی لاگت غرض ہر چیز میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک دھماکہ خیز صورتحال ہے اور اس میں حکومت کی مالیاتی پالیسی کے اثرات بھی شامل ہیں۔

جناب والا! مالیاتی پالیسی کے بارے میں صرف دو باتیں میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس حکومت نے بینکنگ اور دیگر شعبوں سے قرضہ لیا ہے اور دوسری جانب بڑی مقدار میں بیرونی قرضے بھی لیے گئے ہیں۔ ان قرضوں کے نتیجہ میں گردش زر بڑھتا ہے اور گردش زر بڑھنے کی وجہ سے افراط زر پیدا ہو رہا ہے۔

دوسری چیز پیداواری لاگت ہے۔ پیداواری لاگت میں بلاشبہ پیداوار کے لیے درکار ضروری اشیاء کی لاگت سب سے اہم چیز ہے۔ چنانچہ اس میں توانائی، گیس، پٹرول، خام مال کی بڑھتی قیمتیں اور پھر روپے کی قدر میں مسلسل کمی کی بناء پر درآمدات کا مہنگا ہو جانا براہ راست

---

[1] آئی ایم ایف کی شرائط کے نیچے دب کر پچھلے ایک سال (سال ۲۰۲۰ء) میں متعدد مرتبہ بجلی کی قیمت کو بڑھایا گیا اور اس وقت (دسمبر ۲۰۲۰ء) میں بجلی کی فی یونٹ قیمت تقریباً ۱۰ روپے ہے اور مزید بڑھنے کا خدشہ ہے۔

[2] سال ۲۰۲۰ء میں کرونا کی وبا کے پھیلنے کی وجہ سے عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں واضح کمی ہوئی لیکن اس کے اثرات ملکی تیل کی قیمتوں پر نہیں ڈالے گئے اور اس وقت (دسمبر ۲۰۲۰ء) میں پٹرول کی فی لیٹر قیمت ۱۰۰ روپے سے زیادہ ہے۔

[3] پٹرولیم لیوی کی مد میں مرکزی حکومت نے سال ۲۱-۲۰۲۰ء کے بجٹ میں ۴۵۰ ارب روپے کا ہدف رکھا ہے اور حالیہ ملکی تیل کی قیمتوں میں اضافہ بھی اسی سبب ہے۔

اثر کا سبب بنتا ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ پر جتنے بھی غیر ملکی قرضے ہیں، ڈالر کی قیمت میں ایک روپے کے فرق سے آپ پر اتنے ہی ارب روپے کا اضافی بوجھ بڑھ جاتا ہے جتنے ارب ڈالر کے آپ مقروض ہیں[1]۔ جناب والا! یہ وہ حالات ہیں جس سے یہ ملک گزر رہا ہے۔

تجارت اور برآمدات مشکلات کا شکار ہیں، کپڑے کی صنعت کے تین سے چار ہزار یونٹس کے بارے میں اطلاعات ہیں کہ وہ بند ہو گئے ہیں یا چھانٹی ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بیروزگاری پیدا ہوتی ہے۔ بیروزگاری ایک دوسرا امر ہے جس کی وجہ سے معاشی ابتری اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔ دوسری جانب ملک میں غیر ملکی سرمایہ کاری برابر کم ہو رہی ہے، بلاشبہ اس میں امن و امان کا مسئلہ بھی ہے لیکن میری نگاہ میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان دو سال میں حکومت کوئی ایک جامع مربوط معاشی پالیسی نہیں دے سکی۔ جناب والا! یہ صورتحال نہایت خطرناک ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جنگی بنیادوں پر منصوبہ بندی کی جائے اور افراطِ زر کے اسباب کا تعین کیا جائے اور معاشی تغیرات کی جو اساسی بنیادیں ہیں ان کے لیے طریقہ کار طے کیا جائے کہ ان کو کس طریقے سے درست کیا جائے گا۔ پالیسی کا تسلسل اور مرکز اور صوبوں کے درمیان تعاون سے اس کا نفاذ اشد ضروری ہے۔

جناب والا! منصوبہ بندی کمیشن کی رپورٹ سے میں دو ایک باتیں اور بھی آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہیں کہ کل ترقیاتی بجٹ تقریباً ۷۰۰ ارب کا تھا، اس میں سرکاری شعبے کا ۴۰۶ تھا، اب اسے کم کر کے ۲۵۰ کر دیا گیا ہے۔ جو کلہاڑی پڑی ہے وہ ترقیاتی بجٹ پر پڑی ہے اور آئندہ اس کے قدرتی طور پر اثرات بہت زیادہ خطرناک ہوں گے[2]۔ دوسری چیز جو اس وقت درست کرنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جو سب سے زیادہ اہمیت کے شعبے

---

[1] سال ۲۰-۲۰۱۹ء میں ڈالر ۱۱۰ روپے سے بڑھ کر ۱۶۰ روپے تک آن پہنچا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان پر بیرونی قرضوں کی مد میں کتنا اضافہ ہو گیا ہو گا۔

[2] بجٹ برائے سال ۲۱-۲۰۲۰ء کے اعداد کے مطابق مرکزی PSDP کا بجٹ محض ۶۵۰ ارب روپے ہے۔

تھے، سب سے زیادہ کٹوتی ان پر ہوئی ہے۔ میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ وزیر اعظم نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ غیر ترقیاتی اخراجات ۳۰ فیصد کم کیے جائیں گے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ وعدہ ایفا نہیں ہوا اور اس کے برعکس پاکستان میں غربت میں کمی کا فنڈ کم ہوا ہے۔ اس غربت میں کمی کے فنڈ میں بجٹ کے اندر سات ارب روپے رکھے گئے تھے لیکن چھ مہینے میں حقیقی طور پر کتنا خرچ ہوا ہے، یہ قابل غور ہے۔ جناب والا! یہ صرف ایک ارب روپے ہے۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام ایک اچھا پروگرام تھا۔ ہم نے اس کا خیر مقدم کیا تھا کہ اس سے لوگوں کو کم از کم فوری مدد ملے گی۔ جناب چیئر مین! ۷۰ بلین روپے اس میں رکھے گئے تھے لیکن پہلے چھ مہینے میں صرف ۱۹ بلین روپے خرچ ہوئے جب کہ ۳۵ بلین روپے خرچ ہونے چاہیے تھے، تو کلہاڑی کہاں گری ہے۔ بیرونی قرضوں کے ضروری اخراجات پر اور اس کے مقابلے میں خرچہ کہاں ہوا ہے۔

امن و امان کے لیے ہنگامی اخراجات پورے سال کے ۱۵۰ ارب روپے تھے لیکن صرف چھ مہینے میں ۱۰۸ ارب روپے خرچ ہو گئے جو دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں حصہ لینے کا نتیجہ ہے۔ یہ ہماری ترجیح ہے۔

اس لیے جناب والا! میں بڑے ادب سے یہ بات عرض کروں گا کہ معاشی صورتحال بڑی گھمبیر اور تشویشناک ہے، لوگوں کا زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔ وہ اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتے ہیں۔ چیزوں کی کمی بھی ہے اور قیمتیں بہت ہی زیادہ ہیں۔ اس پر مستزاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بارے میں آپ کی پالیسی ہے جو معیشت پر ایک اور طرح سے بوجھ ڈال رہی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بوجھ

جناب چیئر مین! آپ اس وقت تک حالات کو نہیں بدل سکتے جب تک کہ آپ کا انحصار ملک کے اپنے وسائل پر نہ ہو اور جس چیز نے آپ کے وسائل پر غیر معمولی بوجھ ڈال

دیا ہے وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے۔ آپ نے اس کے نام پر ملک کو آگ میں جھونک دیا ہے۔ اس جنگ سے باہر آیئے۔ پارلیمنٹ کی قرارداد کی روشنی میں آپ اس پر نظر ثانی کر سکتے ہیں۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان نے گزشتہ نو سال میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بناء پر بے تحاشا نقصان اٹھایا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کی رو سے ۲۰۰۶ء تک یہ ۳۵ ارب ڈالر تھا پھر ۲۰۰۷ء سے ۲۰۰۹ء تک ان تین سال کا آپ مزید شامل کر لیں تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ ۵۰ بلین ڈالر سے زیادہ خرچ ہوا ہے۔[1] جواباً آپ کو ملا کیا؟

اگر ہم امریکیوں کے اعداد و شمار کو درست مان بھی لیں تو آپ کو ۱۲ ارب ڈالر ملے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس غریب ملک اور اس کے عوام نے اپنی بھوک اور افلاس کی صورت میں ان ۹ سالوں میں ۳۸ ارب ڈالر بش اور اوبامہ کی اس جنگ میں اپنی کمائی سے لگائے ہیں۔ آپ کو اس کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ عالم یہ ہے کہ نو سال ہو گئے ہیں اور آج تک خدمات کا جو معاوضہ امریکہ آپ کو دیتا ہے، اس کے ۲ ارب ڈالر اس کی جانب بچے ہوئے ہیں اور دلیل کیا ہے کہ حسابات میں افہام و تفہیم نہیں ہو پا رہا۔ یہ کمپیوٹر کا دور ہے، حساب ایک منٹ میں ہو جاتا ہے۔ یہ آپ کی بدنیتی، نا اہلی اور کرپشن ہے لیکن عوام اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بھی دہشت گردی پیدا ہوئی اور اس کا سدِّباب ہمارا فرض ہے لیکن خدا کے لیے اس پورے معاملے میں آپ اپنے فیصلوں کا جائزہ لیں کہ آپ نے کہاں کہاں غلطیاں کی ہیں۔

میں آپ کو یاد دلاؤں کہ ۱۹۹۱ء کی عراق کویت جنگ کے موقع پر جب بش سینئر صدارت پر فائز تھا تو مصر نے صرف راہداری دینے کے لیے بیس ارب ڈالر کے قرضے معاف

[1] ۲۰۱۷-۱۸ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق، ۱۷ سالوں میں پاکستان نے تقریباً ۱۲۶٫۷۹ بلین ڈالر کا نقصان دہشت گردی کے خلاف جنگ سے اٹھایا ہے۔

کروائے۔ ترکی کو ۲۰۰۳ء میں عراق کی جنگ کے موقع پر صرف راہداری کے لیے ۳۵ ارب ڈالر امریکہ نے پیش کیے، آپ کے ہاں سے ۵۰۰ ٹرک ہر ہفتہ جارہا ہے، راہداری تو دور کی بات ہے آپ اس کا بھی پورا پورا خرچ وصول نہیں کر رہے ہیں اور تازہ ترین رپورٹیں یہ ہیں کہ ان ٹرکوں کو اسلحہ کی سمگلنگ اور حتّٰی کہ بھارتی مال کو سپلائی کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ جناب والا! آپ کو بنیادی پالیسی میں نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ اس موقع پر میں آپ کے علم میں ایک چیز لانا چاہتا ہوں۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے اس کو پڑھ کر بے حد دکھ ہوا لیکن مجھے افسوس ہے کہ حکومت نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

جناب چیئرمین! اس پیر یعنی ۱۵ فروری [۲۰۱۰ء] کو امریکہ کی سفیر نے نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں پاکستانی فوج کے جوانوں کو خطاب کیا ہے اور اس خطاب میں ملک کی معیشت کو موضوع بنایا۔ مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کو ان کی تقریر کا اقتباس پڑھ کر سناؤں:

> Ambassador Anne. W. Patterson on Monday took a swipe at the Government of Prime Minister Yousaf Raza Gillani for lacking urgency in dealing with the pressing requirements of economic development.

جناب والا! ان کے اگلے الفاظ بھی میں پڑھتا ہوں:

> The Prime Minister announced earlier this week that Pakistan will begin to redress this matter (economic problems) next year, but this is a matter of great national urgency.

محترمہ ہمیں بتارہی ہیں کہ آپ کے وزیر اعظم صاحب معاملات کو اگلے سال درست کرنا چاہتے ہیں جب کہ یہ ہنگامی مسئلہ ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے اور یہ بڑا اہم نکتہ ہے:

> While pointing the finger at the government's failure to address the urgent problems, the US diplomat also drew attention of the armed forces to the economic issues. I quote, "as professionals interested in the security of this nation, I hope you(یعنی آرمی آفیسر), would

look closely at this matter", she told the officers, describing them as the future leaders of Pakistan's Army.

یعنی ادھر حکومت میں اور عدلیہ میں ایک ہیجانی کیفیت ہے، ملک میں افراتفری کی حالت پیدا ہو رہی ہے اور وہ فوج کے افسروں کو مخاطب کر کے آرمی کی مستقبل کی قیادت سے یہ فرمارہی ہیں کہ 'مجھے امید ہے کہ پاکستان کی سلامتی میں دلچسپی رکھنے والے پیشہ ور ذمہ دار کی حیثیت سے آپ ان معاملات پر توجہ دیں گے'۔

انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ پاکستان کا GDP جو ہے وہ صرف دو فیصد بڑھا ہے اور پھر یہ بھی انہوں نے فرمایا کہ:

The ultimate solution to Pakistan's current and future economic challenges does not reside with the US or with the international donor agencies, it rests with you, the people of Pakistan.

اور انہوں نے صاف کہا کہ:

American tax payers will not forever pay for Pakistan's economic and social development.

یہ کھلی تنبیہ ہے اور اگر یہ بھی ہماری آنکھیں نہیں کھولتی تو مجھے پتا نہیں کہ ہمیں کیسے تازیانے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ہم ایک شدید بحران کی گرفت میں ہیں اور غفلت کا یہ حال ہے کہ معاشی پالیسی کا بنیادی جائزہ آج تک نہیں ہوا۔ عوام کی مشکلات کو حل کرنے کی کوئی مؤثر کوشش نہیں ہورہی ہے۔ صوبوں کے مطالبات کے حوالہ سے قومی مالیاتی ایوارڈ بلاشبہ ایک اچھی چیز ہے، ہم نے اس کا خیر مقدم کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب تک سطح پر موجود مسائل حل نہیں ہوں گے، پیداوار نہیں بڑھے گی، پانی کی فراہمی نہیں ہو گی اور زراعت

کے لیے ضروری اشیاء نہیں ہوں گی، صحیح نگراں پالیسی نہیں ہو گی اور جب تک ٹیکس کی وصولی نہیں ہوتی، معاملات بہتر نہیں ہو سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ بہت سے طبقے ایسے ہیں جنہیں ٹیکس سے استثنیٰ حاصل ہے، ان کو ٹیکس نیٹ میں لائیے لیکن جو ٹیکس نیٹ میں موجود ہیں ان ہی سے اگر آپ ٹھیک طریقے سے وصول کر لیں تو معاملات بہتر ہو سکتے ہیں۔ خود انحصاری ہمارا راستہ ہے۔ جو امداد آپ لے کر جس طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں وہ مسائل کا حل نہیں ہے۔ ماہرین کا اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ جس چیز کو بیرونی امداد کہا جاتا ہے، بمشکل اس کا ۲۰ فیصد امداد لینے والے ملک میں آتا ہے، بقیہ ۸۰ فیصد کا فائدہ امداد دینے والے ملک کو ہوتا ہے۔ بدنامی اور مجبوری آپ کو ملتی ہے اور ہدایت وہ آپ کو دیتے ہیں۔ ان کا عالم یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے ہمارے لوگوں کو ویزا نہیں دیا اس لیے ہم نے آپ کے پیسے روک رکھے ہیں۔ اور ہم میں اتنی بھی ہمت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اگر آپ نے پیسا نہیں دیا ہے تو ہم آپ کی حمایت جاری نہیں رکھتے۔ اگر یہ رویہ آپ اختیار کریں تو دیکھیے حالات کیسے بدلتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ دہشت گردی کی جنگ کے حوالہ سے بیلنس شیٹ بنائیے اور اس بیلنس شیٹ میں جو نقصان کا سودا ہے، اسے چھوڑ دیجیے۔ ایک لمحے کے لیے سیاسی پریشانیاں اور نظریاتی پریشانیاں چھوڑ کر خالص مالیاتی اور معاشی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس ملک نے امریکی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ۳۸ ارب ڈالر کا خرچ کیا ہے۔ اس کا کیا ہوا ہے اور اس کی قیمت عام شہری کیوں ادا کر رہا ہے۔

جناب والا! قیمتوں میں اضافہ ایک کلیدی مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس سے باقی سارے معاملات یعنی منصوبہ بندی، معاشی پالیسی، غربت میں کمی کی آپ کی تمام کوششیں حتیٰ کہ بنیادی ڈھانچے کی تشکیل تک متاثر ہو رہی ہے۔ ایک جامع معاشی پالیسی جو حقیقی خود انحصاری کی بنیاد پر ہو اور جس میں عوام کے مسائل اور مشکلات اور ان کی ضرورتیں اصل اہمیت کی حامل ہوں، ہماری ضرورت ہے۔ جب تک کہ ہم پالیسی کا یہ رخ نہیں بدلتے،

دولت کی تقسیم کو مساویانہ اور منصفانہ نہیں کرتے تاکہ دولت مند طبقے سے دولت آئے اور غریبوں تک پہنچے، ہمارے حالات بہتر نہ ہوں گے۔

جناب والا! میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے پر آئے تھے اور اس طرح انہوں نے بائیں بازو کے منصوبے کو متعارف کیا تھا۔ آپ کی پارٹی آج تک اس پر زبانی جمع خرچ کرتی ہے لیکن آپ کا عمل کیا ہے؟ آپ کا عمل یہ ہے کہ خالص سرمایہ دارانہ نظام، امریکہ کے مفادات اور ملک کے اندر مفاد پرستوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے معاملات چل رہے ہیں۔ میں نہیں کہنا چاہتا لیکن شوگر مافیا، لینڈ مافیا، ڈرگ مافیا کون سی مافیا ہے جو آپ کے اردگرد نہیں ہے۔ ابھی آپ کے سامنے وزیر موصوف نے ارشاد فرمایا کہ صاف پانی کا مسئلہ تھا لیکن اس حوالہ سے تینوں صوبوں (پنجاب، سرحد، سندھ) کے اندر جھوٹی ضمانتیں بینکوں نے دیں۔ کس کی طرف سے دیں؟ بڑی بڑی کمپنیوں کے لیے دیں۔ ۱۶ ارب روپیہ آپ نے اس پر لگایا اور اس کا فائدہ ۱۶۰۰ لوگوں کو بھی نہیں ملا۔ یہ قومی دولت آخر ہم کہاں خرچ کر رہے ہیں۔

جناب چیئرمین! اس کے لیے آپ اور یہ ایوان پسند کرے تو سینیٹ پیش رفت کرے۔ آپ ایک خصوصی کمیٹی بنائیں جو پورے مسئلے کا جائزہ لے کر اس کے اسباب کو متعین کر کے، ان ترجیحات کا تعین کرے جن کو آئندہ بجٹ میں شامل کرنا چاہیے اور جن پر آئندہ ترقیاتی منصوبہ بننا چاہیے۔ جناب چیئرمین! میں یہ چاہتا ہوں کہ سینیٹ اس معاملے میں ایک مثبت حصہ ڈالے تاکہ ہم قوم کو بتا سکیں کہ ہم یہاں محض وقت ضائع نہیں کر رہے بلکہ ان کے مسائل کا فہم اور ان کا حل ہمارے لیے اصل اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱۸ فروری ۲۰۱۰ء)

پاکستانی معیشت کے مسائل اور ٹیکسوں کا نظام

معیشت میں ٹیکس کے نظام کو ایک نہایت اہم اور مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ٹیکس کا ایسا ڈھانچہ، جو فوری اور طویل المیعاد ترجیحات کی روشنی میں پیداواری سرگرمیوں کے لیے فضا کو سازگار بنائے اور دوسری جانب معاشرے میں سماجی رویوں اور صرفی رجحانات کو بھی متوازن رکھے، معیشت کو پائیدار بنیادوں پر استوار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ زیر نظر تحریر میں پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ میں کی گئی تین تقاریر مرتب کر کے شامل کی گئی ہیں جو ٹیکسوں کے نظام سے بحث کرتی ہیں۔

جناب چیئر مین! ایک اچھی حکومت کی تعریف یہ ہے کہ وہ ٹیکس امیر طبقات اور تعیشات پر لگائے اور عام آدمی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ٹیکسوں میں چھوٹ دے۔ دوسری جانب وہ حکومت خیال رکھتی ہے کہ ٹیکس کا ڈھانچہ ایسا ہو جو پیداواری سرگرمیوں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہو اور کھلے اسراف کے لیے حوصلہ شکنی کا سبب بنے۔ ٹیکس نظام کے حوالہ سے یہ بنیادی اصول ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں آپ یہ دیکھیے کہ توانائی اور اسی طرح زراعت کے حوالہ سے ٹیکس ہونے یا نہ ہونے کی کیا اہمیت ہے۔

موجودہ نظام: استحصالی معیشت کی علامت: جناب چیئر مین! اشیائے صرف کی پیداوار اور نقل و حمل کے لیے ضروری ہے کہ یہ سستے رکھے جائیں تاکہ اس کا فائدہ ایک طرف عام آدمی کو پہنچے لیکن ساتھ ہی معیشت میں ترقی کا جو عمل ہے وہ بھی درست سمت میں رہے۔ اسی کے نتیجے کے طور پر پیداوار میں اضافہ اور فراوانی ہوتی ہے جو برآمدات میں اضافے اور بین الاقوامی منڈیوں میں مسابقت کے قابل بناتی ہے۔ تاہم ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نے

امیروں کی معیشت بنائی جس میں ٹیکس کا ڈھانچہ امیروں کو تحفظ دیتا ہے اور ٹیکس چوری کے لیے دروازے کھولتا ہے۔ اس میں ٹیکس سے بچنے کے لیے خود کار نظام اور مواقع موجود ہیں اور اس کے برعکس عوام کا خون چوسا جاتا ہے۔ توانائی اور زراعت کے لیے ضروری اشیاء جن میں پٹرول، ڈیزل، مٹی کا تیل اور گیس، بجلی وغیرہ شامل ہیں مہنگی کی جاتی ہیں۔ یہ استحصالی معیشت ہے۔

جناب والا! اس وقت ملک میں جائیداد کا کاروبار اور اسٹاک ایکسچینج یہ دونوں امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنانے کے بڑے اہم ذرائع بن گئے ہیں۔ آپ اگر اسٹیٹ بینک کی تازہ رپورٹ میں بینک کے کھاتوں کی تفصیل دیکھیں تو آپ یہ پائیں گے کہ ۱۹۹۹ء میں ملک بھر میں کھاتہ داروں کی مکمل تعداد آبادی کا ۱۵ فیصد تھی۔ اس کے معنی ہیں کہ اس وقت ہماری ۸۵ فیصد آبادی اس لائق نہیں تھی کہ بینک میں حساب کھول سکے لیکن اگر اب جون ۲۰۰۶ء کی تصویر دیکھیں، یہ کھاتہ اس وقت کے ۲۹ سے اور کم ہو کر ۲۳ ملین رہ گئے ہیں۔ یہ کمی کیوں ہو رہی ہے؟ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک نمایاں وجہ اس سے معلوم ہوتی ہے کہ کھاتوں داروں میں کمی اب ان افراد کی ہو رہی ہے جن کی بینکوں میں رقوم دس ہزار روپے یا اس سے کم ہیں۔ اس کے برعکس ایک کروڑ یا اس سے زیادہ رقوم رکھنے والوں کی تعداد میں اور بینکاری کے شعبہ میں، ان کی جمع شدہ رقوم کے حجم میں بھی تین، چار، پانچ، چھ گنا ہر کیٹگری کے اندر اضافہ ہوا ہے۔ جناب والا! اگر آپ فی الحقیقت ایک فلاحی، اسلامی معاشرہ بنانا چاہتے ہیں تو مالیاتی پالیسی کے بنیادی اصولوں پر عمل کریں۔ پیداوار پر ٹیکس نہ لگائیں اور مصارف زندگی بڑھانے والی چیزوں کو ٹیکس نہ کریں۔

جناب والا! اس وقت سچی بات یہ ہے کہ عالمگیریت کے حوالے سے پاکستان بڑے سخت بحران کا شکار ہے۔، ہمارا پیداواری شعبہ برابر سکڑ رہا ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ محض خدمتی شعبہ اور بینکاری شعبہ کے بڑھ جانے سے معیشت مستحکم اور آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور پیداواری شعبے کو جس کی بنیاد پر آپ کی برآمدات بڑھ سکتی ہیں،

اہمیت دیجیے۔ دوسری جانب ان افراد کو ٹیکس کیجیے جو سود خور ہیں اور روز بروز امیر تر ہو رہے ہیں۔ آپ ہندوستان کی مثالیں دیتے ہیں، میں وہاں کا وکیل نہیں ہوں لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ وہاں کیپٹل گین ٹیکس آج نہیں ۲۰ سال سے لگا ہوا ہے۔ سینیٹ کی کمیٹی میں متفقہ طور پر ہم نے تجویز کیا تھا جس کی سرکاری ارکان نے بھی تائید کی تھی کہ کیپٹل گین ٹیکس لگاؤ[1]۔ ہم نے جو شرح دی تھی، آپ نے اس کو لگانے کی کوشش بھی کی لیکن بااثر طبقات کی جانب سے ذرا سا دباؤ پڑنے پر آپ پیچھے ہٹ گئے۔ جناب والا! یہ رویہ بدلنا پڑے گا۔

تیل کی قیمتیں اور ان پر عائد ٹیکس: جناب والا! دوسری بات تیل کی قیمتوں اور ان پر عائد ٹیکسوں سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم نے تیل کو بین الاقوامی قیمتوں سے جوڑا ہوا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، ہم نے قیمتوں میں ہر سطح پر اندھا دھند اضافہ کیا ہے لیکن اگر بحث کی خاطر، میں مان لوں تو جس وقت تیل کی قیمت ۳۴-۳۵ ڈالر فی بیرل تھی، آپ نے اس وقت جو قیمت مقرر کی تھی، اسے آج کی قیمت سے موازنہ کر لیجیے۔ حقائق بالکل سامنے ہیں یعنی آپ قیمت بڑھاتے چلے گئے ہیں۔ لیکن اب جب پچھلے تین مہینوں میں پٹرولیم کی بین الاقوامی قیمت میں ۳۰ فیصد کمی ہوئی ہے تو آپ نے اپنے یہاں صرف ۵ فیصد کمی کی ہے۔ دوسری جانب ڈیزل کا معاملہ ہے جو اور بھی زیادہ اہم ہے۔ پٹرول تو پھر بھی متوسط طبقہ اور دوسرے طبقات استعمال کرتے ہیں، ڈیزل تو آپ کی روڈ ٹرانسپورٹ اور زرعی ٹیوب ویلوں، زرعی مشینری اور بجلی بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر بحیثیت مجموعی ملک میں تیل اور ڈیزل کے استعمال کا تناسب دیکھیں تو ڈیزل کا استعمال پٹرول کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ ہے۔ لیکن قیمتوں کا تعین کرتے ہوئے آپ نے ڈیزل کی قیمت میں محض ایک روپیہ کم کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں سب سے زیادہ کمی کی ضرورت تھی، آپ نے وہاں ہی سب

---

[1] کیپٹل گین ٹیکس (Capital Gain Tax) سرمایہ کاری سے ہونے والے اس منافع پر لگایا جاتا ہے جو اثاثہ جات کو بیچ کر حاصل کیا گیا ہو۔ پاکستان میں منقولہ اثاثہ جات پر یہ ۱۵ فیصد اور غیر منقولہ پر ۱۰ فیصد تک ہے۔

سے کم کیا ہے، یہ ناانصافی ہے، اسے کسی حیثیت سے برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔

جناب والا! اس سے جڑا مسئلہ یہ ہے کہ حکومت نے پٹرولیم اور پٹرولیم صنوعات پر ٹیکس لگائے ہیں اور ہر قسم پر لگائے ہیں۔ یہ صریحی طور پر ایک ظالمانہ اقدام ہے، اس کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ جب اس پر بات کی جائے تو حکومت کہتی ہے کہ ہم نے زر تلافی دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جو زر تلافی دیا ہے وہ ایک مذاق ہے۔ یہ اسی نوعیت کی چیز ہے کہ کسی تاجر نے اپنا حال بتاتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا کہ ۵۰ فیصدی نقصان ہوگیا ہے، تفصیل پوچھی تو بولے کہ ۱۰۰ فیصدی نفع ہونا تھا لیکن وہ کم ہوکر ۵۰ فیصد رہ گیا ہے۔ یہ اسی قسم کی زر تلافی ہے۔

جناب والا! پٹرولیم مصنوعات کے معاملہ میں زر تلافی کا کوئی معنی خیز تصور نہیں ہے۔ البتہ اس حوالہ سے معیشت میں استحکامی فنڈ کا تصور موجود ہے۔ خصوصیت سے جب بین الاقوامی قیمتوں میں تغیر ہو تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے استحکامی فنڈ بنایا جاتا ہے تاکہ جب قیمتیں کم ہوں تو اس وقت جو قیمتیں آپ لے رہے ہیں اس میں سے اضافی رقوم اس فنڈ میں منتقل کر دی جائیں اور جب بین الاقوامی قیمتیں بڑھ جائیں تو اس وقت آپ اس اضافی بوجھ کو اس فنڈ سے پورا کر لیں۔ ہمارے ہاں یہ تصور موجود نہیں ہے بلکہ پٹرول کی قیمتوں میں کمی کو کھلے طور پر حکومتی اور کاروباری اداروں کی آمدنی میں اضافے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے جو غلط ہے۔ (۲۴ جنوری ۲۰۰۷ء)

اضافی مالیاتی بلوں کے ذریعہ اضافی ٹیکس: جناب چیئرمین! مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے اس ایوان میں مالیاتی بل کے اس مسئلے کو سب سے پہلے ۱۹۸۹ء میں اٹھایا تھا کہ حکومت جب چاہے اضافی مالیاتی بل لاکر ٹیکسوں کے پوری اسکیم کو تبدیل کر دیتی ہے۔ میاں رضا ربانی نے ایوان میں جس رولنگ کا ذکر کیا وہ اسی پس منظر میں دی گئی تھی۔ بلاشبہ ہم اب تک حکومتی رویہ تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے اور دباؤ بڑھانا چاہیے، حتّٰی کہ یہ کام ہو سکے ہم یہ اس لیے ضروری

سمجھتے ہیں کہ:

۱۔ یہ ایک غیر آئینی عمل ہے۔ مالیاتی بل ایک متعین بل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نتیجے میں ایک بار پورے سال کے لیے محصولات کے ذریعہ حکومتی آمدنی کے ذرائع کا تعین کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی ٹیکس، کسی لیوی یا کسی اور ایسے سرچارج کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ مختلف اسباب کو بنیاد بنا کر ہر بل کو تبدیل کر دینا اور جہاں چاہیں وہاں پر ترامیم لے آنا، یہ آئین کی روح اور مالیاتی ڈسپلن کے خلاف ہے۔

۲۔ یہ عمل غیر اخلاقی بھی ہے۔ اس لیے کہ اگر حکومت خود قانون کی پاسداری نہیں کرتی بلکہ اپنے مفاد میں قانون کو ہی تبدیل کر دیتی ہے تو یہ صریحاً غیر اخلاقی رویہ ہے، جو باقی سب کے لیے بُری مثال بنتا ہے۔ اس کے بعد اعلیٰ ترین سطح سے لے کر نچلی ترین سطح تک جنھیں بھی موقع ملتا ہے وہ سب یہی کام کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری بات جس کا ذکر تحریک التواء میں بھی آگیا ہے، اس لیے میں اس کو دہراؤں گا نہیں، لیکن اس کا اعادہ ضرور کروں گا وہ یہ ہے کہ یہ بطور ادارہ سینیٹ کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس کے اختیار پر شب خون مارنا اور اسے بائی پاس کرنے کی ایک کوشش ہے۔

یہ تینوں وجوہ ایسی ہیں جن کی بنا پر ضمنی اور اضافی مالیاتی بل نہیں ہونا چاہیے۔ میں پوری دردمندی کے ساتھ قائد ایوان اور حکومت کے نمائندوں سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ ان کے دل ہمارے ساتھ ہیں، کاش ان کی زبانیں بھی ہمارے ساتھ ہو جائیں اور اس معاملے میں وہ ہم سے تعاون کر کے اسے سینیٹ کی متفقہ آواز کے طور پر قومی اسمبلی کے سامنے پہنچائیں۔

بالواسطہ ٹیکس: دوسری بات جناب والا! بالواسطہ ٹیکس میں اضافہ سے متعلق ہے۔ میں کوئی

ٹیکنکل بات نہیں کرنا چاہتا لیکن معاشیات کا ایک قاعدہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے جسے ضربی اثرات(Multiplier effect) کہا جاتا ہے۔یعنی یہ کہ مثلاً آپ نے ایک فیصد ٹیکس بڑھایا ہے تو اشیاء کی قیمتوں پر اس کا اثر ایک فیصد تک محدود نہیں رہے گا بلکہ یہ اضافہ پانچ سے دس فیصد تک ہو گا۔

لوگوں کے استعمال کی عام اشیاء کی قیمتوں میں یہ اضافہ قوم کے لیے ناقابل برداشت ہو گا۔اس لیے اسے نہیں ہونا چاہیے۔دوسری دلیل یہ ہے کہ سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں جو ایک فیصد اضافہ آپ تجویز کر رہے ہیں یہ بالواسطہ ٹیکس ہے۔ہم برابر کہہ رہے ہیں اور ہماری اپنی باقاعدہ متفقہ سفارشات موجود ہیں کہ بالواسطہ ٹیکسوں کو کم از کم کریں اور اگر ضرورت ہے تو براہ راست ٹیکس کو بڑھایا جائے۔کیوں؟اس لیے کہ بالواسطہ ٹیکس غریبوں پر ٹیکس ہے وہ ہر سطح پر اور ہر ایک پر ایک ہی شرح سے ہوتا ہے۔جب کہ براہ راست ٹیکس مختلف طبقات کی ادائیگی کی صلاحیت کی مناسبت سے لگایا جاتا ہے۔چنانچہ دونوں اعتبار سے بالواسطہ ٹیکسوں یعنی سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں ایک فیصد کا اضافہ نا قابل قبول ہے۔ درحقیقت معیشت کے اعتبار سے یہ بہت ہی غیر پیداواری اور دھماکہ خیز تجویز ہے اور انصاف کے اعتبار سے ناقابل قبول ہے۔میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ خود آپ لوگوں کے لیے سیاسی اور معاشی، ہر اعتبار سے یہ نقصان دہ فیصلہ ہے بلکہ میں کہوں گا کہ پیپلز پارٹی اور مخلوط حکومت کے لیے ایک بڑا مہنگا سودا ہو گا،اس لیے براہ کرم اس پر دوبارہ غور کریں۔

آپ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہمیں پیسہ چاہیے اور سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں اس ایک فیصد اضافہ سے تقریباً چوبیس پچیس بلین روپے کی آمدنی ہو گی۔آپ کی یہ بات صحیح ہے۔لیکن میں کہتا ہوں کہ ان پچیس بلین روپوں کے لیے ایک عام شہری کے منہ سے کھانے کا نوالہ چھین لینا، اخلاقی، سیاسی، معاشی، ہر اعتبار سے غلط اقدام ہو گا۔اس کے برعکس اتنی رقم بلکہ اس سے کہیں زیادہ رقم متبادل ذرائع سے جمع کی جاسکتی ہے۔مثال کے طور پر ہم نے سی وی ٹی(Capital Value Tax) کے بارے میں تجویز دی ہے کہ ۰۲ء۰ سے بڑھا

کر ۴۰ء۰ فیصد کر دیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر آپ کو ۸ بلین روپے کی فالتو رقوم ملنا چاہیے۔ ہم نے تجویز دی ہے کہ بینکوں کی آمدنی پر ٹیکس میں اضافہ کر دیں۔ بینکوں کی اس وقت آمدنی یا منافع ۱۰۰ بلین روپے کے قریب ہے[1]۔ اگر آپ ان کے منافع پر ٹیکس میں ۳ سے ۴ فیصد اضافہ کرتے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ ۳ سے ۴ بلین اضافی رقوم آپ اس سے حاصل کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہم نے کہا ہے کہ جائیداد کے کاروبار پر کیپٹل گین ٹیکس لگائیے۔ اس سے آپ ۲۶ نہیں، ۳۶ بلین، ۴۶ بلین بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ۵۶ بلین بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

میں اس پس منظر میں نہایت دردمندی کے ساتھ، معاشیات کے طالب علم اور ایک سیاسی کارکن اور اس ایوان کے ایک ممبر اور آپ کے خیر خواہ کی حیثیت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں اضافے کا راستہ اختیار نہ کیجیے۔ دوسرے راستے موجود ہیں۔ میں آپ کی مشکل کو محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے اخراجات اور آمدنی کے فرق کو کم کرنا ہے اور اس کے لیے فی الحال آپ کو ٹیکس بڑھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس مشکل کو حل کرنے کا راستہ بھی درست ہونا چاہیے۔ آپ کو ٹیکس کی وصولی کے نظام کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے، جو رساؤ (Leakages) ہیں ان کو بھی روکنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ضمناً یہ بھی کہہ دوں کہ آپ کے انکم ٹیکس قانون میں میرے علم کی حد تک دو سو (۲۰۰) سے زائد استثنیٰ ہیں۔ ان کی وجہ سے جو با اثر افراد ہیں انہوں نے اپنے آپ کو بچا لیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے اس میں سے ۱۳۲ استثنیٰ واپس کیے ہیں جو اچھی بات ہے لیکن ابھی ۷۰ا باقی ہیں ان کا جائزہ لیجیے اور ان کو بھی واپس لیجیے۔ اس کے نتیجے کے طور پر آپ کی آمدنی بڑھے گی اور عام آدمی کے لیے اس طرح کوئی فرق پیدا نہیں ہو گا۔ جناب والا! ان مضبوط دلائل کی بنیاد پر میں حکومت اور اس کے نمائندوں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ

[1] ۲۰۱۹ء میں یہ منافع بڑھ کر تقریباً ۳۲۶ بلین روپے تک جا پہنچا ہے جو پچھلے سال کی نسبت ۲۷ فیصد زیادہ ہے۔ اور یہ بھی اس وقت جب اس سال وبائی مرض کورونا کی وجہ سے ملکی معیشت میں منفی شرح نمو تھی۔

اپنی تجویز کا جائزہ لیں اور اس پر نظر ثانی کر کے سینیٹ کو اپنا مثبت کردار ادا کرنے کا موقع دیں۔

جناب چیئر مین! آپ اور یہ ایوان گواہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ اپنے ضمیر اور سوچ کے مطابق پوری دیانت سے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کم از کم اس ایوان میں ہمیشہ سے ہماری کوشش رہی ہے اور بڑی کامیاب کوشش رہی ہے کہ ہم مل جل کر چلیں۔ ہم نے زیادہ سے زیادہ اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں اختلاف رہا ہے وہاں ہم نے اختلاف کا احترام کیا ہے۔ میاں رضا ربانی اور کامل علی آغا صاحب دونوں نے اس معاملے میں بڑی فراخ دلی، سمجھداری اور حکمت کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ جہاں میں اس مسئلے پر بہت شدت سے اپنی رائے پر قائم ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں اضافہ ایک دانشمندانہ اقدام نہیں ہے، وہیں میں حکومت اور اس کے نمائندوں کی رائے کا بھی احترام کرتا ہوں۔ ان کی مشکلات کو سمجھتا ہوں اور ان کی مجبوریاں میرے سامنے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ عوام جن مشکلات کا شکار ہیں اس میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی سوچ میں تبدیلی لائیں۔ قائد ایوان کا کھلے دل سے یہ بات کہنا کہ وہ سال کے دوران دولت کے بہاؤ کو دیکھتے ہوئے کوشش کریں گے کہ اس مسئلے پر نظر ثانی کی جاسکے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا اعلان میرے لیے خوش کن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی مضبوط دلیل ہے کہ سینیٹ ایک آواز سے اپنی بات پیش کرتا رہا ہے اور آج بھی پیش کر رہا ہے ہم نے ۷۶ ترامیم مکمل اتفاق رائے سے پیش کی ہیں تو اس لیے میں نہیں چاہوں گا کہ اس اتفاق رائے میں کوئی کمی ہو۔

جناب چیئر مین! میں سینیٹ کی طرف سے یہ کہتا ہوں کہ قومی اسمبلی کو اس پر کھل کر بحث کرنی چاہیے، دلیل دینی چاہیے۔ اگر ہماری کوئی بات صحیح نہیں ہے تو ہم دلائل سننے اور اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن آنکھیں بند کر کے قتل عام کرنا یہ صحیح نہیں ہے۔ دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس وقت یہ سفارشات قومی اسمبلی میں آئیں ہمارے

دونوں سینیٹر فاروق نائیک اور رحمت اللہ کاکڑ، آپ دونوں حضرات سینیٹ کے نمائندے کے طور پر ان تجاویز کا دفاع کریں گے اور انہیں آگے بڑھائیں گے اور اگر مخالف دلائل سامنے آتے ہیں تو انہیں ہمارے پاس لائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے نمائندے کی حیثیت سے اس بحث میں وہاں پر قیادت کریں۔ آپ دیکھیں کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ ان مباحث کے ذریعہ ایک دوسرے کے قریب آئیں اور جو محنت اور مدد سینیٹ نے ان تجاویز کی تیاری میں کی ہے قوم اس سے استفادہ کر سکے۔ (۱۸جون۲۰۰۸ء)

سیلز ٹیکس کی شرح: جناب چیئرمین! یہ بڑا ہی بنیادی مسئلہ ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ براہ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں میں ہمارے ملک میں شدید عدم توازن ہے۔ اس وقت براہ راست ٹیکس صرف ۳۰ فیصد ہیں اور ان کو بھی بڑی حد تک بالواسطہ بنادیا گیا ہے۔ لیکن ۷۰ فیصد حکومتی آمدنی براہ راست ٹیکس سے آرہی ہے۔ یہ نظری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی بڑی قابل اعتراض چیز ہے۔ ترقی پذیر ٹیکس اور مساویانہ ٹیکس کی جو بنیاد ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ہاں براہ راست ٹیکس زیادہ ہوں اور بالواسطہ ٹیکس کم ہوں۔

جو نئے ٹیکس ہیں اس میں اس وقت سیلز ٹیکس ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ یہاں پر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اصل میں سیلز ٹیکس ایک صوبائی مسئلہ تھا۔ شروع کے بجٹ میں یہ صوبوں میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد وفاق نے اسے اپنے دائرہ اختیار میں لے لیا۔ ٹھیک ہے کہ اس تبدیلی کے بعد مجموعی فنڈ سے ایک حصہ صوبوں کو جاتا ہے لیکن آپ نے اس فیصلہ کے ذریعہ صوبوں کو بنیادی مالیاتی اختیار سے محروم کر دیا ہے۔ میری نگاہ میں اصولاً اس کے نتیجے کے طور پر فیڈریشن کی مالیاتی ترقی ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اس بارے میں بھی سوالیہ نشان موجود ہیں۔ دوسری جانب ٹیکس لگانے کے جو اختیار روایتی طور پر صوبوں کے پاس رہے ہیں اگر مرکز خود لے لیتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر صوبے ہمیشہ وفاق کے اوپر انحصار کریں گے۔ یوں اختیارات کی منتقلی کا عمل بھی رُکا رہے گا۔ اختیارات کی حقیقی منتقلی اسی وقت ہو گی جب مالیاتی اختیارات کی منتقلی بھی اس کے ساتھ جڑی ہو، اور وہ مالیاتی اختیارات

کی منتقلی کبھی نہیں ہو سکتی جب تک سیلز ٹیکس کو مرکز اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اب جب آپ نے صوبوں کو اس سے محروم کر دیا ہے تو لگتا ہے کہ صوبے آپ سے وسائل کے لیے بھیک مانگ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ حق ہے۔ اگر آپ سارے مالیاتی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو صوبے کس سے اپنا گزارہ چلائیں گے۔ اس فیصلہ پر فوری نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

غور کرنے کی دوسری بات سیلز ٹیکس کے مقاصد سے متعلق ہے۔ میرے علم کی حد تک دنیا بھر میں جہاں جہاں سیلز ٹیکس کا تجربہ ہوا ہے وہاں اس کے دو مقاصد رہے ہیں۔ ایک مقصد بلاشبہ آمدنی ہے اور میں خود بھی اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ محض آمدنی پیدا کرنے والا ٹیکس نہیں بلکہ یہ ایک بہتر سماجی تنظیم کے حصول کے لیے لگایا جانے والا ٹیکس ہے۔ سیلز ٹیکس ایک ایسا ٹیکس ہے جسے اگر منصفانہ استعمال کیا جائے تو ملک میں جو ضروریات زندگی ہیں ان کو سستا بنایا جاسکتا ہے اور اس طرح عوام کو سہولت دی جاسکتی ہے اور ضروریات کے مقابلہ میں جو آسائشات و تعیشات ہیں یا وہ تمام چیزیں جن کی ہم حوصلہ شکنی کرنا چاہتے ہیں ان کے استعمال کو سیلز ٹیکس کے ذریعے سے مہنگا کر کے حوصلہ شکنی کی جاسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مارکیٹ کے میکنزم کو چلانے کے لیے یہ بڑا اہم آلہ ہے۔ لیکن آپ نے ہر سطح پر ضرورت اور تعیشات، سب پر ایک ہی شرح سے ٹیکس لگا کر اس ٹیکس کے اصل کردار کو ختم کر دیا ہے۔ اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے علم کی حد تک دنیا کے بیشتر ممالک میں مختلف نوع کی اشیاء پر مختلف شرح کے سیلز ٹیکس[1] ہیں اور وہ اسی لیے ہیں کہ اس ٹیکس کو صرف آمدنی نہیں بلکہ سماجی و اقتصادی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شے اور ہر سطح پر ٹیکس ایک ہی شرح پر نہ ہو بلکہ

---

[1] بھارت میں سیلز ٹیکس کی پالیسی ریاستوں کے پاس ہے اور ٹیکس کی شرح اشیاء کے استعمال کے حساب سے طے کی جاتی ہے۔ جبکہ بنگلہ دیش میں یہ ویلیو ایڈڈ ٹیکس کے طور پر پورے ملک میں ۱۵ فیصد کے حساب سے لاگو ہے۔ چین میں بھی اس کی شرح ۱۷ فیصد ہے لیکن کچھ اشیائے ضروریہ پر اس کی شرح ۱۳ فیصد ہے۔ برطانیہ میں یہ زیادہ تفصیل سے لاگو ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ ۲۰ فیصد شرح ہے لیکن بہت سی اشیاء پر صفر یا بہت کم ریٹ لگا ہوا ہے۔ جیسا کہ گھریلو گیس پر ۵ فیصد اور کھانے پینے اور بچوں کے کپڑوں پر صفر ویلیو ایڈڈ ٹیکس لاگو ہے۔

مختلف شرحیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میں انتظامی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن انتظامی مشکلات کی بنا پر اتنا اہم سماجی مقصد جس کا تعلق معاشرے میں انصاف اور لوگوں کی ضروریات سے ہے، نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ سیلز ٹیکس سے ضرورت کی چند چیزوں کو استثنیٰ دیا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں وہ ناکافی ہیں۔ ہزارہا اشیاء جن پر اس وقت یہ ٹیکس لیا جارہا ہے ایسی ہیں جن کو مختلف کیٹیگریز میں تقسیم کرنا اور اس کی مناسبت سے ٹیکس کی شرح مقرر کرنا ضروری ہے۔

سیلز ٹیکس کی شرح: اگلی بات جناب والا! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہر سطح پر سیلز ٹیکس کی شرح ۱۵ فیصد[۱] ہے میرے نزدیک یہ شرح استحصالی اور نہایت غیر منصفانہ ہے۔ میں نے اس بجٹ کا اور دنیا کے دوسرے ممالک کے بجٹوں کا مطالعہ کیا ہے اور میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ جنوبی ایشیاء کے علاقے میں سیلز ٹیکس اوسطاً ۱۱ فیصد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک خاص طرح کے ممالک میں بھی ہمارا ملک نیچے ہے۔ ہم نے در اصل آنکھیں بند کر کے اس ٹیکس کے ذریعے سے امیر اور غریب سب ہی کو ایک لاٹھی سے ہانکا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ غریبوں کو زائد دینا پڑتا ہے۔ جو مطالعے اب تک ہوئے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک روپیہ جس پر آپ نے پندرہ پیسے ٹیکس لگا دیا ہے اس کا جو واقعی اثر لوگوں پر پڑتا ہے وہ غریب طبقوں کے لیے ۵۰ فیصد ہے اور اس کے برعکس امراء کے لیے اسی ایک روپیہ پر پندرہ فیصد کا اثر بمشکل ۵ سے ۱۰ فیصد پڑتا ہے۔ آپ سوچیے کہ آپ اس فرق کو بڑھا رہے ہیں اور ملک کے اندر ظلم اور استحصال کے نظام کو فروغ دے رہے ہیں۔ میں دہرانا چاہوں گا کہ یہ ٹیکس بہت زیادہ آمدنی پیدا کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے سماجی، معاشی اور انصاف کے اعتبار سے مقاصد کا حصول مطلوب ہوتا ہے۔ اس بناء پر اس کی شرح پر تفصیلی نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

---

[۱] پاکستان میں سیلز ٹیکس کی موجودہ شرح ۱۷ فیصد ہے۔

میں تائید کرتا ہوں اس بات کی کہ سیلز ٹیکس کی شرح کم کر کے ۱۲،۵ فیصد کر دیں۔ لیکن میری اصل تجویز یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے ہر شے پر ہر سطح پر ایک اونچی شرح کو محض ٹیکس کرنے کے لیے استعمال کرنا غیر منصفانہ، عوام دشمن اور غریب دشمن اقدام ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ پورے معاملے کو دوبارہ دیکھا جائے اور اب تک کی جو مشاہداتی گواہی ہے اس کو سامنے رکھا جائے، اشیاء کے جو مختلف گروہ ہیں اور جو مختلف ضروریات کے گروپ ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ۸، ۱۰، ۱۲ قسمیں بنائی جائیں کچھ پر ٹیکس شرح زیرو ہو، کچھ پر ڈھائی فیصد، کچھ پر پانچ فیصد، کچھ پر ۷،۵ فیصد اور کچھ پر ۱۰ فیصد۔ میری نگاہ میں اس سے زیادہ شرح کسی شے پر نہیں ہونا چاہیے، الاّ یہ کہ جو تعیشات ہیں ان پر بے شک آپ ۲۵ فیصد سیلز ٹیکس لگا دیجیے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ ان کاروں پر جو محض اس ملک کے امیر استعمال کر رہے ہیں اور اپنی دولت کو ظاہر کرنے لیے یعنی اپنے گھٹیا تصرفات کی نمائش کے لیے استعمال کر رہے ہیں، آپ اس پر ۲۰۰ فیصد ٹیکس بھی لگا دیں تو مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔ اس پورے معاملے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنرل سیلز ٹیکس کے حوالہ سے جو تجویز میرے ساتھیوں کی طرف سے آئی ہے وہ بڑی اہم ہے اور اس ایوان کو اس کی تائید کرنی چاہیے۔

(۱۲ جون ۲۰۰۶ء)

معیشت کی صورت حال اور حکومتی دعوے

(پالیسیوں کی تشکیل میں درست حقائق کی اہمیت)

آنے والے صفحات میں پروفیسر خورشید احمد کی دو تقاریر پیش ہیں۔ نئی صدی کی پہلی دھائی کے دوران سینیٹ آف پاکستان میں کی جانے والی ان تقاریر میں اس وقت کے بجٹ کے تناظر میں معیشت کا جائزہ اور حکومتی پالیسیوں اور دعووں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ فطری طور پر ان میں زیر بحث اعداد و شمار اب کسی قدر پرانے ہیں تاہم ان میں جو تجزیہ اور تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ آج کے حالات سے بھی پوری طرح متعلق نظر آتی ہیں اور یوں معیشت کی اصلاح احوال کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اس سیاق وسباق میں ان تقاریر کی پیشکش میں تاریخی ترتیب کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی تقریر صورت حال کی درست تشخیص پر زور دیتی ہے جب کہ دوسری تقریر (قومی بجٹ اور ملکی معاشی پالیسیاں) میں متعدد اہم تجاویز دی گئی ہیں جو بجٹ سازی کے طریقہ کار اور اس کی پیشکش کے ساتھ ساتھ بہت سے دیگر امور کے بارے میں لائحہ عمل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

میں قائد ایوان (وسیم سجاد) کو اعداد و شمار کے باب میں یہ رخصت تو دے سکتا ہوں کہ وہ ماہر معیشت نہیں ہیں لیکن یہ توقع رکھتا ہوں کہ ایک وکیل کی حیثیت سے انھیں اپنا دعویٰ کرنے سے پہلے اپنے حقائق اور اعداد و شمار کو چیک کر لینا چاہیے تھا۔ میں نہ مسلم لیگ (ن) کا دفاع کر رہا ہوں، نہ مسلم لیگ (ق) کو اس حیثیت سے ہدف تنقید بنا رہا ہوں۔ یہ ان کا خاندانی جھگڑا ہے۔ جس مسلم لیگ پر وہ آج تنقید کر رہے ہیں کل وہ سب اس کا حصہ تھے۔ اس لیے میں خاندانی جھگڑے میں شریک نہیں ہو رہا۔ لیکن حقائق حقائق ہیں اور ان پر پردہ ڈالنے سے انھیں چھپایا نہیں جا سکتا۔

حکومت کا آدھا سچ

جناب والا! وسیم سجاد نے ایک بات کہی کہ ہارنے والا ہمیشہ الیکشن میں دھاندلی کی بات کرتا ہے۔ دیکھیے جب دھاندلی ہو گی تو اس کی بات ضرور کی جائے گی اور دھاندلی کا اعتراف ریفرنڈم میں جیتنے والے کو عوام کے سامنے کرنا پڑا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد دھاندلی کی بات کسی نے نہیں کی تھی۔ البتہ سب جانتے ہیں کہ اس وقت کے حکمرانوں نے ان نتائج کے قانونی تقاضوں کو پورا نہیں کیا اور جو پارٹی جیتی، اس کو اقتدار دینے سے انکار کیا جس سے سارے مسائل پیدا ہوئے۔ اس لیے میرے خیال میں ہمیں ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے۔

اسی طرح سے یہ بات کہ بجٹ چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، پوزیشن والے لازماً اس پر تنقید کرتے ہیں، یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ حکومت والے بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ اپوزیشن حقائق کا سامنے کرنے کو تیار نہیں ہے اور وہ صرف کیڑے نکالنا جانتی ہے۔ جناب والا! میں برملا یہ بات کہتا ہوں کہ اس زمانے میں معاشی اعتبار سے چند مثبت نتائج بھی نکلے ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے۔ لیکن ہم اس بات کے خلاف ہیں کہ آپ آدھا سچ پیش کریں۔ یہ بد دیانتی بھی ہے اور میری نگاہ میں یہ معاشی اعتبار سے پالیسی سازوں کے لیے خودکشی ہے۔ آپ کو حقائق کو حقائق ماننا چاہیے۔

معیشت کی حقیقی صورت حال

شرح نمو اور دیگر اہداف: یہ صحیح ہے کہ قومی دولت میں ۷ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ پہلے تین سال میں یہ اضافہ اوسطاً دو فیصدی تھا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ بعد میں سات فیصدی رہا ہے لیکن ۸ سال کا اوسط تو پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں بڑھا۔ اور اگر آپ موازنہ کریں اس ریجن کا بلکہ ساری دنیا کے سب سے کم آمدنی والے ممالک سے، تو ہم ان سے آگے نہیں پیچھے ہیں تو حقائق کو حقائق کی صورت میں بیان کیجیے۔ پھر یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ

آپ حقائق کو چھپاتے ہیں اور پھر جو جزوی تصویر لاتے ہیں اس کو بھی پروپیگنڈے کے ذریعے پیش کر کے چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کو پوری سچائی کے طور پر مان لیا جائے۔ وزارت خزانہ نے اس بجٹ کے سلسلے میں اخبارات میں جس طرح اشتہار بازی کی ہے، وہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے۔ اس اشتہاری مہم میں حقائق کے ایک بڑے حصہ کو نظر انداز کر کے محض آدھی تصویر دی گئی ہے۔ قومی پیسے کا بھی اس طرح ضیاع کیا گیا ہے کہ ایک ہی اشتہار، اخبار کے ایک ہی صفحے پر دو جگہ موجود ہے۔ اور سارے اخبارات کے اندر موجود ہے۔ جناب والا! فارسی کی مشہور مثل ہے کہ مشک وہ ہے جس کی خوشبو خود آئے۔ مشک کو اخبار کے بیان اور اشتہار کی ضرورت نہیں ہوتی اور جہاں اخبار چیخے چلائے اور مشتہر کرے تو جان لیجیے کہ وہاں مشک نہیں کوئی اور شے ہے۔ در حقیقت اس وقت یہی معاملہ ان کے ساتھ ہے۔

جناب والا! یہ بات صحیح ہے کہ قومی دولت کچھ بڑھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی حقیقت ہے کہ افراط زر میں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ یہ بات کہنا صحیح نہیں ہے کہ جو بات آج قیمتوں میں اضافے کے بارے میں کی جا رہی ہے وہ مبنی بر حقائق نہیں ہے۔ آپ ایکسپورٹ بڑھانے کی بات کر رہے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ تجارتی خسارہ اڑھائی اور تین ارب ڈالر سے بڑھ کر آج بارہ اور تیرہ ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے[1]۔ ادائیگیوں کے توازن کا عدد بھی بڑھ کر آج چھ بلین پر پہنچ گیا ہے۔ جب تک یہ پورے حقائق سامنے نہیں آئیں گے، درست تجزیہ اور فیصلے ممکن نہیں ہیں۔

وزیر مملکت برائے خزانہ نے اپنی تقریر میں ایک بار نہیں چھ بار یہ بات کہی ہے کہ ہم نے جو ہدف دیا تھا اسے پورا کیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے صنعتی پیداوار کا اپنا ہدف بھی پورا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایکسپورٹ اور افراط زر کے معاملہ میں

---

[1] تجارتی خسارہ (Trade deficit) کا یہ رجحان معمولی ردوبدل سے ایسا ہی رہا ہے۔ سال ۲۱-۲۰۲۰ء کی پہلی سہ ماہی (جولائی تا ستمبر ۲۰۲۰ء) میں یہ عدد ۸ء۵ ارب ڈالر رہا جو پچھلے سال کی نسبت بھی ۱ء۰ ارب ڈالر زیادہ ہے۔

ہدف پورا کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ مجھے دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تمام دعوے حقیقت نہیں ہیں۔ آپ بجٹ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ میں آپ کے سامنے ایک فہرست دے رہا ہوں۔ صنعتی پیداوار کا ہدف پچھلے بجٹ میں گیارہ فیصد تھا۔ آپ نے ۶ء۸ فیصد حاصل کیا ہے۔ بڑی صنعتوں کا ہدف ۱۳ فیصد تھا، آپ نے ۸ء۸ فیصد حاصل کیا ہے۔ افراط زر کا ہدف ۶ء۵ فیصد تھا، آپ نے ۷ء۹ فیصد بتایا ہے اور اصل میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ کا برآمدات کا ہدف ۹ء۱۸ بلین ڈالر تھا، آپ نے ۳ء۱۷ بلین ڈالر حاصل کیا ہے[1]۔ تجارتی خسارے کا ہدف ۸ بلین تھا جبکہ حقیقی تجارتی خسارہ ۱۳ بلین ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں دعوے کرنا کہ ہم نے جو اصل ہدف رکھا تھا وہ پورا کر لیا ہے، اس سے بڑا ظلم اور جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔

لیکن میں انہیں ایک اور آئینہ دکھانا چاہتا ہوں۔ میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۲۰۰۴ء میں جناب شوکت عزیز نے وزیر خزانہ کی حیثیت سے جو بجٹ پیش کیا تھا اس میں یہ کہا تھا کہ ہم تسلسل کی بنیاد پر اس سال بہ سال کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم تین سال کے اہداف مقرر کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تین سال کے اہداف ہماری کامیابی یا ناکامی کا معیار ہوں گے۔ جناب والا! میں نے ان دونوں بجٹ کا موازنہ کیا ہے، ان کا دعوی ۲۰۰۴ء میں تھا کہ ۲۰۰۷ء میں جو موجودہ سال ہے افراط زر ۵ فیصد پر آجائے گا۔ لیکن افراط زر خود ان کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ۷ء۹ فیصد ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جی ڈی پی کا خسارہ ۳ فیصد ہو جائے گا، آج ۴ء۲ فیصد ہے۔ ان کا دعویٰ تھا ۲۰۰۷ء میں ترقی ۸ فیصد ہو گی، وہ ۷ فیصد ہے۔ ان کا ارشاد تھا کہ ادائیگیوں کے توازن کا خسارہ ۸ء۱ فیصد ہو گا، وہ حقیقی ۵ فیصد ہے۔ یہ بنیادی اشارے ہیں جن سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو اہداف مقرر کیے گئے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ ٹھیک ہے جتنا آپ نے حاصل کیا ہے ہم اس کا انکار نہیں کرتے لیکن ہم آپ کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ آپ نے جو حاصل نہیں کیا اور جہاں آپ ناکام ہوئے ہیں، اس کو

---

[1] ملکی برآمدات کی نمو میں جمود کا حال اس وقت بھی ایسا ہی ہے۔ چنانچہ آج تقریباً ۱۳ سال گزرنے کے بعد بھی برآمدات میں معمولی سا اضافہ ہی کیا جا سکا۔ سال ۲۰-۲۰۱۹ء (جولائی تا اپریل) میں ۷ء۱۹ ارب ڈالر کی برآمدات ہوئیں۔

چھپا کر آپ یہ کہیں کہ ہم نے دودھ اور شہد کی نہریں بہادی ہیں، یہ دعویٰ غلط ہو گا۔

غربت کے بارے میں حقائق: اس کے بعد جناب والا! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں سب سے اہم مسئلے کی طرف آؤں اور وہ غربت کا مسئلہ ہے۔ وسیم سجاد نے غربت کی لکیر کے حوالہ سے ایک اور دو ڈالر کی بات کی ہے۔ لیکن ہمیں سمجھنا چاہیے کہ غربت کی لکیر متعین کرنے کے حوالہ سے یہ فنی مباحث ہیں، بین الاقوامی طور پر ایک ڈالر یا دو ڈالر یہ حوالے کے نشان ہیں۔ لیکن ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ حرارے (کیلوریز) لینے کا ہے[1] اور اس بنیاد پر غربت کی جو لکیر بنتی ہے وہ تقریباً ساڑھے آٹھ سو روپے ہے۔ چنانچہ موازنہ میں تسلسل ہونا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ غربت میں کمی کے بارے میں جو دعویٰ آپ کر رہے ہیں تطبیقی معاشی سرگرمی اس کی تصدیق کر رہی ہے یا نہیں۔ آپ یہ دیکھیے کہ ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے بارے میں دعویٰ یہ ہے کہ اس وقت غربت ۳۴ فیصد تھی، ۳۴ فیصد کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت آبادی کے پانچ کروڑ افراد غربت کی لکیر سے نیچے تھے۔ ۲۰۰۵ء کے بارے میں آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ پانچ سال میں یہ تعداد کم ہو کر ۲۴ فیصد رہ گئی ہے[2] جس کے معنی یہ ہیں کہ اس عرصے میں ایک کروڑ تیس لاکھ افراد خط غربت کو پار کر کے سہولت کی زندگی میں آئے ہیں۔ تاہم اگر آپ ان ہی برسوں میں روزگار، زرعی پیداوار، صنعتی پیداوار اور فی کس آمدنی میں اضافے کو دیکھیں اور یہ چاروں اشاریے ساتھ رکھ لیں تو کوئی معیشت دان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس فریم ورک کے اندر ایک کروڑ تیس لاکھ افراد افلاس سے نکل کر سہولت کی زندگی میں آسکتے ہیں۔

جناب والا! مجھے اجازت دیں کہ میں اسی سروے کو پیش کروں جس کی بنیاد پر یہ

---

[1] ۲۳۵۰ کیلوریز روزانہ خطِ غربت کا پیمانہ ہے۔

[2] غربت کے اعداد و شمار: پلاننگ کمیشن کے اعداد کے مطابق ۳ء۲۴ فیصد لوگ (۲۸ء۳۲۵۰ روپے ایک بالغ فرد کی ایک ماہ آمدن کے حساب سے) خطِ غربت سے نیچے ہیں۔ یعنی فیصدی عدد میں بظاہر فرق نہیں آیا لیکن آبادی کے بڑھنے سے غریب لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے جو اس وقت تقریباً ۵ کروڑ بنتے ہیں۔ (پاکستان اکنامک سروے ۲۰-۲۰۱۹ء)

دعویٰ کیا جارہا ہے۔ میں نے اس کا گہرائی میں مطالعہ کیا ہے۔ یہ سروے دو جلدوں میں پیش ہوا ہے، پہلی جلد میں جو بات کہی گئی ہے اس کی تصدیق دوسری جلد سے نہیں ہوتی جس میں سارے صوبوں کی تفصیلات ہیں۔ جس سروے کی بنیاد پر سارے دعوے کیے جارہے ہیں اس کی دوسری جلد کا مطالعہ آپ کیجیے تو اس کے اندر چودہ ہزار جواب دہندگان سے یہ سوال کیا گیا۔

"Are you much worse off, or worse off, in the same position, better or much better".

بڑے اہم سوال ہیں اور اس سے ہمیں معلوم ہو گا کہ جو غریب طبقے ہیں وہ کس طرح سوچ رہے ہیں۔ جناب والا! اس سروے کی رو سے ۱۵ء۲۴ فیصد نے کہا کہ ہم بدتر حال میں ہیں یا بہت زیادہ بدتر حال میں ہیں۔ بقیہ نے کہا کہ ہمارا وہی حال یعنی پہلے جیسا ہی حال ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ اس پورے سروے کے اندر لوگوں نے کہا کہ یا ہمارا وہی حال ہے یا ہم پہلے سے زیادہ برے حال میں ہیں۔ یہ سارے کے سارے طبقات نچلے طبقات ہیں۔ آخر ہم غربت کی لکیر سے باہر کیسے نکلے، اس کی آپ کیسے وضاحت کر سکتے ہیں۔

جناب والا! ابھی پچھلے ماہ ایشیائی ترقیاتی بینک کی رپورٹ آئی ہے اور انہوں نے آزادانہ سروے کیا ہے۔ غربت کے بارے میں وہ رپورٹ صاف کہتی ہے:

"Common perception holds that the development programmes including the SAP have not brought about any real qualitative change in the country particularly in rural areas".

ابھی آپ کے سامنے دیہی علاقوں کی فراوانی اور خوشحالی کے بارے میں بڑی شاندار تقریر کی گئی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے جناب والا! کہ زراعت میں، زمینی علاقے میں اور کاشتکاری میں پچھلے دس سالوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ دوسری جانب پانی کی فراہی اور زرعی استعمال کی اشیاء میں کمی ہوئی ہے اور حاصل شدہ پیداوار قدرتی حالات سے تبدیل

ہوئی ہے۔ پورا نقشہ جو پچھلے تیس سال سے تھا اس میں کوئی حقیقی بار آوری نہیں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کیسے یہ بات کہتے ہیں کہ وہاں تو خوشحالی آ گئی۔ میرے پاس زراعت سے متعلق رپورٹ موجود ہے تمام کسان اور آباد کار بتاتے ہیں کہ آپ کی جو امدادی قیمت ہے عام کسان کو نہیں مل رہی ہے۔ کھاد کے اوپر جس زر تلافی کی بات آپ کرتے ہیں وہ زر تلافی درمیان کے لوگ کھا جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کھاد اس قیمت سے کہیں زیادہ ملتی ہے جو عام طور پر موجود ہوتی ہے۔ جناب والا! 'آباد کار' کی یہ رپورٹ ہمارے پاس موجود ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ اس سال دھان کی امدادی قیمت کا اعلان ہی نہیں ہوا ہے۔ تو جناب والا! صورت حال وہ نہیں ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں۔

تقسیم دولت کا مسئلہ: دوسرے مسئلے پر آیئے جناب والا! اور وہ یہ ہے کہ ملک میں دولت کی عدم مساوات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ جس سروے کا ابھی حوالہ دیا گیا ہے ذرا اسی کو نکال کر پڑھ لیں۔ اس سروے کی رو سے ہی دیکھ لیجیے کہ کسی ملک میں دولت کی تقسیم جانچنے کا مؤثر طریقہ کیا ہے؟ اس کی رو سے جو ۲۰ ڈالر سے کم تنخواہ والے یعنی آمدنی کے اعتبار سے نچلے طبقات ہیں اور جو بالائی آمدنی والے گروپ میں شامل بیس فی صد افراد ہیں ان کے درمیان دولت کا تفاوت بڑھا ہے اور بالائی ۲۰ فیصد کو چار سو فیصد کی زیادہ دولت پہنچی ہے۔ وزیر مملکت نے دعویٰ کیا ہے کہ ہمیں بزرگوں نے بتایا تھا کہ امیروں سے لو غریبوں کو دو۔ لیکن جناب والا! یہاں غریبوں سے لیا جاتا ہے اور امیروں کو دیا جاتا ہے۔ بالواسطہ ٹیکس کی بہتات ہے جو دولت کی غریبوں سے امیروں کی طرف منتقلی کا ایک طریقہ ہے۔

جناب والا! ایک دوسرا سروے جو آمدنی کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ۱۰ فیصد اور کم ترین دس فیصد کے بارے میں ہے، اس سے زیادہ ہولناک نتائج ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس سروے کی رو سے اگر قومی آمدنی میں سو روپے بڑھتے ہیں تو جو ۱۰ فیصد غریب طبقہ ہے ان کو اس سو روپے میں سے صرف تین روپے ملتے ہیں اور جو ۱۰ فیصد بالائی طبقہ ان کو ۳۴ روپے ملتے ہیں۔ یعنی ان کے درمیان ۱۱ گنا یا ایک ہزار ایک سو فیصدی کا فرق ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس

سے ملک میں تصادم کی فضا اور نفرتیں پروان چڑھ رہی ہیں اور خودکشیوں کے واقعات سامنے آرہے ہیں۔ جناب والا! اس ملک میں ایک طرف دولت کی ریل پیل، غربت اور فاقہ اور افلاس اور دوسری طرف کی وہ کیفیت کبھی نہیں تھی جو آج ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں خودکشی خاص طور پر بھوک اور افلاس کی وجہ سے کبھی اس پیمانے پر نہیں ہوئی لیکن یہ سات سالہ دور ہے جس میں پہلی مرتبہ بڑے پیمانے کے اوپر یہ واقعات سامنے آرہے ہیں۔ اگر اخباری اطلاعات صحیح ہیں تو مختصر عرصہ میں یہ تعداد تین سو، ساڑھے تین سو افراد کے ہلاک ہونے کی ہے۔

خدا کے لیے غور کیجیے، اللہ کا خوف کھائیے آپ قوم کو کہاں لے جارہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم نے دولت مندوں پر ٹیکس لگایا ہے۔ میں نے اس بجٹ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ جناب والا! اس میں ایک پیسے کا ٹیکس بھی دولت مندوں پر نہیں لگایا گیا۔ ہم کہہ کہہ کر تھک گئے ہیں۔ سینیٹ کی متفقہ قرارداد ہوئی کہ اسٹاک ایکسچینج میں جو دولت لائی جارہی ہے وہ قیاسی ہے۔ وہ جوئے کی ایک شکل ہے لیکن اسے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ جناب چیئرمین! ۱۹۹۹ء میں اسٹاک ایکسچینج کا سرمایہ ۳۶۷ بلین تھا۔ اس وقت آٹھ سال کے بعد آج وہ ۳۵۰۰ بلین ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰ گنا اضافہ ہوا ہے[1]۔

جناب والا! اگر میں مان بھی لوں کہ آپ کا جی ڈی پی دگنا ہو گیا ہے۔ صنعتی ترقی ۸۰ فیصد بڑھ گئی ہے اور آپ کی زراعت کے اندر ۴۰ فیصد اضافہ ہوا ہے، اس کے باوجود اس بات کا کیا جواز ہے کہ اسٹاک ایکسچینج کا حجم ۱۰ گنا بڑھ گیا ہے اور اس میں چند افراد ارب پتی اور چند سو کروڑ پتی بنے ہیں لیکن ان کے اوپر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ اسی طرح جائیداد کی قیمتیں ۱۰ گنا بڑھ گئی ہیں ہم چیخ رہے ہیں لیکن آپ ان کے اوپر ٹیکس نہیں لگاتے۔ بڑے بڑے جاگیردار جو ایک ایک شادی کے اوپر کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں، ان کے اوپر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ سارا ٹیکس عوام دے رہے ہیں۔ جناب والا! اس صورت حال نے ایک

---

[1] سال ۲۰۲۰ء میں یہ عدد بڑھ کر ۷۰۰۷ بلین روپے تک پہنچ گیا ہے۔

آتش فشاں کو جنم دیا ہوا ہے اور اگر ہم نے درست حکمت عملی اختیار نہ کی تو یہ آتش فشاں کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

اسی طرح جناب والا! خدمتی شعبے کا معیشت میں حصہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کر لیجیے، معاشیات کی کوئی کتاب پڑھ لیجیے بلا شبہ خدمتی شعبہ کا ایک کردار ہے۔ لیکن جس ملک میں زراعت اور صنعت مسلسل متاثر ہوتی چلی جا رہی ہوں وہ ملک ترقی نہیں کرتا۔ محض بینکاری جیسے خدمتی شعبہ کے بڑھنے سے آپ نہ ترقی کر سکتے ہیں اور نہ اسے برقرار رکھ سکتے ہیں۔

بیرونی سرمایہ کاری کی نوعیت: آپ بیرونی سرمائے کی بات کرتے ہیں میں نے بھی اس کا تجزیہ کیا ہے۔ اور ٹھیک ہے بیرونی سرمایہ آیا لیکن جناب والا! ۷ بلین مواصلات میں سے اور ۲ بلین گیس اور توانائی سے متعلق ہے۔ آپ کی معیشت کے پالیسی کے مطابق جو حقیقی شعبے ہیں وہ اس میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خدمتی شعبے میں سرمایہ آنے کے معنی یہ ہیں کہ کچھ روزگار ضرور پیدا ہوگا لیکن پیداواری صلاحیت پیدا نہیں ہوگی۔ یہ وجہ ہے کہ اس سال بھی، جبکہ ابھی تو شروعات ہے ۵۰۱ ملین ڈالر کا منافع ایک سال کے اندر ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ اور یہ برابر بڑھتا جائے گا۔ مستقبل میں آپ اس عمل کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔

ٹیکسٹائل اور دیگر برآمدی صنعتیں: جناب چیئرمین! میں عرض کر رہا تھا کہ اصل مالیاتی معیشت زرعی صنعت ہے۔ اگر وہ بیمار ہے تو پوری معیشت بیمار ہے۔ اس کی بیماری کے ساتھ ساتھ آپ کے پاس اگر کچھ اچھے اشاریے ہیں تو وہ قابل فخر نہیں بلکہ قابل فکر ہیں۔ میں آپ کو ٹیکسٹائل انڈسٹری کی مثال دیتا ہوں۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری وسیم سجاد نے صحیح کہا کہ ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ۶۰ فیصد آپ کی برآمدات ٹیکسٹائل سے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دو سال سے ٹیکسٹائل انڈسٹری شدید بحران کا شکار ہے[1] اور ابھی تک آپ کوئی صحیح حکمت عملی نہیں بنا

---

[1] ٹیکسٹائل انڈسٹری کی یہ حالت مسلسل بگاڑ کا شکار ہے اور پچھلے دو سالوں (۲۰۱۸-۱۹ء اور ۲۰۱۹-۲۰ء) میں بالترتیب ۱۷ء۰ فیصد اور ۲ء۷۵ فیصد اس کی نمو میں کمی ہوئی ہے۔

سکے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سال خام روئی تین ارب ڈالر کی بر آمد ہوئی جبکہ دھاگے، کپڑے اور گارمنٹس کی رفتار سست رہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۱۱۶ ٹیکسٹائل ملز پچھلے دو سال میں بند ہیں۔ جبکہ لومز کی بڑی تعداد غیر متحرک ہیں اور کئی لاکھ افراد اس کی وجہ سے بے روزگار ہوئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

میں سرمایہ کاروں کا دفاع نہیں کر رہا، ان کی غلطیاں بھی ہیں۔ انہوں نے پچھلے ۵ سال میں مشینری در آمد کے بہت زیادہ دعوے کیے تھے لیکن اس مشینری کے در آمد کے نتائج ہمیں کہیں نظر نہیں آرہے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ساری پیش رفت جس ڈھانچے میں ہوئی تھی اس وقت سود کی شرح ۶ فیصد تھی۔ اس وقت آپ نے شرح سود کو عملاً ۱۲ اور ۱۳ فیصد پر پہنچا دیا ہے۔ شرح سود دگنی ہو جانے سے امکانی منصوبے کام نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری جانب آپ کوئی نئی پالیسی نہیں لا سکے۔ مالیاتی پالیسی حالات کو دیکھ کر تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ دو سال سے لوگ چیخ رہے ہیں اور آپ سو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ٹیکسٹائل آج بحران میں ہے۔ ٹیکسٹائل ہی نہیں، جراحی کے آلات کی صنعت اور حتّٰی کہ ہماری کھیلوں کی صنعت سمیت یہ تینوں بڑی بڑی صنعتیں بحران میں ہیں۔ اگر ہم نے ان کے لیے صحیح پیکج نہ دیا، اور بجٹ میں کوئی ایسی مخصوص چیز نہیں ہے، تو ملک بحران سے نہ نکل سکے گا۔ جناب والا! بر آمدات اس لیے نہیں بڑھ رہی ہیں کہ پیداواری شعبہ پیچھے ہے۔ وہ بر آمدی صنعتوں سے جڑا ہوا نہیں ہے اس میں معیار اور مقدار دونوں کے اعتبار سے آپ دنیا کے مقابلے میں نہیں ہیں جب تک آپ اس طرف توجہ نہیں کریں گے، آپ مقابلہ نہیں کر سکتے۔

زرِ مبادلہ کی صورت حال: جناب والا! زرِ مبادلہ کی بات بھی وسیم سجاد نے کی ہے۔ وہ اس وقت موجود نہیں، لیکن وہ معیشت دان نہیں اس لیے میں ان کو دوش نہیں دیتا۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ جس کسی نے ان کو بریف کیا ہے اس میں انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ تو صحیح ہے کہ روپے اور ڈالر کا جو تبادلے کا تناسب ہے وہ اس دورانیے میں بر قرار رہا ہے۔ لیکن وہ یہ بتانا بھول گئے ہیں کہ اس زمانے میں عالمی منڈی میں خود ڈالر کی قدر چالیس فیصدی کم ہوئی ہے

جس کے نتیجے کے طور پر ہم بھی ڈالر کی حد تک اس سے فیضیاب ہو گئے۔ تاہم اگر آپ روپے اور پاؤنڈ کی شرح دیکھیں تو یہ ۸۰ روپے سے بڑھ کر آج ۱۲۰ روپے ہو گئی ہے۔ اسی طرح اگر آپ روپے اور یورو کو دیکھیں تو وہ شرح بھی منفی طور پر بدل گئی ہے۔ چنانچہ جو مصنوعی بات آپ کو بتائی گئی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ آدھا سچ ہے پورا سچ نہیں ہے۔

جناب والا! ناکامی یہ ہے کہ طبعی معیشت موجود نہیں ہے، وہ مشکلات کے اندر رہے۔ اور اس کے لیے آپ کوئی پالیسی لے کر نہیں آئے۔ اسی کے زیر اثر ادائیگیوں کا توازن اور تجارتی توازن بھی آ جاتے ہیں۔ جناب والا! ہماری مسلسل مقروضیت ایک بیماری ہے۔ میں ان اعداد و شمار کو دہراؤں گا نہیں جو اسحاق ڈار نے دیے ہیں، وہ حقائق ہیں۔ میری نگاہ میں ہمارا جائیدادوں کے کاروبار پر انحصار بڑھا ہے۔ جی ڈی پی دو وجوہ سے بڑھ گیا ہے۔ ایک حجم کا بڑھنا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ تقریباً بیس فیصد ہے۔ دوسرا جو امدادی / بیرونی ترسیلات زر آرہی ہیں وہ بھی بہر حال ہماری قومی آمدن کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی پیداواری سرگرمی کی وجہ سے نہیں آرہیں درحقیت مجھے پریشانی ہے کہ جو مالیاتی گنجائش اس زمانے میں اس حکومت کو حاصل ہوئی تھی اس کا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ پچھلے سات سال میں بیرونی ترسیلات زر تقریباً چھبیس بلین ڈالر رہیں اور تقریباً بارہ بلین ڈالر مختلف طریقے سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہم نے جو تعاون کیا ہے، اس کی بنا پر حاصل ہوئے ہیں۔ جناب والا! اس چونتیس پینتیس بلین کو بجائے اس کے کہ پیداواری چینل میں ڈال کر اور سرمایہ کاری کی شکل دے کر ملک کے لیے مستقل ترقی کا سامان پیدا کرتے یہ سارے کا سارا سٹاک ایکسچینج اور جائیداد جیسے کاروبار میں گیا ہے اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوا اور اس کی وجہ پالیسی کا نہ ہونا ہے۔

خوشحال پاکستان اور بڑے منصوبوں کی حقیقت: اس بجٹ (صفحہ ۲۷ پر آئٹم نمبر ۵۰) میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے ''خوشحال پاکستان پروگرام'' کے تحت حکومت نے چودہ ہزار گاؤں کو ڈیڑھ ارب روپے کی لاگت سے بجلی فراہم کی۔ اسی صفحہ کے ساتھ ایک تصحیح بھی موجود ہے

اور وہ تصحیح یہ ہے کہ چودہ ہزار کو انچاس ہزار کر لو اور ڈیڑھ ارب کو ۶ء۲۱ ارب روپے، جناب والا! میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ایک سال کے اعداد و شمار ہیں؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں بجلی کی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ بجلی کا جو استعمال ہے وہ ۱۳ہزار کلوواٹ کے اوپر منجمد ہے، پھر آخر یہ اضافہ کہاں سے ہو گیا۔ پھر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بجلی اور پانی کے بارے میں اس پورے دور میں ۱۹۹۹ء سے آج تک تمام صوبوں میں کونسا پراجیکٹ ہے جس کے نتیجے کے طور پر آپ کی صلاحیت بڑھی ہے۔ اس کے بر عکس لوڈشیڈنگ ہو رہی ہے۔ کراچی والے تو چلا ہی رہے تھے اب پورے ملک میں لوڈشیڈنگ کی جا رہی ہے۔ انرجی پالیسی موجود نہیں ہے۔ توانائی کے تحفظ پر ساری دنیا میں واویلا ہو رہا ہے، یہاں تک کہ امریکہ بھی مجبور ہو کر کچھ چیزوں کو ماننے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں توانائی تحفظ پالیسی کے بارے میں کوئی سوچ نہیں ہے۔ اس بجٹ میں ان چیزوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انڈسٹریز ہم لگا بھی دیں تو توانائی کے تحفظ کے بغیر تباہ ہو جائیں گی۔ دوسری جانب انفراسٹرکچر موجود نہیں ہے۔

جناب والا! یہاں ڈیم کی بات بھی کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس ایوان کی ایک کمیٹی نے دو سال پہلے نثار میمن کے ساتھ بڑی اچھی رپورٹ تیار کی تھی۔ رپورٹ میں بتایا ہے کہ کن چیزوں کے بارے میں اتفاق رائے موجود ہے۔ لیکن جناب والا! افسوس کی بات یہ ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں اتفاق رائے ہے، اس کے بارے میں بھی کوئی امکانی منصوبہ آج تک موجود نہیں ہے۔ اب ڈیم کے حوالے سے جو پیسے رکھے گئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔ ایک سال کے بعد تو شاید اس کی فزیبلٹی آئے گی اور اس بارے میں بھی سوالیہ نشان ہے کہ وہ آئے گی بھی یا نہیں؟ جہاں تک نیلم جہلم ڈیم کی بات ہے، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس ڈیم کی منظوری آج سے چھ سال پہلے ہوئی ہے[1] لیکن کام کے

---

[1] سن ۲۰۰۸ء میں یہ منصوبہ (تقریباً ۶ سال کی تاخیر کے بعد) باقاعدہ طور پر شروع ہوا اور ۲۰۱۸ء میں مکمل ہوا۔ یعنی اپنی اصل تاریخِ تکمیل (۲۰۰۸ء) سے تقریباً ۱۰ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچا اور ۹۶۹ میگاواٹ بجلی سسٹم میں دے رہا ہے۔

حوالہ سے ہم آج تک ہاتھ پے ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جبکہ اسی دوران ہندوستان نے مقبوضہ کشمیر میں ایک نہیں دو ڈیم بنا لیے ہیں۔ درحقیقت آپ کو اپنے آٹھ سال کا حساب دینا ہو گا۔ باتیں آپ نے بہت کی ہیں لیکن ان حقیقی مسائل کی طرف آج تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

زر تلافی کی پالیسی اور نتائج: جناب والا! میں یہ بھی کہوں گا کہ جس چیز کو اس بجٹ میں عوام کے لیے ریلیف کہا گیا ہے یعنی زر تلافی، اس کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ زر تلافی کی پالیسی آج سے شروع نہیں ہوئی، یہ بھی پالیسی کے تسلسل کا حصہ ہے لیکن یہ اندازہ کرنے کی ضرورت ہے کہ زر تلافی کتنا حقیقی ہے اور زر تلافی کے کیا نتائج نکل رہے ہیں۔

پہلی بات جناب والا! یہ ہے کہ ۲۱۱ بلین روپے زر تلافی میں سے ۹۰ بلین روپے تو واپڈا اور کے ای ایس سی[1] کے جو نہایت 'مفلوک الحال' اور 'غریب' سفید ہاتھی ہیں ان کے لیے دیا گیا ہے۔ اس سے کوئی فائدہ عوام کو نہیں پہنچتا۔ باقی جو ۱۱۱ بلین روپے رہ جاتا ہے اس میں سے ۱۰۷ پچھلے سال بھی دیا گیا تھا۔ تو اصل میں اضافہ تو بہت کم ہے۔ پھر اس کا آپ تجزیہ کریں۔ کہا جاتا ہے کہ یوٹیلٹی سٹورز پر سبسڈی دی جا رہی ہے۔ جناب والا! یوٹیلٹی سٹورز کی تعداد اس وقت ایک ہزار[2] ہے۔ خدا کرے کہ معجزہ ہو جائے اور اگلے چار مہینے میں یہ تعداد پانچ ہزار بن جائے لیکن پچھلے ساٹھ سال میں تو ہم ایک ہزار سے نہیں بڑھا سکے۔ یہ ایک ہزار ملکی آبادی کے بمشکل ایک سے دو فیصدی کا احاطہ کرتے ہیں۔ جناب والا! مفروضہ یہ ہے کہ یوٹیلٹی سٹورز سے خرید کرنے والے صرف فاقہ کش اور غریب ہوتے ہیں۔ جو کچھ یوٹیلٹی سٹورز کو آپ دے رہے ہیں وہ سارے کا سارا گویا کہ غرباء کی مدد کے لیے جا رہا ہے۔ لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے بھی یوٹیلٹی سٹورز کو جو کچھ دیا گیا اس کا فائدہ

---

[1] نجکاری کے بعد، اس کا نام "کے-الیکٹرک" ہو گیا ہے۔

[2] اس وقت (۲۰۲۰ء) میں بھی یوٹیلٹی اسٹورز کی ویب سائٹ کے مطابق کل ملا کر چھوٹے بڑے تقریباً ۳۸۰۰ سٹورز ہیں۔

درمیانے ایجنٹوں کو ہوا ہے، عام افراد کو بہت کم ہوا ہے۔ اس سے کہیں بہتر یہ تھا کہ آپ یہی رقم کھانے کے تیل اور بناسپتی گھی پر درآمدی ڈیوٹی کی مد میں کم کر دیتے۔ ایکسائز اور سیلز ٹیکس کو آپ کم کر دیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہر شخص کو اشیاء ضرورت سستی مل سکتی ہیں۔ بعینہ یہی کیفیت باقی تمام چیزوں کے بارے میں ہے۔

جناب والا! زر تلافی مسئلے کے حل کا کبھی بھی کوئی دیرپا طریقہ نہیں رہا ہے۔ ملک میں افراط زر کو یا مہنگائی کو کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ اسحاق ڈار نے اس بارے میں باتیں کی ہیں لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ مہنگائی کو کم کرنے کا انحصار پیداوار کو بڑھانے اور اس کی لاگت کو کم کرنے پر ہے۔ اگر زر تلافی آپ دیں تو وہ مخصوص ہونی چاہیے اور اس طرح ہونی چاہیے کہ جو چند متعین اشیاء ہیں جن کو ہم چاہتے ہیں کہ مدد دی جائے یہ ان ہی کی حد تک محدود رہے۔ زر تلافی کی پالیسی صحیح کرنے کے ساتھ ساتھ آمدنی کی تقسیم کی پالیسی بھی آپ کو درست کرنی ہو گی۔ جب تک آمدنی کی تقسیم صحیح نہیں ہوتی، علاقائی توازن بھی قائم نہیں ہو گا۔ صوبوں کے درمیان بلوچستان اور صوبہ سرحد سب سے زیادہ متاثر ہیں، اگرچہ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ پنجاب اور سندھ میں بھی کچھ علاقے اسی طرح پیچھے ہیں۔ ان پسماندہ علاقوں کے لیے حکومت کی خصوصی مثبت پالیسی ہونی چاہیے جس پر ہم کوئی اعتراض نہیں کرتے۔

بیت المال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کو پھر درست کیا ہے۔ جناب والا! کہا گیا ہے کہ اس طریقے سے ۲۲ لاکھ افراد کو ہم سپورٹ کرتے ہیں۔ لیکن ساڑھے سات ارب روپے کی جو رقم رکھی گئی ہے اس کو افراد کی اس تعداد پر تقسیم کریں تو ایک سال میں ایک فرد کو ۳۴۰ روپے ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس معمولی رقم میں وہ کیسے خوشحال ہو جائے گا۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔

مالیاتی نظم وضبط کی کیفیت: جناب والا! مالیاتی نظم وضبط کی بات بھی کی گئی ہے لیکن مالیاتی نظم وضبط کا حال یہ ہے کہ غیر ترقیاتی اخراجات کے اندر اس سال کے بجٹ میں ۱۵۱ ارب کا

اضافہ ہوا ہے۔ اس میں بھی اگر آپ اصل اور نظر ثانی شدہ بجٹ تخمینہ کو دیکھیں تو وہاں ۵۰ ملین کی کمی ہوئی ہے۔ تعلیم اور صحت کی بات بار بار کی جا رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مختصر رقم بڑھی ضرور ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اس وقت بھی تعلیم کے لیے تمام وسائل ملا کر جی ڈی پی کے ۲ اور ۲ء۲ فیصد سے زیادہ نہیں۔ جب کہ اس سے پہلے ۸۰ کی دہائی میں ہم ۴ء۲ فیصد تک پہنچ چکے تھے اور ہمارا عزم تھا کہ اسے جلد ہی ۴ فیصد کیا جائے گا[1]۔

پچھلے دنوں روزنامہ "ڈان" نے ایک مطالعہ شائع کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۲۰۰۰ سے زیادہ اسکول گھوسٹ ہیں۔ کل تعداد کے تقریباً پانچ فیصد اسکول ایسے ہیں کہ ان کی عمارت نہیں ہے۔ ۱۰ فیصد مزید میں عمارت تو ہے لیکن اس حال میں نہیں ہے کہ اس کو استعمال کیا جا سکے۔ ۳۵ فیصد میں پانی موجود نہیں ہے۔ تعلیم کی سہولتوں کا یہ حال ہے۔ دوسری جانب ذرا آپ دیکھیے کہ سرکاری شعبہ میں تعلیم کے معیار کا کیا حال ہے۔ کون یہ توقع رکھے گا کہ ان سرکاری اسکولوں سے ہم ایک اچھی قیادت فراہم کر سکتے ہیں۔ خدا کے لیے ان چیزوں کی فکر کیجیے۔ محض خوشنما الفاظ مسائل کا حل نہیں ہیں۔

پچھلے سال کے بارے میں منصوبہ بندی کمیشن کی جو رپورٹ آئی تھی، اس میں پہلے نو مہینے میں ۳۴ فیصد وسائل کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس دفعہ ذرا بہتر ہو کر بھی محض ۵۸ فیصد ہے اور یہ ۵۸ فیصد بھی اصل بجٹ میں پچاس ارب کم کرنے کے بعد کے عدد کا ہے۔

جناب والا! ساتھ ہی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ حکومتی کارکردگی کا تاثر قائم کرنے کے لیے بہت سے بیرونی سرٹیفکیٹ پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتے ہیں میرے پاس بھی پانچ، چھ رپورٹیں موجود ہیں، اسحاق ڈار نے ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ پیش کی ہے۔ عالمی بینک کی طرف سے ایک اہم سروے انسانی وسائل کی ترقی پر آتا ہے۔ اس سروے کے مطابق دنیا کے ۱۶۴ ممالک میں سے ہماری پوزیشن ۱۳۴

---

[1] سال ۲۰-۲۰۱۹ء کے اعداد کے مطابق کل جی ڈی پی کا ۳ء۲ فیصد تعلیمی بجٹ کا حصہ ہے۔

ہے[1] اور ہماری یہ پوزیشن برابر گر رہی ہے۔

نجکاری کا معاملہ: یہاں پر نجکاری کی بھی بہت باتیں ہوئی ہیں، نجکاری اصولی طور پر متنازعہ نہیں ہے، یہ کوئی آپ کا تسلسل نہیں ہے، یہ پالیسی آپ سے پہلے بن چکی تھی۔ آپ کو معلوم ہے ۱۹۹۹ء سے پہلے سال میں تقریباً ۵۹ بلین کی نجکاری ہوئی اور ہمیں اس سے انکار نہیں کہ آپ کے زمانے میں یہ ۳۹۰ بلین کی ہوئی ہے۔ لیکن اصل چیز یہ ہے کہ نجکاری اس طریقے سے ہو کہ آپ کے تزویراتی مفادات پر مفاہمت نہ ہو اور آپ کی معیشت میں غیر ملکی کسی ایسی پوزیشن میں نہ آئیں کہ اس سے آپ کی خود انحصاری متاثر ہو۔

جناب والا! بینکاری کا شعبہ بڑا احساس شعبہ ہے، امریکہ میں قوانین موجود ہیں کہ کسی امریکی بینک میں باہر والے ۵ فیصد سے زیادہ سرمایہ نہیں رکھ سکتے۔ ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ۱۹۹۹ء سے پہلے غیر ملکی بینک ۱۰ فیصد تھے اور ۹۰ فیصد اپنے ہاتھوں میں تھا۔ اس وقت غیر ملکی بینکوں کی پوزیشن ۵۰ فیصد سے زیادہ ہو چکی ہے[2]۔ یہ بات کہ ہمارے اپنے بینک حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک وغیرہ غیر مؤثر تھے، مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے ان کو سیاست زدہ اور افسر شاہی کا شکار کیا تھا۔ آپ ان بینکوں کو مؤثر بنانے کے لیے ایک ایسا نمونہ بنا سکتے تھے کہ جس میں انتظامیہ تبدیل ہو کر زیادہ پیشہ ور ہو جاتی۔ اس میں حصہ داری برقرار رکھتے اور پھر اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے سے آہستہ آہستہ ان کے حصص جاری کرتے لیکن آپ نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا۔

نجکاری کے طریقہ کے ساتھ پھر نجکاری کی قیمت بھی مسئلہ ہے۔ حبیب بینک کو آپ نے جس قیمت پر دیا وہ شرمناک ہے۔ میں کوئی پوشیدہ بات بیان نہیں کر رہا ہوں کہ جب

---

[1] سال ۲۰۲۰ء کے سروے کے مطابق پاکستان کی پوزیشن مزید نیچے گر کر ۱۷۴ ممالک کی فہرست میں ۱۴۴ پر آگئی ہے۔

[2] بینکنگ سیکٹر کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ نجی بینکوں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور سرکاری بینکوں کی تعداد ۳۴ شیڈول بینکوں کی کل تعداد میں سے صرف ۶ ہے۔

پی ٹی سی ایل کی قیمت کے بارے میں سوالات اٹھائے گئے تو جس پارٹی نے خریدا ہے وہ صرف ایک ہی بات کہتی تھی کہ ہمیں فرماں روا نے وعدہ کیا ہے۔ کون ہے وہ فرماں روا اور کسے اختیار ہے پاکستان کے اثاثے کو اس طریقے سے فروخت کر دینے کا، اس کا جواب کون دے گا۔ قومی اثاثوں کو اس طرح بیچیں گے تو کہاں جائیں گے۔ پرائیوٹائزیشن کو اس کی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔ مارکیٹ اہم ہے لیکن مارکیٹ اگر بے قابو اور غیر محفوظ ہے تو پھر مفاد پرستوں کے گٹھ جوڑ پر مبنی اجارہ دار اور سازشی اسے استعمال کریں گے اور عوام کا استحصال ہو گا۔ درحقیقت جس متوازن پالیسی کی ضرورت ہے اس کا کوئی نشان اس بجٹ میں نظر نہیں آتا ہے۔

جناب والا! میری نگاہ میں جو بنیادی مسائل اس وقت معیشت کے ہیں، بدقسمتی سے یہ بجٹ انہیں نظر انداز کر کے لایا گیا ہے۔ غربت، بے روزگاری، آمدنی کی تقسیم، مادی معیشت خصوصیت سے زراعت و صنعت، چھوٹی اور درمیانی صنعتیں، ادائیگیوں اور تجارت کے توازن میں جو عدم توازن ہے اس کو صحیح کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ یہ بنیادی مسائل تھے، ان کے بارے میں آپ خاموش ہیں۔ دولت مندوں پر ٹیکس نہیں ہے۔ خاص طور پر جہاں سے آپ وصول کر سکتے تھے، ان طبقات کو تحفظ دیا گیا ہے۔

عالمگیریت کے نام پر آپ نے اپنی معیشت کو دوسروں کے لیے کھول دیا ہے، اور ہم ان کے لیے ایک منڈی بن گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ صنعت کاری کے خاتمے کا یہ عمل ہمیں بہت دور لے جائے گا۔ ٹھیک ہے مسابقت ہونا چاہیے، ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروری حد تک تحفظ کے انداز میں ہونا چاہیے۔

آپ نے نجکاری کی ہے، دنیا بھر کی تاریخ پڑھ لیجیے جہاں نجکاری ہوئی ہے وہاں اس کے ساتھ صارفین کے مفادات کے لیے نگراں ادارے بھی بنائے جاتے ہیں۔ مسز تھیچر کے زمانے میں سب سے پہلے انگلستان نے یہ کام ۱۹۸۰ء کے عشرے میں کیا تھا۔ اس وقت انھوں نے نو نگراں ادارے بنائے اور اس ذریعہ سے انھوں نے عوام اور صارفین کے مفادات کا

تحفظ کیا۔ آپ نے اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا۔ جن صنعتوں کی آپ نے نجکاری کر لی ہے وہاں بھی صارف کے تحفظ کے لیے کوئی قانون اور کوئی طریقہ موجود نہیں ہے۔ اور جہاں پر اجارہ داری کو کنٹرول کرنے والی اتھارٹی ہے اور ان میں ضابطہ اخلاق موجود ہے وہاں اس کا طریقہ کار موجود نہیں ہے۔ آپ سیمنٹ اور شوگر کی قیمتوں میں دیکھ چکے ہیں کہ یہ لوگ کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ مجھے سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ اس پورے دور میں ایک اشرافیہ کی معیشت کے ذریعہ امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد پھر آپ خوشی کے شادیانے بجائیں اور کہیں کہ بڑی خوشحالی آجائے گی تو یہ زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہے۔

پالیسی میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت

جناب والا! پالیسی میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ تبدیلی نہیں آتی ہم موجودہ بحران سے نہیں نکل سکتے۔ یہ ہمارا مشترک اور قومی مسئلہ ہے، یہ کسی ایک پارٹی کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے نکلنے کے لیے مفاد پرستوں سے چھٹکارا ضروری ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ جن لوگوں نے بینکوں سے قرضے لیے ہیں ان سے ہم ایک ایک پائی وصول کریں گے، بتائیے! آپ نے آج تک کیا وصول کیا ہے۔ جو پالیسی آپ نے نگرانی کی اختیار کی ہے اس کے نتیجے کے طور پر جو بااثر طبقات تھے انہوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ بینک کو آپ دیکھیے، بینکوں کا جو نفع ہے ۹۰ کی دہائی میں نو ارب روپے سے بڑھ کر اس سال وہ ۱۰۵ ارب ہے۔ بینکوں پر ٹیکس ہم نے کم کیا، ۴۵ فیصد سے کم کر کے اس کو ہم ۳۸ پر لے آئے ہیں اور اب ۳۵ پر لا رہے ہیں[1]۔ بینکوں کا پھیلاؤ آپ دیکھیے۔ ۱۹۹۹ء میں رقم جمع کروانے والے کو ساڑھے چھ فیصد منافع مل رہا تھا، آج ۴ فیصد سے کم ہے، آج بینکوں کا پھیلاؤ ساڑھے سات فیصد ہے، خود اسٹیٹ بینک چیخ رہا ہے۔ اسٹیٹ بینک نے مالیاتی نظم و ضبط کے بارے میں، ادائیگیوں کے

---

[1] کارپوریٹ ٹیکس کی موجودہ شرح بینکنگ سیکٹر پر اور بھی کم ہو کر اب ۳۵ فیصد ہے اور غیر بینکنگ سیکٹر پر ۲۹ فیصد ہے۔

توازن کے نظم وضبط کے بارے میں اور تجارتی توازن کے بارے میں اور بینکوں کے پھیلاؤ کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ یہ سارے کے سارے متنوع مسائل ہیں لیکن ان کی طرف کوئی فکر نہیں کی جارہی۔ جب تک آپ ان مشکل مسائل کو حل نہیں کرتے، ملک معاشی ترقی کے راستے پر نہیں جائے گا، وہ ترقی جس کا کوئی فائدہ عوام کو پہنچے اور اس کے لیے پالیسیوں میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

(۱۲جون ۲۰۰۷ء)

قومی بجٹ اور ملکی معاشی پالیسیاں: صورت حال اور تجاویز

بجٹ سازی کے حوالہ سے چار بڑے مسائل

پارلیمنٹ کا کردار: جناب چیئرمین! حکومت میں کوئی بھی پارٹی ہو، ہم سب کے اور جمہوریت کے مفاد میں یہ بات ضروری ہے کہ بجٹ سازی میں پارلیمنٹ کا کردار بڑھایا جائے اور اس طرح پارلیمنٹ کو اس کا اصل مقام دیا جائے۔ مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت تک ہمارے معاملے میں یہ صورتحال نہیں ہے۔ اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ حکومتی پارٹی اور حزب اختلاف دونوں کو مل کر وہ راستہ اختیار کرنا چاہیے جس سے بجٹ سازی میں عوام کی رائے کی شمولیت ہو سکے اور اس کا ذریعہ پارلیمنٹ ہے، اس لیے کہ وہ عوام کی نمائندہ ہے۔ اس ضمن میں پہلی چیز بجٹ سازی کے لیے مجموعی وقت ہے۔ اس اہم کام کے لیے جتنا وقت مقرر ہونا چاہیے وہ ہمارے ہاں نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے ۸۰ ممالک کے بجٹ سازی کے طریقہ کار کا مطالعہ کیا ہے اور جناب والا! ان میں سے کم و بیش ہر ملک میں کم سے کم دو مہینے اور زیادہ سے زیادہ چھ مہینے بجٹ سازی کے عمل کے لیے مختص ہیں۔ چالیس ممالک ایسے ہیں جن میں تین سے چار مہینے بجٹ سازی میں صرف کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ کام ڈھائی، تین ہفتے میں کر دیا جاتا ہے۔ ہزاروں صفحات ارکان پارلیمنٹ کو دے دیے جاتے ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ ارکان پارلیمنٹ ان کا مطالعہ کریں گے اور اس طرح پارلیمنٹ اپنا حق ادا کر سکے گی۔ یہ طرز عمل کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے۔

بجٹ بنانے کا عمل: دوسری چیز بجٹ بنانے کا عمل ہے۔ میری نگاہ میں یہ سب سے اہم مسئلہ ہے کہ آخر بجٹ بنانے کا طریقہ کار کیا ہو۔ ہمارے ہاں بجٹ محض بیوروکریسی کے ہاتھوں بنتا

ہے جس کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ مقتدرہ کو اخراجات میں اضافہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس روایت کو ہمیں توڑنا ہو گا۔ میں آپ کو اپنی تجاویز دوں گا کہ بجٹ سازی کا وہ صحیح طریقہ کیا ہو سکتا ہے جس میں عوام، پارلیمنٹ اور اسٹیبلشمنٹ تینوں شریک ہو سکیں۔

بجٹ کے ماڈلز: تیسری بات جناب والا! یہ ہے کہ ہمارے بجٹ کا ماڈل ابھی تک نو آبادیاتی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں، بجز برطانوی امپائر، ہمیں یہ ظاہر اور پوشیدہ کی تفریق نہیں ملتی کہ بجٹ کے ایک حصہ کی تفصیلات کو ظاہر نہ کیا جائے۔ نو آبادیاتی دور میں برطانیہ کا خیال دراصل یہ تھا کہ وائسرائے اور تاج برطانیہ کے جو مفادات ہیں وہ کبھی بھی عوامی سطح پر یہاں زیر بحث نہ آئیں اس لیے انہوں نے ۱۹۳۵ء کے قانون میں یہ رکھا کہ اخراجات کا ایک حصہ پوشیدہ ہو گا اور اس پر پارلیمنٹ نہ ووٹ دے سکتی ہے اور نہ ہی تبدیلی کر سکتی ہے۔ ہم نے آج بھی آنکھیں بند کر کے وہ نو آبادیاتی اصول جاری رکھا ہوا ہے۔ موجودہ بجٹ میں اگر آپ دیکھیں تو آپ کو تعجب ہو گا جناب والا! کہ مالی تخمینہ کا ۲۲ فیصدی پوشیدہ ہے جس میں پارلیمنٹ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ مرکزی اخراجات کا ۹۶ فیصد پوشیدہ ہے، جس میں پارلیمنٹ کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر آپ میمورنڈم کا شیڈول(ا)[1] دیکھیں مطالبات زر کا، جس میں تمام ادائیگیوں کی تحریک آتی ہے تو آپ کو تعجب ہو گا کہ تمام ادائیگیوں کی پوزیشن یہ ہے کہ کل ادائیگیوں میں سے ۸۷ فیصد حصہ پوشیدہ ہے۔ ایسے میں پارلیمنٹ کا کردار کیا رہ جاتا ہے۔

فوج کا بجٹ: اگلی چیز فوج کا بجٹ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ایس ایم ظفر نے اس مسئلے کو اٹھایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس معاملے میں کھلے دل کے ساتھ پارلیمنٹ کو اس کا صحیح مقام دیں۔ فوج کی اہمیت مسلّم ہے اور اس کی حقیقی ضروریات لازماً پوری ہونی چاہییں۔ درحقیقت اس کی ضروریات اگر ہمیں اپنا پیٹ کاٹ کر بھی پورا کرنی پڑیں تو اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ہم نے ماضی میں بھی یہ کیا ہے، آج بھی کریں گے اور ہمیں آئندہ بھی کرنا

---

[1] بجٹ دستاویزات

چاہیے۔ لیکن اس وضاحت کے بعد یہ بات کہنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ فوج کے بجٹ کو ملک کے حالات اور سیکورٹی کے درست تناظر میں ہونا چاہیے۔ ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ آج پاکستان کے لیے کوئی بیرونی خطرہ باقی نہیں رہا ہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے پچھلے ایک سال میں کم از کم ڈیڑھ درجن بار ملک اور بیرونی پلیٹ فارم پر یہ بات کہی ہے کہ ہمیں کوئی بیرونی خطرہ نہیں ہے، جو خطرات ہیں وہ اندرونی ہیں۔ اگر صورت حال یہ ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر فوج کا بجٹ اس معیار کو سامنے رکھ کر نظر ثانی کیوں نہیں کیا جائے گا؟ اور اگر نظر ثانی کرنی ہے تو کون یہ نظر ثانی کرے گا؟ میں سمجھتا ہوں کہ فوج کے بجٹ کو اپنی مکمل شکل میں پارلیمنٹ کے سامنے آنا چاہیے۔

جناب والا! میں نے جو تھوڑی بہت مشق کی ہے اس کی روشنی میں آپ کے سامنے میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ دفاعی خدمات کا سینکڑوں بلین روپے کا محض ایک سطری بجٹ ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ دفاعی خدمات کو کیا جا رہا ہے، تنخواہوں اور خریداری کے لیے کیا ہے اور تحقیق و ترقی اور ساز و سامان میں جدت لانے کے لیے کیا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ اس بجٹ کے اندر ۱۳ آئٹم ایسے ہیں جہاں فوج کے لیے رقوم مختص ہے لیکن فوج کے بجٹ سے متعلق اعداد و شمار میں یہ شامل نہیں ہوتا۔ میں آپ کو تفصیل بتاتا ہوں۔ میری نگاہ میں اٹامک انرجی کمیشن کے جو اخراجات ہیں ان کا کم از کم ۵۰ فیصد دفاعی مقاصد کا ہے اور ۵۰ فیصد باقی تمام پہلو ہیں، اس لیے اس کا ۵۰ فیصد بھی دفاعی بجٹ کے شمار میں آنا چاہیے۔ ڈیفنس ڈویژن کا خرچہ ہے اس کے بعد پھر تعلیم و تربیت کا محکمہ جو کنٹونمنٹ اور گیریژن کا حصہ ہے وہ بھی ایک ایسا آئٹم ہے۔ جو فوج کی تیاری کے لیے ہے، اسے بھی اگر مکمل نہیں تو نصف اس کے اندر آنا چاہیے۔ دفاعی پیداوار کا مسئلہ بار بار آیا ہے۔ پھر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس

سال کے بجٹ[1] میں جو ۴۴۳ بلین رکھا گیا ہے اس میں سے ۳۶۹ء۹ یعنی ۷۳ بلین فوج کی پنشن کے ہیں، اس کو بھی اس میں آنا چاہیے۔ فرنٹیئر کانسٹیبلری کوسٹ گارڈز، رینجرز کے بجٹ کو علیحدہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے چونکہ یہ بنیادی طور پر فوج کی قیادت میں چل رہے ہیں ان کو اسی خانے میں رکھنا ہوگا۔

جناب والا! اس کے بعد ایک اور بڑی دلچسپ چیز ہے۔ اس چیز کا تعلق قرضوں کے اخراجات سے ہے۔ میں یہ سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ اگر بیرونی قرضوں کا ایک حصہ ملک کی معاشی ترقی کے لیے ہے تو اس کا ایک حصہ فوجی ضروریات کے لیے رہا ہے۔ یوں اگر بجٹ کی تجاویز کو سامنے رکھا جائے تو اس کا ۲۰ سے ۲۵ فیصد حصہ تو فوجی بجٹ ہی سے متعلق ہونا چاہیے۔ تو کیا وجہ ہے کہ قرضوں کے اخراجات کا جو ۲۵ فیصد ہے اس کو بھی ہم اسی خانے میں نہ رکھیں۔

جناب والا! میں واضح کر دوں کہ میں فوجی بجٹ میں اضافے یا کمی کی بات نہیں کر رہا ہوں، میں یہ بات شفافیت کے لیے کر رہا ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مذکورہ ۱۳ آئٹمز کو آپ سامنے رکھیں تو میں نے جو تخمینہ لگایا ہے اس کے نتیجہ میں فوجی بجٹ میں دی گئی رقم میں تقریباً ۳۵ سے ۴۰ فیصد تک کا اضافہ ہو جائے گا۔ جناب والا! اس ضمن میں، میں یہ بات بھی عرض کروں گا کہ فوج پر جو خرچ ہو رہا ہے اس کو قومی احتساب کا حصہ ہونا چاہیے۔ استحقاق پر ہم غور کریں۔ جو حقیقی ضرورت ہے وہ اس کو دیں لیکن اس کو چھپایا نہ جائے اور اس کو مختلف خانوں میں ڈال کر احتساب سے نہ بچایا جائے۔

بجٹ کے حوالہ سے تجاویز

پاکستان کی مجموعی صورت حال اور معیشت کے مسائل کو پیش نظر رکھا جائے تو

---

[1] بجٹ دستاویز سال ۰۶-۲۰۰۵ء

مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں میری تجاویز درج ذیل ہیں:

بجٹ کی تیاری کا طریقہ کار: جناب والا ! میری پہلی تجویز یہ ہے کہ بجٹ سازی کے لیے کم از کم تین مہینے کی مدت رکھی جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہو کہ فروری کے مہینے میں وزارت خزانہ کی طرف سے اہداف و مقاصد کا ایک بیانیہ پچھلے سال کی نظر ثانی کی بنیاد پر آئے۔ یعنی اقتصادی صورتحال کا یہ جائزہ جون میں نہیں بلکہ جنوری یا فروری میں آئے۔ اس کی روشنی میں آپ پہلے اپنے اہداف کے لیے اگلے سال کے اعداد لے لیجیے۔ بعد ازاں ان کی روشنی میں بجٹ پر عمومی بحث اسمبلی میں بھی ہو اور سینیٹ میں بھی ہو۔ نیز دونوں جگہ کی فنانس کمیٹیاں اس پر خود بھی غور کریں اور ملک کے تمام متعلقہ شعبوں کو بھی موقع دیں کہ وہ ان کے سامنے اپنی پریزنٹیشن دیں اور ان کی روشنی میں یہ اپنی سفارشات وزارت خزانہ کو پیش کریں۔ ان سب کو سامنے رکھ کر پھر وزارت خزانہ بجٹ بنائے اور یہ بجٹ میری نگاہ میں مئی کے وسط میں قومی اسمبلی اور سینیٹ میں آجانا چاہیے تاکہ ان دونوں اداروں کو اس پر بحث کرنے کا مناسب وقت ملے۔ میرے خیال میں اس کے لیے اسمبلی میں چار ہفتے اور سینیٹ میں کم از کم دو ہفتے مخصوص ہوں۔ اور میں یہ بھی کہوں گا کہ دو ہفتے کے معنی بھی کام کے ۱۴ دن ہونے چاہییں۔ اس وقت ہماری یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ہم یہاں تقریر کرنے اور سننے کے لیے آتے ہیں اور پھر بھاگے بھاگے کمیٹی میں کام کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ یوں ایک عجیب افرا تفری کی کیفیت میں سینیٹ کام کرتی ہے۔ اس طرح آپ چاہتے ہیں کہ سات دن کے اندر یہ سارا کام کر کے آپ کو دے دیا جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سات دن نہیں عملاً تو کمیٹی کے پاس دو ہی دن بچتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ کسی طرح بھی درست نہیں۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ بجٹ سازی کے لیے وقت اور طریقہ کار ان دونوں میں اتفاق رائے سے تبدیلی کی جائے۔

اخراجات کی تفصیل: دوسری تجویز میری یہ ہے کہ پوشیدہ اخراجات ختم کیے جائیں، تمام اخراجات بجٹ کے اندر رہوں اور ان کا پورا پورا حساب اور جانچ پڑتال کی جائے۔

ڈیفنس اخراجات (بجٹ) کی تفصیل: تیسری تجویز یہ ہے کہ فوج کا بجٹ بھی پارلیمنٹ میں تفصیل سے آئے۔ ہم کبھی بھی نہیں چاہتے کہ حساس چیزیں چاہے وہ جوہری توانائی کمیشن کی ہوں یا فوج کی ہوں، وہ باہر آئیں۔ لیکن بد قسمتی سے یہاں جو چیزیں حساس کہی جاتی ہیں وہ پارلیمنٹ سے ہی پوشیدہ رکھی جاتی ہیں جبکہ دوسری بہت سی جگہوں پر باقاعدہ دستیاب ہوتی ہیں۔ میں آپ کو اپنا تجربہ بتارہا ہوں کہ میں نے آکسفورڈ اور ہاورڈ کے اندر لائبریری میں اپنی آنکھوں سے وہ دستاویزات دیکھی ہیں جنہیں یہاں حساس کہا جاتا تھا اور پارلیمنٹ کو بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ تمام خفیہ اور 'محدود رسائی' والے کاغذات وہاں موجود تھے۔ براہ مہربانی اس صورت حال کو ختم کیجیے اور شفافیت یقینی بنایئے۔ فوج کا پورا بجٹ سامنے آئے، بجز ان خاص چیزوں کے جن کی تفصیل دینا ضروری نہیں ہے اور پھر پارلیمنٹ میں مباحثہ کے بعد اس کو منظور کیا جائے۔

پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا کردار: جناب والا! اس سلسلے میں چوتھی تجویز میں یہ دینا چاہتا ہوں کہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا کردار بڑھایا جائے اور یہ محض قومی اسمبلی کی حد تک نہ ہو بلکہ اس کو پوری پارلیمنٹ تک وسیع ہونا چاہیے۔ میں جانتا ہوں ان تمام کاموں کے لیے دستوری ترامیم کی بھی ضرورت ہے لیکن اگر آپ نے بجٹ سازی کو اچھا بنانا ہے تو پھر یہ چیزیں آپ کو کرنی ہوں گی۔ چنانچہ اس کمیٹی میں سینیٹ کی نمائندگی بھی ہونی چاہیے[1]۔ دوسری جانب دنیا بھر میں پبلک اکاونٹس کمیٹی کا اصول یہی ہے کہ اس کا سربراہ حزب اختلاف سے ہوتا ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی قوم کے ضمیر کی حیثیت سے کام کرتی ہے اس اعتبار سے ہمیں بھی اپنے نظام میں یہ تبدیلی کرنی چاہیے کہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا سربراہ حزب اختلاف سے ہو[2]۔

---

[1] ۲۰۱۶ء کے بعد سے سینٹ کے ۶ ارکان بھی پبلک اکاونٹس کمیٹی کے ممبر ہوتے ہیں۔

[2] ۲۰۰۸ء کے بعد سے یہ روایت قائم ہوگئی ہے کہ قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کو کمیٹی کا سربراہ منتخب کیا جاتا ہے۔

قومی مالیاتی ایوارڈ میں تسلسل: جناب والا! میری پانچویں تجویز کا تعلق قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ سے ہے۔ یہ مسئلہ آج ایک دھماکہ خیز صورت اختیار کر چکا ہے، یہ ایک ٹائم بم ہے خدا کے لیے اس کی نزاکت کو محسوس کیجیے اور یہ رویہ بدلیے کہ مالیات کو مرکز مکمل طور پر اپنی گرفت میں رکھے۔ صوبوں کو کام کے لیے اپنا تابع مہمل بنا کر نہ رکھیے۔ تین سال پہلے یہ ایوارڈ آجانا چاہیے تھا تاہم اس پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، بلکہ میرے جن ساتھیوں نے یہ کہا ہے کہ اتفاق رائے نہیں ہونے دیا جا رہا مجھے اس میں بڑا وزن نظر آتا ہے[1]۔ جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ وفاقی حکومت کا رویہ اس معاملے بہت ہی سنگدلانہ ہے اور خاص طور پر صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) کی طرف سے، جس کی نمائندگی مَیں اس ایوان میں کر رہا ہوں، میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آبی توانائی کے منافع کا جو مسئلہ پندرہ سال سے سلگ رہا ہے[2] اس پر پیش رفت نہیں ہو رہی۔ یہ مسئلہ صوبہ کو پریشان کر رہا ہے اور وہ آپ سے کوئی بھیک نہیں بلکہ اپنا حق مانگ رہا ہے۔ آخر معاملہ اس مقام پر آیا کہ چلیے فیصلہ کے لیے مسئلہ کو ثالثی میں دیتے ہیں۔ ثالثی کے لیے سکیم بنی ہے اس کے تحت آٹھ مہینے میں ثالثوں کو اپنا فیصلہ دے دینا تھا۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے فائل صوبہ سرحد اور واپڈا کے درمیان ہی گردش کر رہی ہے اور آج تک ثالثی کے عمل کا آغاز نہیں ہو سکا۔ وعدہ کیا گیا تھا کہ جب تک ثالثی ایوارڈ آتا ہے عبوری نظام کے تحت جو چیز ۱۹۹۲ میں چھ ارب روپے پر منجمد کر دی گئی تھی، ہم اس کو بڑھا کر آٹھ ارب روپے کر دیں گے۔ وزیر خزانہ نے اسے قبول کیا اور اس وقت کے وزیر اعظم نے

---

[1] آخری متفقہ ایوارڈ کمیشن ۲۰۱۰ء میں ہوا تھا جس کی مدت ۲۰۱۵ء میں ختم ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے پرانے مرتب کردہ اصولوں پر ہی مالی تقسیم ہو رہی ہے۔ دسواں مالیاتی کمیشن جولائی ۲۰۲۰ء میں تشکیل دیا گیا جس کی پہلی میٹنگ فروری ۲۰۲۱ء میں منعقد ہوئی۔

[2] بد قسمتی سے یہ مسئلہ آج بھی اتنا ہی گھمبیر ہے اور کوئی واضح فارمولانہ ہونے کی صورت میں گزشتہ دو مالی سالوں میں KP حکومت کے ۱۲۱ ارب روپے کے مطالبہ کے برعکس مرکز کی جانب سے محض ۳۴ء۵ ارب روپے ادا ہوئے ہیں۔ [حوالہ: پاکستان ٹوڈے، ۶ اگست ۲۰۲۰ء]

اس کا اعلان کیا لیکن آج تک وہ رقم صوبہ کو نہیں ملی۔ جناب والا! میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ پچھلے بجٹ میں صوبہ (سرحد) کی مالی امداد کے سلسلے میں طے ہوا تھا کہ اسے بڑھایا جائے گا۔ اس کے لیے بجٹ میں سرحد اور بلوچستان میں تقسیم کے لیے رقوم بھی تجویز ہو گئی تھیں۔ مجھے علم نہیں کہ بلوچستان کو کیا ملا ہے لیکن سرحد کے بارے میں، میں نے رات کو ہی وزیر خزانہ سے تازہ ترین معلومات حاصل کی ہیں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہمیں اس مد میں ایک پیسہ اس سے زیادہ نہیں ملا جو بجٹ میں دیا گیا تھا۔

جناب والا! دوسری جانب میں واپڈا کے طرز عمل پر بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک طرف واپڈا ہمارا حق ہمیں ادا نہیں کرتا، دوسری طرف عالم یہ ہے کہ بجلی کے جو بل سرحد حکومت کے ہیں ان میں ۵۰ فیصد تک اضافی بلنگ کی جا رہی تھی۔ میں نجی بلوں کی بات نہیں کر رہا، حکومتی اداروں کے بلوں کی بات کر رہا ہوں۔ جب سرحد حکومت نے ان بلوں کی آزادانہ چیکنگ کا نظام بنایا اور اپنے میٹر لگائے تو جناب والا! معلوم ہوا کہ ۵۰ فیصد رقم زیادہ لی جا رہی تھی۔ واپڈا جعلی بلنگ کے ذریعے ہمارے ساتھ رویہ اختیار کر رہا ہے یہ بڑے دکھ کی بات ہے۔ پچھلے دنوں سیلاب اور بارشوں کے نتیجہ میں تباہی ہوئی ہے، اس میں خاص طور پر سرحد اور بلوچستان نے بڑا نقصان اٹھایا۔ اس موقع پر اس ایوان نے اور خود بلوچستان اور سرحد کے عوام نے اپنی ذمہ داری ادا کی۔ سرحد حکومت نے اپنا پیٹ کاٹ کر شہید ہونے والوں اور تباہی سے متاثر افراد کے لیے امداد کی۔ مرکز نے امداد کا وعدہ کیا تھا لیکن مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وعدہ کے برعکس ایک پیسہ بھی امداد کی مد میں ادا نہیں کیا۔ تباہی کا تخمینہ سامنے رکھا جائے، اور اس میں سڑکیں اور سرکاری عمارتیں شامل نہیں ہیں، تو اس سلسلے میں جناب والا! مرکز نے صرف دسواں حصہ فراہم کیا ہے۔

میں سلام کروں گا سندھ کی حکومت اور عوام کو جس نے آگے بڑھ کر پانچ کروڑ روپے امداد کی مد میں صوبہ سرحد کو دیے۔ باقی ساری رقم صوبے نے خود دی ہے۔ جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ مالیاتی ایوارڈ محض رقوم کی تقسیم کا ایک ایوارڈ نہیں

ہے۔ مالیاتی ایوارڈ کا تعلق اس چیز سے ہے کہ صوبے اپنے وسائل اپنے ہاتھ میں لے کر کے اپنی ضرورتوں کو پورا کریں۔ آپ نچلی سطح پر اختیارات کی منتقلی اور عدم مرکزیت اور صوبائی خود مختاری کی باتیں کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مالیاتی ایوارڈ کو جس طرح مرکز نے برتا ہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ نے اسے صرف اختیار بڑھانے اور اس مالیاتی آلے کو سیاسی مقاصد بلکہ سزا دینے کے لیے رکھا ہے۔ سرحد میں چونکہ حکومت آپ کی نہیں دوسروں کی ہے اس لیے آپ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہوئے ان کو سزا دے رہے ہیں۔ یہ صریحاً دستور کے خلاف رویہ ہے۔ یہ سیاسی اعتبار سے ایک رکاوٹ ہے اور اس کی قیمت آپ کو ادا کرنا پڑے گی۔

وسائل پر مقامی آبادی کا پہلا حق: جناب والا! یہاں پر میں چھٹی تجویز یہ دینا چاہتا ہوں کہ اب اس معاملے میں دستور میں ایک متفقہ علیہ ترمیم کر کے چند باتوں کو طے کر دینا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ بعض اور ساتھیوں نے بھی یہ بات کہی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ دستور کی مشترکہ فہرست کو ختم کیجیے۔ اس کی مناسبت سے اس وقت جو وزارتی ڈویژن یہاں ہیں انہیں ختم کر کے صرف دفتر رابطہ مرکز رکھیے۔ یہ تمام وزارتیں صوبوں کو منتقل ہوں اور صرف وزارتیں ہی نہیں بلکہ ان سے متعلق وسائل بھی منتقل ہوں[1]، اس لیے کہ نچلی سطح پر سیاسی اقتدار کی منتقلی مالیاتی اختیار کے بغیر بے معنی ہے۔ یہ سب سے اہم چیز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو قدرتی وسائل جس صوبے میں ہیں وہ اس صوبے کی ملکیت اور اس صوبے کا پہلا حق ہے۔ بلاشبہ ان سے پورے صوبے، پورے ملک اور سب کی ضرورتوں کو پورا ہونا چاہیے، میں اس کے خلاف نہیں لیکن ترتیب بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم تجویز دے سکتے ہیں کہ ان تمام میں جو بھی رائلٹی یا آمدنی ہو اس کا ۱۰ فیصدی اسی ضلع میں خرچ ہونا چاہیے جہاں سے وہ قدرتی وسائل نکل رہے ہیں۔ آپ بلوچستان کے بارے

---

[1] دستور پاکستان میں ۱۸ویں ترمیم کے نتیجہ میں ۲۰۱۰ء میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ تاہم اس فیصلہ پر اس کی حقیقی روح کے مطابق عمل درآمد کے حوالہ سے بہت سے تحفظات آج بھی موجود ہیں۔

میں جانتے ہیں کہ جہاں سے قدرتی وسائل نکل رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بلوچستان میں ڈیرہ بگٹی کا علاقہ سارے ملک کو منور کر رہا ہے لیکن وہاں تاریکی ہے۔ یہی معاملہ سرحد کا بھی ہے۔ وہاں سے جو گیس نکلی ہے، وہ دوسرے صوبوں کو جا رہی ہے لیکن یہ علاقہ اور خصوصاً جنوبی علاقہ جس کا پہلا حق ہے وہ اس سے محروم ہیں۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ اس لیے ہم تجویز پیش کرتے ہیں کہ ۱۰ فیصد اسی ضلع میں اور ۲۵ فیصد اسی صوبے میں دیا جائے اور باقی ۶۵ فیصد قومی گرڈ میں لایا جائے۔ یہ ایک ڈھانچہ ہے جس میں ہمیں ان معاملات کو حل کرنا ہو گا۔

جناب والا! میں یہ بھی تجویز دوں گا کہ اس سال کے قومی مالیاتی ایوارڈ کا بجٹ کی منظوری سے پہلے اعلان ہو جانا چاہیے کیونکہ اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ کمیشن کی میٹنگ بلایئے۔ مرکز اور سندھ میں ایک ہی پارٹی کی حکومت ہے تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ آپ سیاسی مسائل کو سیاسی طریقے سے حل نہیں کر سکتے۔ آپ بیٹھیں اور طے کریں۔ اس طرح چیزوں کو معلق اور معطل رکھنا، یہ مجرمانہ فعل ہے۔

درست اعداد و شمار کو یقینی بنانا: جناب والا! میری ساتویں تجویز اعداد و شمار سے متعلق ہے کہ بجٹ جہاں ایک طرف ملک کا مالیاتی میزانیہ اور حکومت کی آمد و خرچ کا گوشوارہ ہے، وہاں وہ دوسری طرف ملک کی معیشت کے حوالہ سے مثبت اور منفی دونوں اطراف کا آئینہ ہے۔ پھر بجٹ ایک پالیسی دستاویز ہوتا ہے جو حکمرانوں اور حکومت کے سماجی و اقتصادی مقاصد کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے یہ تین پہلو ہیں۔ آپ کا حساب کتاب کا جو حصہ ہے، وہ سامنے آتا ہے تاہم اس میں بھی خامیاں ہیں۔ کل جیسا کہ سینیٹر اسحاق ڈار نے نشاندہی کی ہے اور میں نے جب ان دستاویزات کو پڑھا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ ان میں درجنوں تضادات ہیں۔ ایک چیز کے بارے میں ایک عدد ایک دستاویز میں ہے اور اسی چیز کے بارے میں دوسری دستاویز میں یہ عدد مختلف ہے۔ یہ چیزیں کسی صورت نہیں ہونی چاہییں۔ تاہم میں آپ کا وقت اس طرح کے اعداد و شمار کی تفصیلات میں صرف نہیں کروں گا۔ میں اہم چیزوں کی طرف آتا ہوں۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ملک جس کی اقتصادی ٹیم اور اقتصادی ادارے قابل اعتماد اعداد و شمار

اور درست تجزیہ پیش نہیں کر سکتے وہاں نہ صحیح پالیسی سازی ہو سکے گی اور نہ ملک کے اندر اور نہ ہی ملک کے باہر کوئی اعتبار حاصل ہو سکے گا۔

جناب والا! میں تنقید کے لیے نہیں بلکہ حقائق کو پیش کرنے کے لیے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مئی (۲۰۰۵ء) کے مہینے میں لاہور میں پاکستانی شماریات پر ایک سیمینار ہوا ہے۔ اس میں عالمی بینک کے نمائندوں اور یورپی یونین کے مبصرین نے کھل کر یہ بات کہی ہے کہ اس وقت کے اعداد و شمار ناقابل اعتماد ہیں۔ جب تک آپ اپنے اعداد و شمار کو قابل اعتبار نہیں بناتے ہیں، آپ کی ساکھ اور بیرونی تعاون متاثر ہو گا۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ ان اداروں کا آپ کی شماریات کے بارے میں فتویٰ ہے۔

قومی آمدنی کا حساب: جناب والا! اس سے اور آگے بڑھیں۔ میں دو چار مثالیں پیش کر کے آپ کو بتاؤں گا کہ اس وقت کیا کیا جا رہا ہے۔ اس وقت جی ڈی پی کا بڑا ذکر ہو رہا ہے کہ ہم نے اسے اتنا بڑھا لیا ہے۔ جناب والا! میں بھی ایک معیشت دان ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ قومی آمدنی کا حساب بڑا محنت طلب کام ہے، یہ آسان کام نہیں ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہر پانچ سے سات سال کے بعد قومی آمدنی کے حساب کے بنیادی سال کو بدلنا چاہیے۔ یہ معاشیات میں ایک اہم چیز ہے لیکن ہمارے ہاں سب سے پہلے یہ کیا گیا کہ ۲۰ سال تک اسے تبدیل نہیں کیا گیا جو کہ ایک مجرمانہ غفلت تھی۔ تاہم جب اسے تبدیل کیا گیا تو اس کے لیے جس سال کا انتخاب کیا گیا، وہ سال ایک عمومی سال نہیں تھا بلکہ ۱۹۹۸ کے ایٹمی تجربات کے بعد، پابندیاں لگنے کے نتیجے میں ایک غیر معمولی سال تھا۔ وہ ایک پریشان کن سال تھا جب اس سال کو بنیاد بنایا گیا تو اس کی بنیاد پر کیا جانے والا تجزیہ پالیسی کے لیے صحیح بنیاد نہیں بنتا۔ پیشہ ورانہ طور پر اگر ۰۲-۲۰۰۱ء کو قبول کر کے اسے بنیاد بناتے تو یہ زیادہ بہتر اور قابل اعتماد فیصلہ ہوتا۔

میں اعداد و شمار میں ضروری حد تک نظر ثانی کے حق میں ہوں لیکن اگلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں جس کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اس نظر ثانی کا نتیجہ یہ ہوا ہے

کہ پچھلے ۲۰ سال میں ملک کی پیداوار کے مختلف شعبوں میں جو بھی اضافے ہوئے ہیں اور وہ قومی آمدنی کے حساب میں ریکارڈ نہیں ہو رہے تھے اب وہ ریکارڈ ہونے لگے۔ جو رپورٹ اس وقت میں نے پڑھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جی ڈی پی اس بناء پر نہیں بڑھا کہ پیداوار بڑھی ہے بلکہ اس بناپر کہ وہ پیداوار جو قومی آمدنی کے حساب میں شامل نہیں کی جارہی تھی اسے صرف شامل کیا گیا ہے۔ تو یہ جو اضافہ جی ڈی پی میں نظر آرہا ہے یہ کوئی نیا اضافہ نہیں ہے۔ یہ کوئی پالیسی اضافہ نہیں ہے یہ صرف غیر مشمولہ معلومات کو ریکارڈ میں لانے کا نتیجہ ہے۔ اس کی بناء پر بڑے اہم الجھاؤ ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کی جی ڈی پی اور ادائیگیوں کا تناسب یا جی ڈی پی اور مالی خسارے کا تناسب بدل گیا ہے۔ تبدیلی کی وجہ کوئی مالیاتی نظم نہیں بلکہ محض بنیاد اور تناسب کے حساب کتاب کرنے سے تبدیلی آئی ہے۔ یہ ساری چیزیں قابل توجہ ہیں۔ جناب والا! میں نہیں چاہتا کہ اس گفتگو کو تعلیمی لیکچر کی شکل دے دوں لیکن بہر حال معاشی تجزیہ کے لیے ان چیزوں کو پیش نظر رکھنا ضروری اور اہم ہے۔

غربت کی سطح: جناب والا! اعداد و شمار ہی کے حوالہ سے دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غربت کی سطح کے بارے میں جو بات حکومت کی جانب سے کہی جارہی ہے اس نے تمام اعتبار کھو دیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء میں اور پھر ۱۹۸۰ء میں غربت کی سطح ملک میں کم ہوئی ہے۔ ۱۹۹۹ء میں اور ۲۰۰۰ء میں بد قسمتی سے یہ بڑھی ہے۔ سرکاری طور پر یہ بات کہی گئی کہ ۰۲-۲۰۰۱ء کے جو اعداد و شمار آئے ہیں وہ ۳۲ فیصد ہیں اور اس کے بعد اس وقت کے وزیر خزانہ اور اس وقت کے وزیر اعظم نے یہ اعلان کیا کہ ہمارے ایک محدود سروے کی روشنی میں اس میں ۴ فیصد کمی ہوئی ہے اور اس طرح غربت اب ۳۲ فیصد سے کم ہو کر ۲۸ فیصد[1] پر آگئی ہے۔ جناب والا! یہ ایک انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور بلاثبوت بات تھی۔ حقیقت یہ

---

[1] پلاننگ کمیشن کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ۲۴٫۳ فیصد لوگ (ماہانہ ۳۲۵۰٫۲۸ روپے ایک بالغ کی آمدن کے حساب سے) خطِ غربت سے نیچے ہیں۔ یعنی فیصدی عدد میں بظاہر کمی آئی ہے لیکن آبادی کے بڑھنے سے غریب لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جو اس وقت تقریباً ۵ کروڑ بنتے ہیں۔ (پاکستان اکنامک سروے ۲۰-۲۰۱۹ء)

ہے کہ غربت کی سطح میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور جس طرح کے معاشی حالات رہے ہیں اس میں کمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں اس کا ثبوت دینا چاہتا ہوں کہ منصوبہ بندی کمیشن نے مئی ۲۰۰۵ء میں درمیانی مدت کے لیے جو ترقیاتی ڈھانچہ دیا اس میں غالباً صفحہ ۱۳ / ۱۴ کے اوپر کہا گیا ہے کہ اس وقت غربت کی سطح آبادی کا تہائی / ۳۳ فیصد تھی، یہ منصوبہ بندی کمیشن کی دستاویز کہہ رہی ہے۔ آپ نے پچھلے سال کے اقتصادی جائزہ میں اپنے نام نہاد اسمبلی سروے کا بہت شور مچایا تھا لیکن اس سال کا اقتصادی جائزہ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ سیکشن کا عنوان ہے ترقی کی تقسیم اور غربت، لیکن پورے سیکشن میں تقسیم کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ غربت کا باب پڑھ لیجیے۔ سات صفحے ہیں۔ ان سات صفحوں میں سے چار صفحوں کے اندر صرف یہ دیا گیا ہے کہ ہم نے ایک سروے کیا ہے اور اس کے اندر ہماری غربت میں کمی کے بارے میں یہ حکمت عملی ہے۔ باقی تین صفحوں میں جو ایک اور سروے کیا گیا ہے۔ اس کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں اور اس کی بنیاد پر یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے کتنے افراد ایک کمرے کے مکان میں رہتے تھے اب کتنے ہیں۔ پہلے ایک کمرے والے دو کمروں میں آگئے ہیں۔ تین میں آگئے ہیں چار میں آگئے ہیں اور اس کی بناء پر کہا گیا ہے کہ یہ اشارے ہیں کہ غربت کم ہوئی ہے۔ جناب والا! غربت کے کم ہونے کے مطالعہ کا یہ کوئی نظام نہیں ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہاؤسنگ کے بارے میں جو بات پیش کی جارہی ہے یہ بھی میری نگاہ میں مشکوک ہے۔ وقت نہیں ہے ورنہ میں تفصیل سے بتاتا۔ ہاؤسنگ کے سلسلے میں اگر آپ منصوبہ بندی کمیشن اور اقتصادی سروے دونوں کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو کنسٹرکشن انڈسٹری کے حوالہ سے واضح ہے کہ تعمیراتی سرگرمیاں نیچے گئی ہیں۔ اس تعمیراتی سرگرمی میں ناممکن ہے کہ آپ کے دعوے کے مطابق نئے مکان بنے ہوں یا یہ ہوا ہو کہ ایک کمرے والے لوگ دو کمروں میں اور دو کمرے والے چار کمروں میں اور چار کمروں والے پانچ کمروں والے گھروں میں چلے گئے ہوں۔

دوسری بات جو محنت مزدوری کا جائزہ (لیبر سروے) آیا ہے اس کا مطالعہ کریں۔ میں

نے اس کا تجزیہ کیا اور مجھے دیکھ کر تعجب ہوا ہے کہ تعمیراتی صنعت میں محنت کشوں کے تناسب میں کمی ہوئی ہے، اضافہ نہیں ہوا۔ دوسری جانب دیکھیے کہ غربت میں تخفیف کے لیے اوسط ترقیاتی شرح جی ڈی پی کا ۶ فیصد سے زیادہ ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں بھی جس عرصہ میں جی ڈی پی کی اوسط ترقیاتی شرح ۶ فیصد سے زیادہ ہوئی ہے تو اس وقت غربت کم ہوئی ہے، لیکن گذشتہ چھ سال کا موازنہ کیجیے تو اس کا اوسط ۸ء۴ فیصد آتا ہے۔ ایسے میں مجھے سمجھا دیں کہ غربت میں کمی کیسے ممکن ہے۔ پھر آپ دیکھیے کہ حقیقی اجرت کے سلسلے میں لیبر سروے کے جو اعداد و شمار ہمارے سامنے آئے ہیں ان کی رو سے قوت خرید کی مناسبت سے حقیقی اجرت میں کمی ہوئی ہے۔ اگر حقیقی اجرت کم ہوئی ہے تو پھر غربت میں کمی کیسے ممکن ہے۔ کم سے کم قیمتوں کے بارے میں بھی اسی لیبر سروے (۲۰۰۴ء) سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ عام مزدوری کرنے والے اور ۱۴ فیصد باقاعدہ محنت کش بھی کم از کم مقررہ اجرت سے کم کما رہے ہیں۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر اجرتوں کے بارے میں آپ کے یہ اعداد و شمار ہیں تو اس کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ غربت کم ہوئی ہو۔ یہی بات عام آدمی بھی کہہ رہا ہے کہ غربت کم نہیں ہوئی ہے، غربت بڑھی ہے۔ حقیقت یہی ہے لیکن آج اس معاملے میں جو اعداد و شمار آپ دے رہے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔

بے روزگاری: ایک اور پہلو بیروزگاری کا ہے۔ یہاں میں بڑے دکھ سے کہنا چاہتا ہوں کہ وزیراعظم صاحب جن کا بینکنگ اور فنانس کا بڑا تجربہ ہے اور میں ان کو ایک سنجیدہ آدمی سمجھتا ہوں، وہ بھی اس چکر میں آ گئے ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ پچھلے دو سال میں بے روزگاری میں ایک فیصد سے زیادہ کمی آ گئی ہے۔

جناب والا! جب میں نے اسی لیبر سروے کی تفصیلی جانچ پڑتال کی ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ روزگار میں ۱ء۱ ملین کا اضافہ بلا اجرت گھر میں کام کرنے والوں کی تعداد شامل کرنے کی وجہ سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ کونسا اضافہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ

روزگار میں جس قدر اضافہ آپ بتارہے ہیں یہ اس کا حصہ نہیں ہے اور اس صورت میں لیبر فورس میں سالانہ اضافہ کو پیش نظر رکھا جائے توروزگار میں اضافہ کی شرح اس سے کم ہو جاتی ہے۔ آپ ان چیزوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی ان کو پڑھے گا نہیں یہ وہ چیز ہے جس بنا پر آپ کا اعتبار ختم ہو رہا ہے۔

آپ نے اور اقتصادی مشیر نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کم ہو گئے ہیں۔ میں نہیں کہتا وہ جھوٹ بول رہے ہیں، لیکن جو انہوں نے کہا وہ یہ ہے کہ چھ سال قبل کے اعداد و شمار سے موازنہ کر کے اسے کم قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ اس چھ سال کے دوران اتار چڑھاؤ کے بعد گذشتہ سال کے اعداد و شمار سے موازنہ کیا جائے تو حقیقت میں یہ بڑھ گئے ہیں، اگر آپ غلط بنیاد پر موازنہ کریں گے تو یہ لوگوں کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

مرکزی شماریاتی دفتر کی خودمختاری: اسی تسلسل میں جناب والا! میں آٹھویں تجویز یہ پیش کروں گا کہ صورتحال کو درست کرنے کے لیے پانچ چھ سال پہلے آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مرکزی شماریاتی دفتر کو خودمختار ادارہ بنائیں گے، جس میں پارلیمان کا دخل بھی ہو اور پیشہ ورانہ اہلیت بھی ہو اس کا اہتمام کیجیے اس کی خود مختاری کے لیے ضروری ہے کہ اسے حکومت اور وزارت خزانہ کی گرفت سے چھڑوایا جائے۔ اس طرح شماریاتی افسر صحیح اعدادوشمار دے سکے گا۔ اسٹیٹ بینک کی خود مختاری کے بعد اسٹیٹ بینک کی کارکردگی بہتر ہوئی اور بینک کی رپورٹس کا معیار بہتر ہوا۔ ہمیں ایک متبادل نقطہ نظر بھی ملنا شروع ہوا ہے اہم چیز میری نگاہ میں یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی نظام ہونا چاہیے کہ وزارت خزانہ اقتصادی سروے تیار نہ کرے بلکہ کوئی ایسا ادارہ ہو جو آزادانہ اعداد و شمار تیار کرے اور پالیسی تجزیہ کر کے صحیح صورتحال قوم کے سامنے رکھ سکے۔

مبسوط وسیع استحکام(Macro Economic Stability)کے عوامل: نویں تجویز یہ ہے کہ مالیاتی نظم وضبط جو معیشت کے استحکام کے لیے آپ کا سب سے اہم منصوبہ تھا۔ اس پر نظر ڈالیے۔ میکروMacroاستحکام کو اگر میں عام الفاظ میں بیان کروں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) بجٹ کا خسارہ کم ہونا چاہیے۔ (۲) بیرونی خسارہ کم ہونا چاہیے اور (۳) افراط زر کم ہونا چاہیے۔

یہی واشنگٹن اتفاق رائے (Washington Consensus) کے بنیادی اہداف ہیں۔ لیکن مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سال رواں کے جو حقائق ہمارے سامنے آئے ہیں اور آنے والے سال میں جو خطرات ہیں، اس میں یہ تینوں پہلو موجود نہیں ہیں۔ اس حوالہ سے میری نگاہ میں خطرات اگر کسی قدر حد کے اندر ہیں تو بھی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ اسے آج ایک کل وقتی وزیر خزانہ میسر نہیں ہے، میں آپ کے نوجوان وزیر مملکت کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کو کل وقتی وزیر خزانہ کی ضرورت ہے۔ یہ ایک سانحہ ہے کہ نہ یہاں کل وقتی وزیر خزانہ ہے، نہ ہی کل وقتی وزیر اعظم اور نہ کل وقتی سربراہ فوج ہے اور نہ کل وقتی صدر مملکت ہے۔ جناب والا! ترقی کی جانب رخ پچھلے ایک سال میں آیا ہے اور میری نگاہ میں خوش کن ہے۔ ہم پہلے اسیر تھے اوپری استحکام کے، اب ہم اس سے کچھ کچھ نکلے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ کام ہم نے صحیح سوچ بچار اور جامع حکمت عملی کے نتیجہ میں نہیں کیا ہے۔ تحقیقی پالیسی سازی نہیں ہوئی ہے مالیاتی پالیسی کہیں گئی اور ہمہ جہتی پالیسی کہیں اور گئی ہے، ان میں صحیح ہم آہنگی بروقت نہیں ہوئی، جو میری نگاہ میں افراط زر کی بھول بھلیوں کا بھی بڑا سبب ہے۔ حقیقت میں افراط زر غیر مستحکم ہے۔ جب تک ایک مربوط پالیسی نہیں ہو گی تو آپ کی ترقی کو افراط زر کھا جائے گا۔ اسی بناء پر عوام کے لیے جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں وہ بے پناہ ہیں۔

زراعت پر توجہ: جناب والا! اس وقت قومی معیشت کے حوالہ سے جو بڑے مسائل درپیش ہیں، اور یہ وہ مسائل ہیں جن پر میری نگاہ میں بجٹ میں توجہ مرکوز نہیں کی گئی اور اگر کی گئی ہے تو سرسری توجہ دی گئی، ان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ کیا موجودہ ترقی کی شرح مستحکم ہے، کاش ہو! لیکن جو حقائق اور پالیسیاں ہیں ان میں مجھے یہ مستحکم نظر نہیں آئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ملکی معیشت میں سب سے بڑا حصہ زراعت کا ہے۔ زراعت میں آب و ہوا اور موسمی عوامل کا تناسب اثر انداز ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس سال یہ عوامل

سازگار رہے ہیں تو کیا آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ آج آپ اسے کس طرح قائم رکھ سکیں گے۔

بچت کی شرح: میں ایک اور سوال اٹھاتا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ حکومت میں جو پیشہ ور ماہرین ہیں وہ اس پر غور کریں گے۔ سوال ملک میں ترقیاتی شرح کے بڑھنے کے لیے بچتوں کی شرح اور سرمایہ کاری کی شرح سے متعلق ہے۔ اگر بچتوں کی شرح نہ بڑھے تو ترقیاتی شرح کو کیسے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچت کی شرح پچھلے دو سال میں جی ڈی پی کے تناسب سے ۳ فیصد کم ہوئی ہے۔ سرمایہ کاری کی شرح جی ڈی پی کے تناسب میں ۵ء۱ فیصد کم ہوئی ہے، اور یہ اس سطح سے بہت کم ہے جو خود ماضی میں ہم نے حاصل کی ہے۔ اگر آپ باقی ترقی یافتہ ممالک سے موازنہ کریں تو وہ تمام ممالک جنہوں نے ترقی کی شرح کو برقرار رکھا ہے، ان کے ہاں بچتوں کی شرح اور سرمایہ کاری کی شرح ۲۰ سے ۲۴ فیصد اور چین میں ۳۰ فیصد ہے لیکن آپ ۱۴ سے ۱۷ فیصد پر ترقی کی شرح کو کیسے برقرار رکھ سکتے ہیں[1]، میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ہاں ایک چیز ہو سکتی ہے کہ جسے ہم کہتے ہیں اضافوں کی فہرست کا تناسب اگر آپ اسے بدل دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن سارے حقائق یہ بتاتے ہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اگر یہ ہے تو پھر اس کو برقرار رکھنے کے لیے جب تک کہ بچتوں کی شرح اور ٹیکس، جی ڈی پی کی شرح بہتر نہ ہو تب تک ہم ترقی کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ خود اسٹیٹ بینک کی رپورٹ نے یہ بات کہی ہے کہ اگر یہ یہیں پر رہے گا تو ترقی کا عمل برقرار نہ رہے گا۔ یوں میں فنی طور پر یہ بات کرتا ہوں کہ ترقی کی موجودہ شرح مستحکم نہیں ہے جب تک کہ آپ بنیادی طریقہ کار تبدیل نہ کریں اور بنیادی تبدیلی آپ کی پالیسی میں نہ آجائے۔

غربت اور آمدنی کی تقسیم: اگلی تجویز غربت کے بارے میں ہے۔ غربت کا بہت گہرا تعلق آمدنی کی تقسیم سے ہے، روزگار کی پیدائش سے ہے، مالیاتی پالیسی اور امدادی اسکیم سے ہے، افراط زر سے ہے اور میں نے اس بجٹ میں ان چاروں میدانوں میں کوئی نیا اقرار نہیں دیکھا۔

---

[1] سال ۲۰۲۰ء میں بھی جی ڈی پی کے تناسب سے بچتیں ۹ء۱۳ فیصد رہیں اور سرمایہ کاری کی شرح ۴ء۱۵ فیصد تھی۔

مسائل پر سوچتے رہنے سے غربت میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ تخفیف غربت کے لیے جہاں ۶ فیصد سے زیادہ ترقی کی شرح برقرار رکھنا ضروری ہے وہیں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آمدن پالیسی ہو، غریبوں کی مدد کا نظام ہو اور روزگار کی پیدائش ہو۔ چھوٹا اور درمیانہ کاروبار آگے بڑھے۔ مجھے دکھ سے یہ بات کہنے دیجیے جناب چیئر مین! کہ ایس ایم ای (SME) کی تعریف بھی آج ہمارے یہاں متفقہ علیہ موجود نہیں۔ آرٹیکل ۲ میں کمپنیز ایکٹ کی آپ نے جو تعریف کی ہے اور دوسری جانب SMEDA اور ابھی سٹیٹ بینک نے حوالے سے جو رولز جاری کیے ان تینوں کی تعریف مختلف ہے۔ کم از کم تعریف ہی کی اصلاح کر لیجیے۔ اس کے لیے ترغیبات مہیا کیجیے۔

ایک بڑا اچھا اقدام یہ تھا کہ ایک طرف آپ اسے پانچ سے دس برس ٹیکس سے مستثنٰی رکھیں لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ جس طرح کپڑے کی صنعت کا شہر آپ بنا رہے ہیں، جس طرح برآمدی زون بنتے ہیں، آپ چھوٹی اور درمیانی صنعتوں کی بنیاد پر (SME) شہر قائم کیجیے۔ ان شہروں کے اندر سب سے اہم سہولت یہ دیجیے کہ حکومت ۲۵ برس کے لیے مفت لیز پر زمین دے گی اس شرط کے ساتھ کہ اگر دو سال کے اندر اندر آپ کام شروع کر دیتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم اس کو واپس لے لیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ دو سال کے اندر ایس ایم ای مراکز شروع ہو جائیں گے۔ ابھی جو لاہور میں ایس ایم ای کی کانفرنس ہوئی اس میں یہ بات ہمارے سامنے آئی ہے کہ ۸۷ فیصد ایس ایم ای قرضہ جو ہے وہ اداروں کو نہیں دیا گیا اور جو اداروں کو دیا گیا ہے (۱۴ فیصد) اس میں سے بھی نصف میرٹ کی بجائے سفارش پر ہے، یہ بات ان کی سرکاری رپورٹ میں ہے۔ میری نگاہ میں ایس ایم ای اور زراعت دو چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر آپ تخفیف غربت کی شرح کو برقرار رکھ سکتے ہیں لیکن اس کی کوئی پالیسی موجود نہیں۔

علاقائی عدم مساوات کا خاتمہ: پھر جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ علاقائی عدم مساوات ہمیں تباہ کر رہی ہے۔ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی علیحدگی میں علاقائی عدم

مساوات کا بڑا اہا تھ تھا۔ خدا کے لیے بر وقت اس کا نوٹس لیجیے۔ جو بھی پسماندہ ہیں ان کو آگے بڑھایئے اور ان کو معاش فراہم کیجیے۔ اس کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اس وقت اس کی کوئی پالیسی نہیں ہے۔ جناب والا! پلاننگ کمیشن کے، درمیانی مدت میں ترقی فریم ورک دستاویز کا آپ مطالعہ کیجیے اس میں پلاننگ کمیشن یہ کہتا ہے کہ ۶۵۰ ارب روپے سالانہ ضیاع ہیں، اس ضیاع کو کنٹرول کرنے کے لیے آپ نے کیا کام اور کیا اقدام کیا ہے؟ آپ لوگوں پر بوجھ بڑھا رہے ہیں اور انھی سے اور زیادہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں جو پہلے ہی بوجھ تلے پسے ہوئے ہیں۔ دوسری جانب آپ کا پلاننگ کمیشن کہہ رہا ہے کہ ۶۵۰ ارب روپے سالانہ ضیاع ہے لیکن اس کے لیے کوئی پالیسی موجود نہیں ہے۔

بیرونی ترسیلات زر کے لیے جامع پالیسی: ترسیلات زر کے بارے میں آپ بہت خوشیاں منا رہے ہیں کہ ان پانچ سال کے اندر پندرہ بلین ڈالر آیا ہے۔ بلاشبہ آیا ہے لیکن آپ نے کیا پالیسی بنائی کہ اسے کس طریقے سے حقیقی سرمایہ کاری میں لگایا جا سکتا ہے۔ کوئی پالیسی موجود نہیں۔ آپ نے سنہری موقع کو ضائع کیا ہے۔ آپ کشکول لے کر پھر رہے ہیں باہر، اور جو آپ کے گھر میں آرہا ہے اس کو آپ استعمال نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے نقصانات رونما ہو رہے ہیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر سماجی تناؤ پیدا ہو رہا ہے۔ کوئی پالیسی اس کے لیے موجود نہیں ہے۔

نجکاری کی پالیسی پر نظر ثانی: جناب والا! نجکاری جس طرح ہمارے ملک میں ہو رہی ہے، میں اس کے اوپر شدید بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہوں۔ اصولاً میں پرائیویٹائزیشن کے حق میں ہوں، لیکن پرائیویٹائزیشن کی پالیسی میری نگاہ میں بہت غور و فکر اور کلی نظر ثانی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ جس طرح ہمارے ملک میں نجکاری ہوئی ہے۔ خواہ موجودہ حکومت نے کی ہے یا اس سے پہلے کی حکومتوں نے وہ کسی جامع حکمت عملی پر مبنی نہیں ہے۔ میرا پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ ایک قومی بحث و مباحثہ اور قومی اتفاق رائے کی بنیاد پر پالیسی نہیں بنائی گئی ہے بلکہ ہر حکومت نے اپنے ذوق کے مطابق اور شاید مفادات کے دباؤ میں یہ کام کیا ہے۔ اس کا ثبوت ایشیائی ترقیاتی بینک کی وہ رپورٹ ہے جو اگرچہ اس وقت میرے پاس نہیں لیکن حافظے کی بنیاد

پر اس کا ما حصل پیش کر رہا ہوں کہ اس وقت جتنی نجکاری ہوئی ہے اس میں سے پانچواں حصہ ان اداروں کا ہے جن میں کارکردگی بہتر ہوئی ہے اور ملک کی معیشت کا حصہ بڑھ گیا ہے۔ تقریباً نصف ادارے وہ ہیں جہاں کارکردگی خراب ہوئی ہے۔ اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ باقی ۳۰ فیصد سے زیادہ صنعتیں بند ہو گئیں۔ انہیں زمینیں بیچ کر پیسہ بنالیا گیا ہے اور صنعتی پہلو سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں کہتا ہوں کہ نجکاری پالیسی پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔

پھر میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اس ملک کے کچھ انتہائی ضروری اثاثے ہیں ان اثاثوں کو غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں نہیں جانا چاہیے۔ مجھے خطرہ ہے کہ بھارت کے سرمایہ دار جو امریکہ میں یا جو انگلستان یا کسی اور ملک مثلاً کسی خلیجی ملک میں بیٹھے ہوئے ہیں اس راستے سے وہ ہمارے ملک کی معیشت میں در اندازی کی فکر کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے اس کا خیال کیجیے اور ہماری قومی اثاثوں کی جو چیزیں ہیں، جس میں، میں پی ٹی سی ایل کو بھی شامل کرتا ہوں، جس میں گیس اور تیل کو شامل کرتا ہوں، جس میں سٹیل کو شامل کرتا ہوں ان کی حفاظت کیجیے۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ نجکاری کے بارے میں پوری قوم کو اعتماد میں لینا چاہیے اور ساتھ ہی یہ چیز بھی کہ طویل مدتی پالیسی بنائیں۔ میں پی ٹی سی ایل کی مثال دیتا ہوں۔ پی ٹی سی ایل کی نجکاری ہم چھ سال سے سن رہے ہیں۔ پچھلے سال تو یہ کیفیت تھی کہ آج پرائیوٹائز ہوا کہ کل ہوا[1]۔ ابھی بھی یہ کیفیت تھی لیکن دوسری جانب اگر آپ تازہ بجٹ دستاویز نکالیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ بجٹ میں ٹیکس سے مبرا آمدنی میں منافع کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ پی ٹی سی ایل کا ہے۔ اب منافع آمدن اس کے علاوہ کہاں سے آئے گی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طرف آپ نجکاری کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف اسی

[1] ۲۰۰۶ء میں پی ٹی سی ایل کی نجکاری کر دی گئی جس کے بعد متحدہ عرب امارات کی کمپنی اتصالات ۲۶ فیصد حصص کے ساتھ انتظامی کنٹرول کی حقدار قرار پائی۔ معاہدہ کی مختلف شرائط پر عمل درآمد کے حوالہ سے تنازعات ابھی (۲۰۲۰) تک حل طلب ہیں۔

ادارے کی آمدنی میں سے رقوم بجٹ میں مہیا کر رہے ہیں۔ ایک بڑا پرانا شعر ہے ؎

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

خود انحصاری: حقیقی ہدف : خود انحصاری ہمارا ایک بڑا ہی بنیادی مسئلہ ہے۔ جناب والا! خودانحصاری محض قرضوں کی کمی کا نام نہیں۔ خودانحصاری نام ہے اس بات کا کہ آپ کی پوری معاشی پالیسی آپ کی صنعت، آپ کی زراعت، آپ کی خدمات ایسی صورت میں ہوں کہ جس میں فیصلہ سازی کی ترجیحات قوم خود طے کر سکے۔ وہ کسی بیرونی دباؤ اور تناؤ کی بنیاد پر نہ ہو بلکہ حقیقی خودانحصاری کی بنیاد پر ہو۔ اس خود انحصاری کی طرف کوئی پیش قدمی مجھے نظر نہیں آرہی۔ ہمارا انحصار بڑھ رہا ہے، پالیسی سازی کے اندر بھی اور مالیات کے معاملات کے اندر بھی۔ درحقیقت جب تک آپ خود انحصاری کی طرف نہیں آئیں گے اور اس کو بنیادی پالیسی مقصد بنا کر کے مطمع نظر نہیں ٹھہراتے آپ کی آزادی بھی خطرات کا شکار رہے گی۔

میں جو باتیں کر رہا ہوں اس کا حاصل صرف اسی طرح ممکن ہے کہ حکومت اپنی معاشی پالیسی میں انقلابی تبدیلیاں لائے۔ میں طریقہ کار کی تبدیلی کی بات کر رہا ہوں طریقہ عمل کے اندر رہتے ہوئے تبدیلی کی بات نہیں کر رہا ورنہ اس وقت جو بجٹ آپ نے دیا ہے اگر ایک جملے میں اسے بیان کر کے اپنی بات کو ختم کروں تو جناب والا! وہ یہ ہے کہ یہ بجٹ امیروں کی جانب سے، امیروں کا اور امیروں کے لیے ہے۔

(۱۰جون ۲۰۰۵ء)

قومی بجٹ میں دفاعی اخراجات کی تفصیلات
اور پارلیمنٹ کا کردار

پاکستانی سیاست کا ایک اہم عنوان سول ملٹری تعلقات ہیں۔ ان تعلقات کے حوالہ سے ایک اہم موضوع قومی بجٹ میں دفاعی اخراجات کی پیشکش اور پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر خورشید احمد نے اپنی سینیٹ تقاریر میں متعدد بار اظہار خیال کیا ہے۔ اس باب میں ان کی تین مختلف تقاریر کو مرتب کر کے پیش کیا جارہا ہے۔

جناب چیئر مین ! سب سے پہلے تو میں اس ہاؤس کو یہ یقین دلاؤں گا کہ ملک کے دفاع کی ہر حقیقی ضرورت کو پورا کرنا ہمارا فرض، ہماری ذمہ داری اور ہماری سعادت ہے۔ اس بارے میں، میرے اور میرے ساتھیوں کے ذہن میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ قوم اپنا پیٹ کاٹ کر دفاع کے لیے جو کچھ دے وہ حقیقی دفاعی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ اسے خود اپنے ملک کے لوگوں کو فتح کرنے اور ہلاک کرنے کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ فوج کو بیرونی جنگ سے، جو ہماری جنگ نہیں، دور رکھا جائے۔ اس جنگ کے سبب اپنے ملک کے شہریوں یا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے ان کی خدمات کی بناء پر امان دی، اپنا حصہ بنایا ہو، ہدف نہیں بننا چاہیے۔ ہمیں مجرم اور معصوم میں فرق کرنا ہو گا اور یاد رکھنا ہو گا کہ بغیر جرم ثابت کیے مجرم کو سزا دینا، انصاف اور سلامتی کے تقاضوں کے صریحاً خلاف ہے۔ معصوموں کو بے دریغ آنکھیں بند کر کے اور بلا امتیاز ہدف بنانا ظلم کی ایک بدترین شکل ہے۔

آج دنیا میں تشدد کے خلاف جنگ کے نام پر امریکی قیادت جو ظلم اور ناانصافی کر رہی ہے، ہم اس میں آلہ کار بن رہے ہیں اور اگر ہماری قوت، صلاحیت اور وسائل اس کے لیے استعمال ہو رہے ہیں تو دفاع کے نام پر اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

جناب والا! میں دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بلاشبہ دفاع کے بجٹ میں کچھ پہلو ایسے ہوں گے جنھیں صیغہ راز میں رکھنا چاہیے اور ہم بھی اسی طرح ان رازوں کا دفاع ضروری سمجھتے ہیں جس طرح کوئی بھی دوسرا ادارہ اور ذمہ دار افراد سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دفاع کے پورے بجٹ کو ایک مقدس گائے بنا دینا اور محض ایک سطر دے کر ۲۲۳ بلین روپے منظور کروالینا درست نہیں ہے۔ اس کے حساب کتاب کے لیے ایک دستوری نظام ہے اور اس پر عمل ہونا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ فوج کا اپنا نظام ہے۔ یہ دلیل درست نہیں ہے اس طرح تو ہر ایک ادارہ کا اپنا نظام ہو سکتا ہے۔ درحقیقت انٹرنل آڈٹ تو ہر ادارے میں ہوتا ہے، لیکن ہم کبھی اس انٹرنل آڈٹ پر قانع نہیں ہوتے ہیں بلکہ بیرونی آڈٹ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی، اے جی پی آر اور پارلیمانی کمیٹی کا حق ہے اور یہ ان کا فرض بھی ہے کہ ان کے سامنے دفاعی بجٹ بھی آئے۔

جناب والا! پارلیمنٹ کا یہ حق ہے کہ دفاعی نقطۂ نظر سے فوری اور مستقبل کے لیے منصوبوں اور مقابلتاً خاص طور پر جو بیرونی ملک خریداریاں ہیں، ان کے بارے میں حکمت عملی اس کے سامنے ہو۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایف سولہ طیاروں کے سلسلے میں امریکہ نے کس طرح سے وعدہ کیا اور پھر اس کی خلاف ورزی کی۔ انھوں نے ہم سے پیسے بھی لیے اور پھر طیاروں کی ڈیلیوری روک لی گئی۔ کئی سال روکنے کے بعد ہم سے ہمارے جہازوں کے گوداموں کے اخراجات لیے اور اس کے بعد ایک بار پھر مکر گئے۔ اگر آج ہم دوبارہ ایف سولہ کے لیے آرہے ہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ہمیں جہاز دے گا۔ ہم نے ان سودوں میں ٹیکنالوجی ٹرانسفر کے لیے کیا کیا ہے؟ یہی امریکہ ہے جس نے ایف سولہ کی ۱۰۰ فیصد ٹیکنالوجی اسرائیل کو ٹرانسفر کر دی ہے۔ اس کا ایک حصہ ترکی کو بھی ٹرانسفر کر چکا

ہے۔ اس نے بھارت کو پیشکش کی ہے کہ وہ F-18 اور F-16 کی ٹیکنالوجی ٹرانسفر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس صورت حال میں ہماری کیا پوزیشن ہے ؟ یہ وہ سارے بنیادی مسائل ہیں جنہیں پارلیمنٹ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ محض کوئی سیاسی پوائنٹ اسکورنگ نہیں ہے۔ ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

جناب والا ! اس کے ساتھ ہی آپ کے سامنے یہ بات آنی چاہیے کہ دفاع کے بجٹ میں پچھلی مرتبہ جو رقم رکھی گئی تھی، اس سے ۲۲ بلین روپے زیادہ خرچ ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس تخفیف آبادی و غربت پروگرام میں ۲۷۸ ملین روپے رکھے گئے تھے۔ لیکن اقتصادی جائزے میں جو دس مہینوں کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ صرف ۱۹۱ ملین روپے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ صرف غربت کے خاتمے کے پروگرام کو نقصان پہنچ رہا ہے جب کہ دفاع کے نام پر اضافی رقوم بے دھڑک لی جا رہی ہیں۔ یہ وہ ساری چیزیں ہیں جن پر دفاعی اداروں کا احتساب ضروری ہے۔ ان اداروں کو بھی پائی پائی کا حساب دینا ہو گا۔ اس سے فوج کے بارے میں اعتماد بڑھے گا۔ ورنہ فوج کی قیادت جس طریقے سے اپنے آپ کو ڈیفنس سوسائیٹیز تجارت اور دوسرے اداروں میں ملوث کر رہی ہے، اس کے نتیجے کے طور پر قوم کا اعتماد بہت بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

جناب والا ! فوج کا سیاست میں ملوث رہنا، دستور اور جمہوریت کی ہر صورت کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ سے فوج کو نقصان ہو رہا ہے۔ فوج وہ قوت ہے جسے پورے ملک کی محبتوں کا مرکز اور مکمل غیر متنازعہ ہونا چاہیے اور یہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی پارٹی نہ بنے۔ اگر فوج کا سربراہ سیاسی جلسوں میں جائے گا اور سیاسی پارٹیوں کی باتیں کرے گا اور یہ کہے گا کہ انتخابات میں فلاں گروپ کو منتخب کرو اور فلاں کو منتخب نہ کرو تو میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس فوج پر قوم اعتماد نہیں کر سکتی۔ در حقیقت اس فوج کے لیے اخراجات دینا ہمارے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ اس لیے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ فوج کے بجٹ میں ۲۰ بلین روپے کی کمی کی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کمی کو کارکردگی اور دفاعی صلاحیت کو

متاثر کیے بغیر روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک قومی سلامتی کونسل کا معاملہ ہے، ہماری پوزیشن اس پر واضح ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں دستوری ادارے سینیٹ، قومی اسمبلی، اور ان کی کمیٹیاں ہیں اور پھر کابینہ کی دفاعی کمیٹی ہے۔ یوں دستوری، قانونی اور انتظامی تینوں ادارے موجود ہیں۔ یہ ادارے اگر اپنی ذمہ داریوں کو صحیح، صحیح ادا کریں تو ہماری نگاہ میں کسی قومی سلامتی کونسل کی ضرورت نہیں ہے[1]۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ وہ کس طرح بنی، البتہ میں اس وقت صرف دو تین باتیں کہوں گا۔

پہلی بات یہ کہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ کونسل کا ادارہ ایکٹ کے تحت بنا ہے تو بھی ہماری نگاہ میں وہ دستور کی روح کے خلاف ہے۔ اس قسم کا کوئی سول ادارہ جس میں حاضر سروس جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا سربراہ اور تینوں فوجی سربراہ ممبر کے طور پر ہوں، ہماری نگاہ میں جمہوریت کی روح کے خلاف ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب یہ ادارہ موجود ہے لیکن آپ یہ دیکھیں کہ اس کو سیکورٹی کے لیے بنایا گیا، لیکن ہوا کیا ہے، مہنگائی کے مسئلہ سے لے کر مقامی حکومتوں جیسے بیسیوں معاملات پر سیکورٹی کونسل فیصلے کر رہی ہے۔ یہ تو کسی بھی طرح اس کے کام نہیں۔ اگر اسے فی الحقیقت سیکورٹی کونسل کا کام کرنا تھا تو جس طرح ہندوستان، امریکہ اور دوسرے ممالک میں ہے اسے تحقیق کا کام کرنا چاہیے۔ خطرات کو متعین کریں اور ان کی صورتحال کو جانچیں اور یہ کام کرنے کے بعد پھر سیاسی قیادت کو آگاہ کریں، یہ اس طرح کے ادارہ کا کام ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں یہ کام تو دور ونزدیک کہیں نہیں ہو رہا۔ اس کے برعکس میں ذمہ داری سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ سلامتی کونسل جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے ان کی ساری توجہ اس پر ہے کہ لوگوں کی وفاداریاں کس طرح

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: 'آئین کی حکمرانی: انحرافات اور بحالی کی جدوجہد'، مضمون کا عنوان ہے 'قومی سلامتی کونسل: ضرورت، ساخت اور آئینی حیثیت'، ص ۷۷

حاصل کرلیں، حتّٰی کہ مقامی حکومتوں کے انتخابات، کسے ناظم ہونا ہے یا نہیں ہونا، کون سی پارٹی ان کے ساتھ ملے، یہ وہ معاملات ہیں جن میں وہ ملوث ہیں۔ اس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ قومی سلامتی کونسل دستور سے بالا ایک غیر دستوری ادارہ ہے۔ حقیقی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے دستور، قانون اور انتظامی اعتبار سے ادارے پہلے ہی موجود ہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تیسری چیز جس طرح یہ ادارہ بنا وہ غلط ہے۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ وجود میں آنے کے بعد سے یہ سیکورٹی کے معاملات کی بجائے ان معاملات پر توجہ مرکوز کر رہی ہے جو اس کا مقصد نہیں ہے۔

جناب والا! اگر آپ سلامتی کونسل قانون کو پڑھیں تو اس قانون میں ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ یہ ایک مشاورتی ادارہ ہے۔ عملدرآمد کے لیے اپنی سفارشات پارلیمنٹ میں بھیجے گا۔ مجھے بتایا جائے کہ تشکیل کے بعد سے آج تک اس ادارے نے کیا کوئی ایک عام سفارش بھی پارلیمنٹ کو بھیجی ہے۔ اگر اس نے ایک بھی سفارش اس زمانے میں پارلیمنٹ کو نہیں بھیجی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری میں ناکام رہا ہے۔ ساتھ ہی آخری بات یہ کہ اس کا سٹاف مسلسل سیاسی کھیل کھیل رہا ہے، پارٹیوں اور لوگوں کو جوڑنے کا اور تقسیم کرنے کا خاص کر لوکل باڈیز میں۔ اس بنا پر ہماری تجویز ہے کہ اس کے بجٹ کو کم کیا جائے تاکہ اس کو وارننگ ملے کہ اگر اس نے کام کرنا بھی ہے تو اپنے دائرہ کار میں کرے اور اس سے باہر نہ جائے۔ (۱۳جون ۲۰۰۵ء)

-۲-

جناب والا! آپ جانتے ہیں کہ میں اس سے قبل بھی دوبار (۹۶-۱۹۸۵ء) سینیٹ کا ممبر رہا ہوں اور اب اس ایوان کی تشکیل نو کے بعد مجھے گذشتہ ۷ سال کے دوران بھی خدمت کا موقع ملا ہے۔ میں بڑے دکھ سے یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ اس ایوان میں

ہمارے کچھ سینیٹرز اپنی گفتگو کے ذریعہ محاذ آرائی اور جنگ کا سا نقشہ بنا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے ساتھ اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا ہے کہ میں بولنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں اور ایوان میں اس قسم کا میدان کارزار گرم ہوا ہو، مجھے بہت دکھ ہوا اور میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔

جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک بڑا اچھا قدم ہے کہ دفاعی بجٹ کی کچھ معلومات اس ایوان کے سامنے رکھی گئی ہیں، میں اس کو دو پہلوؤں سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ تاریخی اقدام سینیٹ میں لیا گیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ وزیر خزانہ اور قائد ایوان دونوں نے اس معاملے میں ایک بڑا اچھا کردار ادا کیا ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمیں جو دستاویز دی گئی ہیں، اس کو پڑھنے کے بعد جہاں مجھے خوشی ہوئی ہے کہ کچھ معلومات ہمیں دی گئی ہیں، وہیں یہ احساس ہے کہ یہ معلومات بہت ناکافی ہیں۔ اسی لیے میرے ذہن میں اقبال کا یہ شعر آیا کہ ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے، یہ رزاقی نہیں

یہ بدقسمتی ہے، میں یہ بات دکھ سے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے، کہ پاکستان کے میزانیوں میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک دونوں باتیں تھیں یعنی دفاعی بجٹ زیادہ تفصیلی ہوتا تھا، دستاویز اٹھا کر دیکھ لیجیے، زیادہ تفصیلات آتی تھیں۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء لگنے کے بعد یہ ہوا ہے کہ یہ تفصیلات پیش نہیں کی جاتیں۔

ہمیں سلامتی کے حالات کا اندازہ ہے اور اس بات کا احساس ہے کہ کچھ معلومات ایسی ہوتی ہیں جو حساس ہیں اور ان کو حساس رہنا چاہیے، انہیں باہر نہیں آنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوام کا کوئی ایک پیسہ بھی جہاں خرچ ہوتا ہے، اس پر نگرانی، احتساب اور اس کے خرچے کی اجازت یہ تمام عمل ہونا چاہیے۔ میں آپ کو یہاں پر

امریکہ کی مثال دینا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے امریکہ جتنا دفاعی بجٹ دنیا میں کسی اور ملک کا نہیں۔ دوسری جانب جمہوری اعتبار سے بھی بہر حال وہ ایک معروف جمہوری ملک ہے۔ چنانچہ وہاں پر ایک Budget Appropriation Committee ہے۔ اس کمیٹی میں دفاع کے تمام معاملات پر بحث ہوتی ہے۔ حتّٰی کہ ہر فورس کا جو جرنیل انچارج ہوتا ہے، وہ خود آتا ہے۔ وہ اپنی درخواست سامنے رکھتا ہے، بحث کرتا ہے، کمیٹی والے سوال کرتے ہیں اور پھر حتمی فیصلہ کرتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ ماضی میں وہاں یہ صورت حال نہیں تھی لیکن جن ہن ٹنگٹن صاحب کا، ان کی تہذیبوں کے تصادم پر کتاب کا آپ بار بار ذکر سنتے ہیں، ان کی ایک کتاب 'The Soldier and the State' فوج اور سول تعلقات پر بھی ہے۔ وہ ہارورڈ کا پروفیسر تھا اور اس نے اس کتاب میں خاص طور پر یہ دکھایا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں کس طرح فوج کا صدر سے براہ راست رابطہ ہو گیا تھا اور اس کے نتیجہ میں فوج کو ایسے اختیارات مل گئے جو اس سے پہلے امریکہ کی تاریخ میں کبھی نہیں ملے تھے۔

اس کے بعد پانچ سالوں میں امریکی پارلیمنٹ نے مرحلہ وار کچھ اقدامات کیے اور مؤثر طریقے سے فوج کے پورے نظام کو، فوج کی ضروریات کی حفاظت کرتے ہوئے دوبارہ سول نگرانی کے تحت لائے۔ ہم کوئی نئی بات نہیں کر رہے یہ ساری معلومات دنیا میں موجود ہیں، ان تمام تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے فوج کی حقیقی ضروریات پوری ہونی چاہیں۔ جہاں سلامتی سے متعلق حساس معاملات مخفی رہنے چاہییں، وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ محض ایک کی بجائے چار لائنیں نہیں، میں دہراتا ہوں کہ ایک کے بجائے چار لائنیں نہیں بلکہ مناسب، ضروری تفصیل سامنے آنی چاہیے، اس پر گفتگو ہونی چاہیے اور گفتگو اس اعتبار سے ہونی چاہیے کہ اس ملک کی سلامتی کے تقاضے کیا ہیں اور فوج میں پیشہ ورانہ مزاج پیدا کرنے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ٹیکنالوجی کا جو دور ہے، اس ٹیکنالوجی کے دور میں افرادی قوت اور ٹیکنالوجی میں کیا تناسب ہونا چاہیے، یہ اس جیسے سارے مسائل جو سیاسی

مسائل ہیں اور جن پر پارلیمنٹ ہی صحیح رہنمائی دے سکتی ہے اور ان پر فیصلے پارلیمنٹ کی راہنمائی میں ہی ہونے چاہییں۔

آپ دفاعی بجٹ کا دوسرا صفحہ نکالیں۔ اس کو دیکھیں تو اگرچہ یہاں ۸ آئٹم دیے گئے ہیں لیکن دراصل یہ صرف چار ہیں، باقی ان کی تشریح ہیں تو ہمیں صرف ایک کی بجائے چار لائنیں دی گئی ہیں۔ جناب! اگر اس کو موازنہ کریں تو ہمارے سامنے بڑی اہم بات آتی ہے۔ مثال کے طور پر آرمی کا پورا بجٹ ۱۲۳ء۳ بلین روپے ہے۔ اس میں تنخواہ دار ملازمین کا حصہ آدھے سے زیادہ ہے یعنی ۶۶ء۹ بلین روپے۔ اس کے بعد ۲۰ بلین روپے آپریٹنگ اخراجات ہیں۔ جو چیز سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے، وہ فزیکل اثاثے ہیں جو فوجی تیاریوں کی ٹیکنالوجیکل بنیاد ہے۔ اس مد میں صرف ۲۲ بلین روپے ہیں۔ آپ اس کا ایئر فورس سے موازنہ کریں۔

ایئر فورس کا بجٹ ۶۷ بلین روپے ہے۔ اس بجٹ میں ٹیکنالوجیکل برتری کے لیے جو وسائل ہونا چاہیے، وہ موجود نہیں ہے اور ٹیکنالوجیکل برتری، جو ایٹمی طاقت بننے کے بعد تبدیل ہونا چاہیے تھی کہ افرادی قوت کی ضرورت کم ہو اور ٹیکنالوجی زیادہ بڑھے اس کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ نیوی سے موازنہ کیجیے۔ بحریہ کا کل بجٹ ۵ بلین روپے ملازمین سے متعلق آرہا ہے، ۳بلین آپریشن سے متعلق ہے اور ۱۳ بلین طبعی اثاثے ہیں اور یہ صحیح ہے۔ آپ تقابلی انداز سے دیکھیے تو یہ درست ہے کہ بحریہ اور فضائیہ کی نسبت بری فوج کا حصہ جغرافیائی اور روایتی اعتبار سے بھی زیادہ ہونا چاہیے۔ لیکن آج کی دنیا میں فضائیہ اور بحریہ کی حیثیت بھی کم اہم نہیں ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد کے ابتدائی سالوں میں، گو ہم اس وقت بالکل ایک ابتدائی سطح پر تھے، بری، بحری اور فضائی افواج کے درمیان وسائل کا جو تناسب تھا، وہ ایک خاص طرح سے ہوتا تھا۔ البتہ اس کے بعد جتنے مارشل لاء کے دور رہے ہیں، ان میں تناسب کے اعتبار سے بری فوج کا حصہ بڑھتا گیا ہے۔ یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے اور ہمارے غور کرنے اور طے کرنے کی بات ہے۔ درحقیقت اگر بری فوج سیاسی فیصلہ سازی کر رہی ہو تو فیصلے معروضی

نہیں ہو سکتے اور نہ ہوا ہے۔

میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے سارے اہم معاملات پر نہ صرف پارلیمنٹ غور کر سکتی ہے بلکہ اس ضمن میں کمیٹی اور مختلف ماہرین سے پارلیمنٹ ماہرانہ رائے لے سکتی ہے، اس میں کسی کی مداخلت یا اختلاف مقصد نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کب اور کس طرح اس ملک میں سلامتی کے معاملات، خطرات کے تصورات اور آرمی کی پیشہ واریت کو زیر بحث لا کر معاملات کو طے کیا جائے۔ باقی مجھے اپنے دوستوں کی اس بات سے اتفاق ہے اور چاہے اس پر کوئی کتنا ہی برہم ہو ہم اسے واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جہاں فوج ہماری عزت اور اس ملک کی حفاظت کے لیے اہم ترین قوت ہے، وہیں فوج اس قوم کی ملازم اور دستور اور سول انتظامیہ کے ماتحت ہے۔

میں بڑے ادب سے ان لوگوں سے اختلاف کروں گا جو یہ کہتے ہیں کہ فوج نظریاتی دفاع کی ذمہ دار ہے۔ میں یہ بات صحیح نہیں سمجھتا، وہ سول حکومت کی خادم ہے اور یہ سول قیادت کا کام ہے کہ وہ ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی دونوں سرحدوں کی حفاظت کرے۔ اور حفاظت کے اس عمل میں سول ملازمین، فوج، عام شہری سب نے اپنے اپنے دائرہ میں کردار ادا کرنا ہے۔ یہ بات کہ آرمی کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ نظریاتی تحفظ کے نام پر جب چاہے مداخلت کرے اور جو چاہے تبدیلیاں لائے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آرمی کا کام اس نظام کے تحت کام کرنا ہے جو دستور نے ہمیں دیا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کی تائید کرتے ہوئے ان اہم مسائل کو اٹھاتا ہوں اور مطالبہ کرتا ہوں کہ اس بار جو کچھ ہوا یہ محض پہلا قدم ہے، آئندہ دفاعی بجٹ کے حوالہ سے زیادہ تفصیلات پارلیمنٹ میں آئیں، تفہیم کے ساتھ آئیں، دونوں ایوانوں میں آئیں اور ان پر کھل کر بات ہو۔ ان شاء اللہ اس سے خیر رونما ہو گا۔ (۱۷جون ۲۰۰۸ء)

-۳-

جناب چیئرمین! سینیٹ کی متفقہ سفارشات میں چار بنیادی اقسام ہیں۔ پہلی قسم کا تعلق قانونی اصلاحات سے ہے اور اس میں لفظی نہیں ٹھوس سفارشات دی گئی ہیں۔ دوسری کا تعلق بجٹ بنانے کے طریقے سے ہے۔ ہم اس بات کو بار بار کہہ رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ بہت مرکزی مسئلہ ہے کہ بجٹ بنانے کا طریقہ بدلنا چاہیے، اس میں پارلیمنٹ کی، دلچسپی رکھنے والے افراد کی مشاورت اور شرکت ہو۔ بہ نظر غائر سینیٹ بھی اور قومی اسمبلی بھی ان چیزوں کی جانچ پڑتال کریں۔ اس سلسلے کی جو سات آٹھ تجاویز سینیٹ نے دی ہیں، یہ بڑی بنیادی ہیں۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ حکومت اس معاملے میں ماضی کی حکومت کی طرح سہل انگاری سے کام نہیں لے گی بلکہ اس پر غور و فکر کرے گی اور جو دستوری اصلاحات کمیٹی بنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کو اس پر غور و فکر کرنا چاہیے کہ جن چیزوں میں دستور میں ترامیم کی ضرورت ہے، وہ بھی کی جائیں۔

دستوری ترمیم ایوان میں پیش کی گئی:

> The Senate of Pakistan recommends the budgetary allocation for Defence be frozen at the amount of revised budget for 2008-09.

جناب چیئرمین! ملک کا دفاع ہم سب کو برابر عزیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے دفاع کے باب میں ان مواقع پر بھی کہ جہاں پر ہمیں تحفظات ہیں جو مطالبہ اور جو ضروریات ہماری دفاعی افواج نے پیش کیں، اس قوم نے قربانی دے کر انہیں فراہم کیں۔ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ جہاں ہم فوج کے سیاسی کردار کے مخالف ہیں، اس سے ملک کو اور خود فوج کو نقصان پہنچا ہے، وہیں محض دفاع کی حد تک جو خدمات فوج نے انجام دی ہیں، اس پر ہمیں فخر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ فوج مکمل طور پر دفاعی معاملات میں اپنے آپ کو مصروف رکھے اور سیاست سے اپنا دامن مکمل طور پر بچا کر رکھے۔

دفاعی اخراجات

اس وقت جس بنا پر ہم نے یہ تجاویز پیش کیں اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہم اس بات پر زور دینا چاہ رہے ہیں کہ اس وقت فوج کو ایک ایسی آزمائش اور امتحان میں ڈال دیا گیا ہے جو ہماری نگاہ میں پاکستان کے مفاد کے مطابق نہیں ہے اور بیرونی دباؤ کے تحت یہ کام کیا جارہا ہے۔ ہم نے اس کی ہر سطح پر مذمت کی ہے، اختلاف کیا ہے اور اس موقع پر بھی اپنے اس اختلاف کو ریکارڈ کرانے کے لیے ہم یہ تجویز لارہے ہیں کہ ملک میں اس وقت جو مالی بحران ہے اس سے نکلنے کے لیے پہلی ترجیح اخراجات کو قابو میں کرنا ہے۔ آپ ٹیکس لگا کر لوگوں پر مزید بوجھ ڈال رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ٹیکس ضرور دینا چاہیے لیکن اس سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ جو آمدنی حکومت کے پاس آتی ہے، وہ کہاں پر استعمال ہورہی ہے؟ وہ صحیح استعمال ہو رہی ہے کہ غلط استعمال ہورہی ہے۔ جب تک آپ اخراجات کو قابو نہیں کریں گے مالیاتی نظم وضبط اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم نے تجویز دی ہے کہ غیر ترقیاتی اخراجات میں ۲۵ فیصد کمی کی جائے۔ اس سلسلے میں آپ دیکھیں کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ فوج میں آپ ۲۵ فیصد کمی نہ کریں لیکن کم ازکم اس کو ۰۹-۲۰۰۸ء کے اصل اخراجات پر منجمد کر دیں، جو میزانیہ میں مختص رقم سے کئی ارب روپے زیادہ ہے تو اس بنا پر میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ دفاع کا مسئلہ ہمارے لیے بہت اہم ہے لیکن دفاعی اخراجات کا استدلال اور مالیاتی نظم وضبط یہ بہت ضروری ہے۔

تیسرا نکتہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گو اب ایک سطر سے بڑھ کر ڈیڑھ صفحے کا دفاعی بجٹ ہمارے سامنے آرہا ہے لیکن ہم اس پر مطمئن نہیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دفاعی بجٹ اپنی تمام ضروری تفاصیل کے ساتھ صرف ان باتوں کو مخفی رکھتے ہوئے جو انتہائی حساس ہیں اور ان کے لیے بھی کمیٹی میں ان کیمرہ بات چیت ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے لیکن باقی تفاصیل قوم کے سامنے آنی چاہییں۔ اسی طرح پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے بھی تفصیلات آنی چاہییں۔ صرف ان کا اندرونی محاسب کافی نہیں۔ ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے

ہم یہ مختصر تجویز پیش کرتے ہیں تاکہ سینیٹ کے اراکین کے جذبات قوم کے سامنے آسکیں کہ ہم دفاع کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں لیکن دفاع کے نام پر جو اخراجات کیے جارہے ہیں ان سب کے بارے میں ہمیں معلومات نہیں ہیں اور اس لیے ہم تجویز کرتے ہیں کہ گو ہم اس پر کٹ نہیں لگارہے لیکن کم از کم اتنا ہم چاہتے ہیں کہ ۰۹-۲۰۰۸ء کی سطح پر اسے منجمد کردیا جائے۔

(۲۰جون ۲۰۰۹ء)

حصہ دوم

حصہ اول میں ۷ مختلف موضوعات کے تحت پاکستانی معیشت کے بنیادی مسائل کا جائزہ اور اسی حوالہ سے تجاویز شامل ہوئی ہیں۔ حصہ دوم میں ۰۵-۲۰۰۴ء سے لے کر ۱۱-۲۰۱۰ء تک پارلیمنٹ میں پیش کیے جانے والے قومی بجٹوں پر بحث کے دوران پروفیسر خورشید احمد کی تقاریر شامل کی گئی ہیں۔ کم و بیش ۸ سال کے اس عرصہ میں ملک میں سیاسی سطح پر بہت بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ اس دوران میں معیشت کا سفر کیسا رہا؟ اس ضمن میں سال بہ سال جائزہ اور صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز کے علاوہ اس حصہ میں شامل تقاریر کے مطالعہ سے یہ سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ کیا حالات کی تبدیلیوں کے تناظر میں حکومتی معاشی حکمت عملی اور پالیسیوں میں کوئی فرق واقع ہوا؟ اور اگر کوئی فرق آیا تو اس کی کیا نوعیت تھی۔

- قومی بجٹ (۰۵-۲۰۰۴ء): تبصرہ و تجاویز
- قومی بجٹ (۰۷-۲۰۰۶ء): تبصرہ و تجاویز
- قومی بجٹ (۰۹-۲۰۰۸ء): تبصرہ و تجاویز
- قومی بجٹ (۱۰-۲۰۰۹ء): تبصرہ و تجاویز
- قومی بجٹ (۱۱-۲۰۱۰ء): تبصرہ و تجاویز

قومی بجٹ (۰۵-۲۰۰۴ء): تبصرہ و تجاویز

قومی بجٹ کی پیشکش اور اس کی منظوری ایک سالانہ عمل ہے۔ بجٹ پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتاہے اور بحث و مباحث کے بعد پارلیمنٹ ہی سے اس کی منظوری ہوتی ہے۔ ۰۵-۲۰۰۴ء کے بجٹ کی پیشکش اوراس کی منظوری کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ پہلی بار سینیٹ میں بطور ایک ادارہ اس پر بحث ہوئی۔ سینیٹ نے اپنی بحث کے بعد تجاویز مرتب کیں۔

پروفیسر خورشید احمد نے بحث کے دوران دو مختلف مواقع پر اظہار خیال کیا۔ جبکہ بحث کے اختتام پر انہوں نے سینیٹ کی جانب سے مرتب کردہ تجاویز کا خلاصہ ایوان کی نمائندگی کرتے ہوئے پیش کیا۔ ذیل میں یہ تینوں تقاریر مرتب کر کے پیش ہیں۔

جناب چیئرمین! یہ اجلاس اس پہلو سے اہم ہے کہ سینیٹ کی تاریخ میں پہلی بار اپوزیشن کی موجودگی میں بجٹ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ گذشتہ سال اپوزیشن ایوان میں موجود نہیں تھی اور صرف حکومت کے ارکان نے بجٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اس پہلو سے میں اس سال کو بہت ہی اہم سمجھتا ہوں۔ بجٹ جن حالات میں پیش ہوا ہے اس کے کچھ پہلو ایسے ہیں جنہیں بجٹ پر گفتگو سے قبل سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔

سابقہ حکمت عملی کا تسلسل: پہلا یہ ہے کہ یہ موجودہ وزیر خزانہ کا پانچواں بجٹ ہے۔ تین بجٹ انہوں نے جنرل مشرف کی فوجی حکومت میں پیش کیے اور یہ دوسرا بجٹ مشرف-جمالی مشترک دور کا بجٹ ہے۔ اس پورے دور میں تسلسل اور وہ بھی خاص طور پر ایک خاص تصور کے تحت جسے ہم معاشی اصلاح میں مبسوط استحکام کہتے ہیں حکومت کے پیش نظر رہا ہے۔ یہ دراصل آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی معروف حکمت عملی ہے جس پر وہ تقریباً بیس پچیس

سال سے ساری دنیا میں کام چلا رہے ہیں اور جسے واشنگٹن اتفاق رائے کا نام دیا جاتا ہے۔ اس حکمت عملی میں اصل اہمیت افراط زر اور بجٹ خسارے کو کچھ حدود کے اندر رکھنا ہدف کے طور پر سامنے ہوتا ہے جبکہ معاشی سرگرمی کے لیے قواعد و ضوابط سے آزادی، نجکاری اور منڈی کی معیشت اس کے اہم پہلو ہیں۔

ہمارے ہاں اس پر عمل اس سے پہلے بھی ہوا ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ دنیا بھر میں جہاں بھی اس حکمت عملی پر کام ہوا ہے، اس کے نتیجے میں غربت اور بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے اور معیشت پر سرمایہ داروں کی گرفت مضبوط ہونے کے علاوہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر سماجی انتشار اور حتیٰ کہ انقلابات بھی رونما ہوئے ہیں۔ آپ نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات جوزف اسٹگلٹز کی کتاب (Globalization and its Discontents) پڑھیں۔ اس کتاب میں وہ کہتا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں اس پر عمل ہوا ہے ان میں کہیں بھی یہ حکمت عملی کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس اس نے مسائل زیادہ پیدا کیے ہیں۔

ہماری پہلی حکومتیں خواہ وہ پی پی کی ہوں یا مسلم لیگ کی، عمل انہوں نے بھی اس پر کیا لیکن ایک بے لاگ رائے کے طور پر میں یہ کہوں گا کہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ساٹھ ستر فیصد عمل کریں اور باقی معاملات میں چاہے انکار کر کے اور چاہے جھوٹی سچی کہانیوں کے ذریعے سے وہ اس پر عملدرآمد سے پہلو تہی کر لیں۔ اس کے برعکس مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے موجودہ وزیر خزانہ نے پوری دیانتداری اور تابعداری کے ساتھ اور تقریباً سو فیصد اس نسخے پر عمل کی کوشش کی۔ نتائج کیا نکلے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ پہلو ہے کہ حکومتوں کی تبدیلی کے باوجود اس حکمت عملی کا تسلسل اس زمانے میں بھی جاری ہے۔ جبکہ میری نگاہ میں ملک کی سب سے بڑی ضرورت اس مبسوط وسیع استحکام کے تصور سے اپنے آپ کو آزاد کر کے جو ہمارے حقیقی وسائل ہیں ان پر توجہ دینے کی ہے۔

ماہر معیشت کی حیثیت سے میں مبسوط وسیع استحکام کو غلط نہیں سمجھتا اسے پالیسی

مقاصد کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ لیکن خاص طور پر ساری توجہ محض اس پر مرکوز کر دینا اور دوسری اہم جہتوں کو نظر انداز کرنا، بہت بڑی غلطی ہے اور ہم آج بھی اس کی گرفت میں ہیں۔

موجودہ بجٹ کے بارے میں میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ اسی حکمت عملی کا تسلسل ہے لیکن میں انصاف نہیں کروں گا اگر میں یہ نہ کہوں کہ گذشتہ سال کے بجٹ کے مقابلے میں اس سال دو پہلوؤں سے ایک نیا رخ بھی اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واشنگٹن اتفاق رائے کے اندر پیداوار کی شرح اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن اس بجٹ میں مجھے نظر آرہا ہے کہ پیداوار اور سرمایہ کاری کی طرف ایک تبدیلی شروع ہوئی ہے جو خوش آئند ہے۔ دوسری چیز بجٹ کا فلاحی پہلو ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بجٹ میں ایک نسبتاً معمولی اور ناکافی سہی لیکن اس کی طرف ایک آغاز ہوا ہے۔ بلاشبہ اکثر حوالوں سے یہ زیادہ تر سابقہ نوعیت کا ہی بجٹ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان دو پہلوؤں سے اس میں تبدیلی کا کچھ آغاز نظر آتا ہے۔

بجٹ کے لیے تجاویز

میری نگاہ میں یہ بہت تبدیلی مختصر اور بہت تاخیر سے ہے۔ ضرورت دراصل اس ملک میں مثالی تبدیلی کی ہے جو ملک کے حقیقی وسائل پر مرکوز ہو۔ اس تناظر میں بجٹ کے سلسلہ میں میری تجاویز درج ذیل ہیں:

زراعت پر توجہ بڑھایئے: ملکی وسائل میں زراعت کا شعبہ آبادی کے ۶۵ فیصد کے لیے زندگی کی ضروریات کا انتظام کرتا ہے۔ یہ جی ڈی پی کا ۲۶ فیصد[1] حصہ ادا کر رہا ہے اور اس کی بنیاد کے اوپر ۶۰ فیصد سے زیادہ برآمدات کا انحصار ہے۔ اس کے باوجود زراعت ماضی میں

[1] آبادی اور ضروریات بڑھنے کے ساتھ اگرچہ زراعت کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے لیکن عدم توجہی اور دیرپا پالیسی کے فقدان کی وجہ سے بعد کے سالوں میں یہ شرح کم ہو کر اب ۱۹ء۳ فیصد [۲۰-۲۰۱۹ء] پر آگئی ہے۔

ہمارے ہاں سب سے زیادہ نظر انداز رہا ہے۔ لیکن میں اس پر سارا دوش آج کی قیادت کو نہیں دے رہا ہوں۔

جناب چیئر مین! آج پوزیشن یہ ہے کہ جو بجٹ آپ کے سامنے آیا ہے اس میں صرف سات ارب روپے خوراک اور زراعت کے پورے شعبے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اس سال کا کل بجٹ نو سو ارب روپے ہے، سات ارب روپے کے معنی یہ ہیں کہ زراعت کے لیے ہم نے ایک فیصد سے بھی کم وسائل رکھے ہیں۔ اگر اس میں ترقیاتی بجٹ کو بھی شامل کر لیں تو اکیس بلین روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے لیکن وہاں بھی صورتحال یہ ہے کہ اس اکیس بلین کا ۸۰ فیصد جاری اسکیموں کے لیے ہے اور باقی ۲۰ فیصد میں بھی صرف ۹۱ ملین روپے نئی اسکیموں کے لیے ہیں اور باقی ۲ء۱ بلین روپے ان اسکیموں کے لیے ہیں جو ابھی تک منظور نہیں ہوئیں۔ اور پتا نہیں کبھی ہوں گی بھی کہ نہیں؟ تو میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ نکتہ نظر میں جس تبدیلی کی ضرورت ہے اس کی بنیاد پر زراعت پر توجہ آنی چاہیے۔

اشرافیہ کی معیشت کی حوصلہ شکنی کیجیے: دوسری تبدیلی یہ درکار ہے کہ ہم اس سرمایہ دارانہ نظام سے نکلیں جس میں معاشی ترقی کے معنی محض ایک مخصوص اشرافیہ کو مالا مال کرنا اور دولت مند بنانا ہے۔ میں مشورہ دوں گا وزیر خزانہ اور خود گورنر سٹیٹ بینک[1] کو کہ وہ اپنی کتاب: "The Economy of an Elitist State" جو انہوں نے گورنر بننے سے پہلے لکھی تھی ذرا اس کا دوبارہ مطالعہ کر لیں۔ اور یہ دیکھیں کہ جس اشرافیہ کی معیشت پر دس سال پہلے آپ نے بھرپور تنقید کی تھی اور کہا تھا کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کس طرح ان پانچ سالوں میں ہم نے اس معیشت کو اور زیادہ جاگیر دارانہ بنایا ہے، اس سے آپ کس طرح نمٹ رہے ہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۶ء تک ڈاکٹر عشرت حسین سٹیٹ بینک کے گورنر تھے۔ اگست ۲۰۱۸ سے تادم تحریر وہ وزیر اعظم عمران خان کے ادارتی اصلاحات پر مشیر ہیں۔

میں صرف دو مثالیں آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ سٹاک ایکسچینج کے بارے میں ہم بڑی خوشیاں منا رہے ہیں اور میں بھی ایک معیشت دان کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ سٹاک ایکسچینج میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے جس سے لوگوں نے ٹریلین روپے کمایا ہے۔ جی ہاں! بلین نہیں ٹریلین کمایا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سٹاک ایکسچینج میں عام شہریوں کا حصہ بمشکل پانچ فیصدی ہے۔ بقیہ ۹۵ فیصد محض چند ہزار سرمایہ کاروں کا ہے۔ اس طرح دراصل وہ کروڑ پتی نہیں ارب پتی بن گئے ہیں کہ اٹھارہ سو سے بڑھ کر آپ کا انڈیکس ساڑھے پانچ ہزار سے اوپر چلا گیا ہے[1]۔ جائیداد کو آپ دیکھیں کہ اس میں قیمتوں میں دو سو سے تین سو فیصدی اضافہ ہوا ہے لیکن اس کا فائدہ اٹھانے والے بھی محض چند ہزار لوگ ہیں۔ دراصل اس طرح ہم ایک اشرافیہ کی معیشت کو مستحکم بنا رہے ہیں۔

چھوٹی صنعتوں کے لیے سازگار ماحول بنایئے: بڑی صنعتوں پر آپ بڑے نازاں ہیں کہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس شعبہ میں سترہ فیصدی اضافہ ہے۔ لیکن یہ اضافہ پہلی دفعہ نہیں ہوا ہے ماضی میں اٹھارہ اور بیس فیصدی اضافہ بھی ہوا ہے۔ لیکن میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ بڑی صنعتوں میں ایک روزگار پیدا کرنے کے لیے آپ کو کم از کم چار ملین روپے کی سرمایہ کاری چاہیے۔ جبکہ اس کے مقابلہ میں سمال انڈسٹری، میڈیم انڈسٹری اور کاٹیج انڈسٹری میں صرف ڈیڑھ لاکھ روپے کی سرمایہ کاری پر ایک روزگار پیدا ہو سکتا ہے گویا چھوٹی صنعتوں پر توجہ دے کر آپ پچاس گنا زیادہ روزگار پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن وہاں حال کیا ہے۔ وہاں چھوٹی صنعت کو آپ ۱۴، ۱۶، ۱۸ فیصد پر قرضے دیتے ہیں۔ جس چیز کو خرد مالیات آپ کہتے ہیں وہ خرد مالیاتی استحصال کا ایک بدترین ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اب اس کو کم کر کے آپ دس پر لائے ہیں۔ لیکن آپ ذرا غور کیجیے کہ بڑی انڈسٹری کے لیے بینکنگ سسٹم میں چار فیصدی سود پر قرض مل رہا ہے اور حقیقی صورتحال یہ ہے کہ یہ قرضہ عملاً دو اڑھائی فیصد پر مل

---

[1] موجودہ (مارچ ۲۰۲۱ء) انڈیکس ۴۴ ہزار سے زیادہ ہے۔

رہا ہے۔ سرکاری بینک اور جو ادارے آپ نے قائم کیے ہیں، خواہ وہ زراعت کے لیے ہوں، وہاں بھی شکل یہی ہے کہ چودہ اور سولہ فیصدی پر قرض ملتا رہا ہے۔ اب آپ اس کو ۹ فیصد پر لائے ہیں جو آج بھی مارکیٹ ریٹ سے تین گنا زیادہ ہے۔

یہی صورت چھوٹی صنعتوں کے شعبے کی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں مثالی تبدیلی کی ضرورت ہے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ہم چھوٹی صنعت کی تعریف بدلیں۔

ہمارے ہاں سمال انڈسٹری کی تعریف یہ تھی کہ اگر وہ بجلی استعمال نہ کر رہی ہوں، مشینی طریقے نہ ہوں، جس میں بیس افراد کام کر رہے ہوں اور جس کا ٹرن اوور (Turnover) پچاس ہزار ہو۔ یہ تعریف مضحکہ خیز تھی۔ یہ کبھی ۱۹۴۰ء میں مرتب ہوئی تھی اور آگے اس پر کام ہوتا رہا۔ اس تناظر میں اس حد تک تو آپ کی تعریف کرتا ہوں کہ آپ نے اسے پچاس ہزار سے بڑھا کر پچاس لاکھ روپے کیا ہے۔ یہ اچھا قدم ہے۔ لیکن میری نگاہ میں یہ قطعاً ناکافی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ابھی تک آپ اس ڈھانچے سے نہیں نکلے ہیں جس میں بدقسمتی سے ہم نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو ڈال رکھا ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں جناب والا! بھارت میں اس وقت ان کی پیداوار کا ۴۰ فیصد اور ان کی برآمدات کا ۴۴ فیصد چھوٹی صنعتیں فراہم کر رہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پچھلے چھپن (۵۶) سال میں چھوٹی صنعتوں کی تعریف کو کم از کم چھ بار بدلا ہے۔ اور ۹۶-۱۹۹۵ء میں جو تبدیلی کی ہے اس میں ٹرن اوور کو بڑھا کے تین کروڑ روپے کیا ہے، میری نگاہ میں پاکستان کے حالات کے اعتبار سے صحیح ۵۰ ملین روپے یعنی پانچ کروڑ روپے ہونا چاہیے[1]۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ روزگار کی فراہمی کے لیے چھوٹی صنعتیں دنیا کے ہر ملک میں ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ساری شہادتیں یہ بتاتی ہیں کہ عام صنعت جتنا روزگار پیدا کرتی ہے چھوٹی صنعت اس سے چار سے لے کر دس گنا زیادہ روزگار پیدا کرتی ہے۔ کارکردگی کے اعتبار سے وہ کسی سے

---

[1] SMEDA کی موجودہ تعریف کے مطابق ایسی صنعت جس میں ۲۵۰ تک افراد ملازمت کرتے ہوں، Paidup capital ڈھائی کروڑ روپے اور سالانہ فروخت ۲۵ کروڑ تک کی ہو تو، اس صنعت کو چھوٹی صنعت میں شمار کیا جائے گا۔

پیچھے نہیں۔ اس وقت میں یورپی یونین کی آپ کو مثال دیتا ہوں۔ یورپی یونین نے اس معاملے میں اپنے سامنے جو معیار رکھا ہے وہ یہ ہے زیادہ سے زیادہ پچاس افراد اس میں کام کرتے ہوں، زیادہ سے زیادہ ٹرن اوور ۷ ملین یورو اور بیلنس شیٹ ۵ ملین یورو ہو۔ یہی صورت امریکہ، چین، سنگاپور، تھائی لینڈ، برما، ان سارے ممالک کی ہے۔ ان کے اعداد میرے پاس موجود ہیں، ان تمام ممالک نے زمینی حقائق کو سامنے رکھ کے جو نمونہ مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ کم از کم پچاس افراد چھوٹی صنعت میں کام کر رہے ہوں۔ جہاں تک ٹرن اوور کی حد ہے پاکستان کے حالات کے اعتبار سے میری نگاہ میں یہ سطح ۵۰ ملین روپے ہونا چاہیے لیکن پہلے قدم کے طور پر میں سفارش کر رہا ہوں کہ ۵۰ کی بجائے آپ فی الحال اس کو ۲۰ ملین روپے تک کم از کم لے جائیں اور پھر آئندہ دو تین سال کے اندر اسے مزید بڑھائیں۔ اس کے علاوہ باقی تعریف بھی تبدیل کریں جن میں خصوصیت سے یہ سوالات ہیں کہ کتنے افراد اس میں ہو سکتے ہیں اور اس کا بنیادی سرمایہ کتنا ہو گا۔ میری نگاہ میں تو یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے لیے آپ پانچ سال مکمل ٹیکس فری اور اس کے بعد صرف فلسڈ رجسٹریشن ٹیکس لگا کر انہیں آپ موقع دیں۔

روزگار کے مواقع پیدا کرنے پر توجہ دیجیے: تیسری چیز اس مثالی تبدیلی میں روزگار پیدا کرنے کی اہمیت ہے۔ میرے دوست اسحاق ڈار نے روزگار کی بات کی۔ میں بھی آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ سرکاری اعداد و شمار کے اعتبار سے اس وقت ساڑھے تین ملین لوگ بے روزگار ہیں اور ان تین سالوں میں بے روزگاری میں اضافہ ۵ فیصد سے بڑھ کر پہلے سات ہوا اور اس سال کے جو اعداد و شمار ہیں وہ ۸ء۲ فیصد ہیں[1]۔ لیکن اعداد و شمار سے قطع نظر روزگار کی

---

[1] موجودہ بے روزگاری کے اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو وہ بظاہر کم ہیں۔ سال ۲۰۱۸ کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بے روزگاری کی شرح ۵ء۷۹ فیصد پر گئی ہے لیکن ۲۰۱۹ اور ۲۰۲۰ میں شرح بڑھنے کا خدشہ ہے کیونکہ ان دو سالوں میں ملک کی جی ڈی پی ۲۹ء۳ فیصد اور ۳۸ء۰ فیصد پر آ گئی ہے۔ پاکستان ادارہ برائے شماریات کے مطابق سال ۲۰۲۰-۲۱ء میں بے روزگاری کی شرح ۵۶ء۹ فیصد پر چلی جائے گی۔

تعریف بھی قابل توجہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر دس سال کی عمر سے زیادہ کا کوئی بچہ پندرہ دن میں ایک گھنٹے بھی دیہاڑی دار رہے تو وہ برسر روزگار قرار پائے گا۔ برسر روزگار کی اس سے زیادہ مضحکہ خیز تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ دنیا کا جائزہ لے لیجیے ہر جگہ روزگار کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ مکمل روزگار ایک چیز ہوتی ہے اور کمتر روزگار دوسری چیز ہوتی ہے۔ ہم نے دونوں کو جمع کر دیا ہے اور برسر روزگار اور کمتر روزگار سب کو ایک ساتھ رکھ دیا ہے۔ یہ غیر حقیقی اعداد و شمار ہیں۔

اعداد و شمار کی صحت یقینی بنائیے: جناب والا! میں یہ بھی کہوں گا کہ تعلیم اور صحت کی فراہمی اور غربت کو ختم کرنا، ہمارا اصل چیلنج ہے لیکن غربت بڑھی ہے کم نہیں ہوئی۔ سرکاری اعداد و شمار میں آپ غربت کم دکھا دیتے ہیں لیکن آزاد ماہرین معیشت کی رائے میں ۳۸ سے ۴۰ فیصد غربت رہی ہے۔ آپ کی طرف سے دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ پچھلے تین سال میں ۴ء۲ فیصد غربت کم ہو گئی ہے۔ کاش ایسا ہوتا! میرے پاس دستاویزات موجود ہیں کہ ۲ تاریخ (۲جون ۲۰۰۴ء) کو پاکستان آبزرور اور بزنس ریکارڈر میں وزیر خزانہ کا بیان موجود ہے کہ ہم نے نئے سروے کرائے ہیں اور بیروزگاری میں کمی ۲ فیصد ہے۔ اب محض دس دن کے بعد جو سرکاری اعداد و شمار آتے ہیں تو اعلان ہوتا ہے کہ ۲ فیصد نہیں ۴ء۲ کمی فیصد ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اعداد و شمار کو فرض نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا اس لیے کہ آپ کے پاس پیشہ ور ماہرین بیٹھے ہوئے ہیں لیکن بطور پروفیشنل میں یہ سوال اٹھاتا ہوں کہ سروے کا قاعدہ یہ ہے کہ سال میں چار مختلف شعبوں میں سروے ہوتے ہیں تاکہ اوسطاً بیانیہ نکالا جائے۔ آپ کا جو نمونہ (Sample) ہے وہ ۱۴۰۰۰ کا ہے جو مساوی تقسیم شدہ ہے شہری اور دیہی پر اور جو آپ نے سوالنامہ تیار کیا ہے وہ ایک انتظامی سوالنامہ ہے۔ بعد میں آپ نے سوالنامہ تبدیل کیا اور نمونہ کم کر کے آپ اس کو پانچ ہزار پر لے آئے۔ سب سے زیادہ اہم چیز یہ کہ سروے کے لیے ایک خاص عرصہ آپ نے منتخب کیا۔ عرصہ بھی وہ جس کے اندر گندم کی فصل کے بکنے سے سال بھر کی آمدنی ایک ہفتے یا چند دن کے لیے

کاشتکار کے پاس آتی ہے، اسے آپ نے منتخب کیا۔ یہ ساری چیزیں نظر انداز کر کے نتائج نکالنا پیشہ ورانہ طور پر درست نہیں ہیں اور ان کی بنیاد پر یہ کہنا کہ بے روزگاری میں ۲ء۴ فیصد کمی ہو گئی ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔

پھر ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ ملک میں زراعت، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ۶۵ فیصد روزگار اور جی ڈی پی کا ۲۶ فیصد دے رہا ہے وہاں پر آپ کا گروتھ ۴ فیصد ہدف کے مقابلہ میں صرف ۲ فیصد ہوا ہے یعنی آدھا اور دوسری جانب بیروزگاری میں اضافہ ہوا ہے ایسے میں غربت میں ۲ء۴ فیصد کمی کس طرح ہو گی۔ دنیا بھر کے معیشت دان اس پر متفق ہیں کہ محض شرح پیداوار سے غربت کم نہیں ہوتی جب تک یہ ترغیبی پالیسی نہ ہو اور جب تک کہ دولت کی تقسیم میں فرق میں کمی نہ لائی جائے، ان میں سے کوئی چیز نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اعداد و شمار کے بارے میں کم از کم صحیح ہونا چاہیے۔ تعلقات عامہ کا کام دوسروں کے لیے چھوڑ دیں، اس کے لیے ہم بجٹ کو استعمال نہ کریں۔

سماجی شعبہ کے لیے زیادہ وسائل مختص کیجیے: جناب والا! ذرا تعلیم اور صحت پر آپ غور کیجیے۔ صحت کی صورت یہ ہے کہ پچھلے ۱۵ سال سے صحت پر ہم جی ڈی پی کا کم و بیش ۷ء۰ فیصد دیتے رہے ہیں، تعلیم میں صورتحال اس سے زیادہ خراب ہے۔ آج سے دس سال پہلے ہم اپنے جی ڈی پی کا ۱ء۲ اور ۲ء۲ فیصد تعلیم پر دے رہے تھے۔ آج یہ کم ہو کر ۶ء۱ فیصد رہ گیا ہے۔ اگر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے آپ کو یہ بتاؤں کہ بنگلہ دیش جو ہمارا ہی ایک حصہ تھا اس کا اس سال کا بجٹ ابھی پرسوں ہی آیا ہے۔ اس کا آپ مطالعہ کریں تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ہمارا صحت کے لیے پورا فنڈ چھ بلین روپے کا ہے اور انہوں نے صحت کے لیے ۲ء۳۷ بلین ٹکہ رکھا ہے۔ ٹکہ اور روپیہ اس وقت تقریباً برابر برابر ہے، تھوڑا سا فرق ہے۔ تعلیم پر ہمارا کل فنڈ ۱۲ بلین روپے ہے جبکہ بنگلہ دیش میں یہ ۸ء۶۷ بلین ٹکہ رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں دیہی ترقی کی ایک شق ہے جس کے لیے ۳ء۳۷ بلین ٹکہ رکھا گیا ہے۔ میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ بنگلہ دیش اپنے بجٹ کی پوری رقوم اپنی ملکی آمدنی سے پورا کر رہا ہے اور ترقیاتی بجٹ

کے لیے ۵ء۵۵ فیصد ملکی وسائل پر ہے۔ ہم کہاں پہنچے ہیں اور وہ کہاں پہنچے ہیں؟ ہم اس کے بعد بغلیں بجارہے ہیں۔ جس طرح انڈیا نے روشن انڈیا کی بات کی تھی، ہم بھی اسی طرح آج روشن پاکستان کی بات کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ روشن نہیں بلکہ تنزل پذیر اور گرتی ہوئی صورتحال ہے۔

دفاعی بجٹ کو شفاف بنایئے: جناب والا! دفاع ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ ہم نے ہمیشہ اپنا پیٹ کاٹ کر اور پیٹ پر پتھر باندھ کر دفاع کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ یہ قوم حقیقی دفاعی ضروریات کو ہمیشہ اور ہر قیمت پر پورا کرے گی۔ لیکن جس طرح بد قسمتی سے ہمارے یہاں فوج کو اور فوجی بجٹ کو پارلیمنٹ کے احتساب سے بالا رکھا گیا ہے، یہ کسی حیثیت میں قابل قبول نہیں ہے۔ ضمناً میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں بجٹ سازی آج بھی برطانوی دور کے ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے طے کردہ اصولوں کے مطابق ہو رہی ہے۔ جس میں ظاہرہ اور خفیہ کی دو کیٹیگریز ہیں۔ دستور کا آرٹیکل ۸۱ بد قسمتی سے اسی کا چربہ ہے۔ چنانچہ سارے قابل ظاہر اخراجات جن میں ایوان صدر، رکن ادارے اور سارے سرکاری قرضے شامل ہیں، ان سب پر پارلیمنٹ نہ کوئی کٹ لگا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی ووٹ دے سکتی ہے۔ کٹوتی تو یہاں لگتی بھی نہیں ہے، ووٹ تک نہیں دے سکتے۔ صرف سن سکتے ہیں۔ سرکاری خزانے کے اعداد و شمار پر پارلیمنٹ کوئی ووٹ نہیں دے سکتی ہے۔ پھر روایت کے مطابق خفیہ اخراجات اور دفاعی بجٹ ہے، اس پر آج تک پاکستان کی تاریخ میں کبھی احتساب نہیں ہوا ہے۔ آپ نے جو دفاعی بجٹ ۱۶۰ بلین روپے سے بڑھا کر اس کو عملاً ۱۸۰ بلین روپے کر دیا۔ کیوں؟ ہندوستان سے تو آپ دوستی کر رہے تھے۔ بش صاحب[1] کی چاکری میں آپ نے نئے نئے محاذ کھولے اور اس کے نتیجے کے طور پر انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اب آپ اسے بڑھا کر ۲۱۲ بلین روپے کرنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قطعاً قابل قبول نہیں ہے۔ جہاں

---

[1] امریکہ کے ۴۳ویں صدر جارج ڈبلیو بُش [۲۰۰۱-۰۹ء]

پوری قوم تکلیف اٹھا رہی ہو۔ وہاں ضروری ہے کہ فوج کے نظام کو بھی باضابطہ کیا جائے اور جوابدہ اور حقیقت سے قریب تر کیا جائے۔ اس کی حقیقی دفاعی صلاحیت کا استحکام ضروری ہے لیکن دفاع کے نام پر عیاشیاں ختم ہونی چاہییں۔ آپ ۵ لاکھ بیٹ مین نکال کر ان کے اخراجات کو دوسری طرف ڈال رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بیٹ مین کلچر ہی ایک استعماری چیز ہے۔ اسے ختم کیجیے۔ فوج کو ایک قومی فوج بنایئے۔ اس کو فوجی مقاصد سے ہٹ کر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ سیاست میں بھی اور انتظامیہ میں بھی فوج نے ایک اقتصادی بادشاہت بنالی ہے۔ یہ تمام چیزیں قابل گرفت ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ فوجی بجٹ جو ہے اس پر احتساب کا معاملہ شروع ہونا چاہیے۔

امن وامان کی صورتحال: جناب چیئر مین! اس وقت ملک میں امن و امان کی صورتحال ہولناک ہے۔ میرے پاس اعداد و شمار موجود ہیں لیکن وقت نہیں ہے کہ میں آپ کو دوں۔ صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کو چھوڑ کر ہر صوبے حتیٰ کہ اسلام آباد میں درج شدہ جرائم میں ۲۰ سے ۴۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ امن وامان کا بجٹ آپ بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی حالت سب سے زیادہ خراب ہے۔ اصل توجہ کارکردگی بہتر بنانے پر ہونی چاہیے۔

ٹیکس اصلاحات کی ضرورت: جناب والا! جو چیز سب سے زیادہ ضروری تھی کہ ٹیکس اصلاحات میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ دہرے اور تہرے اکاؤنٹس کا رواج ختم ہو۔ ٹیکس کلچر ایسا پیدا ہو کہ جس میں شفافیت ہو اور جو کھلا و کشادہ ہو۔ اس وقت ٹیکس کے نظام پر سب سے زیادہ بے اعتمادی ہے۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ میں پاکستان کے ٹیکس سسٹم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ۹۸ فیصد افراد نے اس کو بدعنوان قرار دیا گیا ہے۔ اس کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں ٹیکس دہندگان کی کل تعداد ایک ملین ہے لیکن جو اعداد و شمار آج ہی شائع ہوئے ہیں ان میں تیس ہزار سے زیادہ اپیلیں ایک سال میں اس کے خلاف دائر کی گئی ہیں۔ جہاں تک اور ممالک کا تعلق ہے برطانیہ میں ٹیکس دہندہ کی تعداد تیس ملین ہے لیکن پورے سال میں اوسطاً ۲۵ - ۳۰ سے زیادہ اپیلیں نہیں ہوتیں۔ اس بات کی

ضرورت ہے کہ ٹیکس سے متعلق عدالتیں بنائی جائیں جو آزاد ہوں اور ان پر لوگوں کا اعتماد ہو جب تک آپ ایسا نہیں کریں گے تو معدلانہ شراکت کا کاروبار کیسے بڑھے گا۔ پھر یہ دیکھیے کہ آپ نے غیر سودی بینکاری کی اجازت تو دے دی ہے لیکن ٹیکس کے نقطۂ نظر سے یہاں واضح ناانصافی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ سود پر لیے جانے والے ہر قرضہ پر جب آپ سود ادا کرتے ہیں تو وہ کاروباری اخراجات کا ایک حصہ قرار پاتا ہے اور یوں پیداواری لاگت ہونے کی بناء پر اسے ٹیکس سے استثنیٰ ہے۔ لیکن منافع کسی شکل میں بھی ہو اس پر ٹیکس آجاتا ہے تو گویا کہ آپ سود کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اور منافع میں شراکت کی بنیاد پر کاروبار کی حوصلہ شکنی کر رہے ہیں۔ سرمایہ کاری کی ان دو صورتوں کے درمیان ہموار میدان موجود نہیں ہے۔ جب تک آپ یہ ہموار میدان فراہم نہیں کریں گے تو سود کے خاتمہ اور شراکت کی بنیاد پر معیشت میں آگے کیسے بڑھیں گے۔

جناب والا! وزیر خزانہ نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم نے اس بجٹ میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ کئی پہلوؤں سے انہوں نے کچھ چھوٹ دی ہے، سرمایہ کاری کے لیے بھی اور عام شہری کے لیے بھی۔ لیکن یہ چھوٹ ناکافی ہے، یہ آٹے میں نمک بھی نہیں ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہ کوئی ٹیکس نہیں لگایا ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ مثلاً انہوں نے کیپٹل ویلیو ٹیکس (CVT) لگایا ہے، یہ نیا ٹیکس ہے۔ آپ نے کپاس کے بیج پر سیلز ٹیکس استثنیٰ واپس لیا ہے، بغیر صاف شدہ خوردنی تیل پر استثنیٰ بھی واپس لے لیا گیا ہے۔ یہ بڑا ہی خطرناک ہے۔ فی الحقیقت ہمارے ملک میں کپاس کے بیج اور خوردنی تیل پر یہ استثنیٰ جاری رہنا چاہیے تھا۔ آپ نے آئی ٹی کی مصنوعات پر ۵ فیصد کسٹم ڈیوٹی عائد کی ہے، یہ نیا ٹیکس ہے۔ آپ نے شپنگ ایجنٹس پر اشتہارات پر اور کیبل پر ۱۵ فیصد ڈیوٹی لگائی ہے، میں اس کے حق میں ہوں لیکن یہ نیا ٹیکس ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ میں نے کوئی ٹیکس نہیں لگایا لیکن ٹیلی ویژن کے سلسلے میں محض اتنی سی بات کہ بجلی کے ہر بل میں اضافہ ہو گا جو لازماً دینا پڑے گا، نیا ٹیکس ہی ہے۔ آپ نے سگریٹ پر بھی ڈیوٹی بڑھائی ہے، اچھا کیا ہے، اس سے بھی زیادہ

بڑھاتے تو اچھا تھا لیکن بعد میں پھر یہ نہ کہیں کہ کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ میں نے عمومی حساب کیا ہے، آپ نے تقریباً ۱۲ اسے ۱۳ بلین روپے کے نئے ٹیکس لگائے ہیں۔ ویسے نیا ٹیکس لگانا کوئی جرم نہیں ہے بشرطیکہ وہ ضروری ہوں اور ملک کی ترقیاتی ضرورتوں کو پورا کریں۔

ڈبلیو ٹی او کی تیاری: جناب چیئرمین! دنیا میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی ایک بہت بڑی پیش رفت ہو رہی ہے۔ دس سال سے ہو رہی ہے اور اس کے تحت یکم جنوری سے آپ مجبور ہوں گے کہ بہت سے معاملات میں اپنی منڈیوں کو بیرونی سرمائے اور بین الاقوامی کارپوریشنوں کے لیے کھولیں۔ مجھے بڑے دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے، خواہ ہماری پھر پہلے کی حکومتیں ہوں یا موجودہ حکومت ہو، اتنی اہم تبدیلی ہو رہی تھی لیکن اس کے لیے ملک کو تیار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ضروری تھا کہ ہم معیشت کو تیار کرتے۔ ٹیکس کے نظام، معاشی پالیسیوں اور صنعتی پالیسی میں ایسی تبدیلیاں لاتے جس کے نتیجے کے طور پر ہماری صنعت میں مسابقت آسکے اور وہ آنے والے چیلنج کا مقابلہ کر سکے۔ اس دوران بات چیت میں بھی ہم اپنا کردار ادا کرتے۔

اے بی این ایمرو بینک کی رپورٹ ابھی آئی ہے، اس میں انہوں نے یہ تکلیف دہ بات لکھی ہے کہ دو سال پہلے وزارت تجارت نے ڈبلیو ٹی او کے حوالہ سے حکمت عملی بنانے کے لیے ایک ٹاسک فورس بنائی تھی، لیکن ان دو سالوں میں اس ٹاسک فورس کی ایک یا زیادہ سے زیادہ دو نشستیں ہوئی ہیں۔ میں کہوں گا کہ اس کے برعکس سینیٹ کی ڈبلیو ٹی او پر جو کمیٹی ہے، اس کے ۱۲ اسے ۱۴ اجلاس ہو چکے ہیں اور انہوں نے دن رات کام کیا ہے لیکن آپ کی وزارت تجارت جس پر اس تیاری کے لیے سب سے بڑی ذمہ داری ہے، ان کا یہ رویہ افسوسناک ہے، یہ آپ کی پوری حکومت کا معاملہ ہے۔ دراصل بلا تیاری ہم ملک کو ایسے خطرات سے دوچار کر رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس بجٹ میں ڈبلیو ٹی او کے جو اثرات ہیں، ان کو سامنے رکھا جائے گا، لیکن میری نگاہ میں ان کو کم و بیش نظر انداز ہی کیا گیا ہے۔

پالیسی کی پیراڈائم تبدیل کیجیے: جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا اصل ہدف غربت

میں کمی نہیں بلکہ غربت کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں ایسی کوئی حکمت عملی ہمیں نہیں دی ہے۔ اگر آپ ان کی دی گئی حکمت عملی صفحہ نمبر ۵ اور ۶ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے جن چیزوں کی نشاندہی کی ہے، وہ وہی پرانے مبسوط و سیع استحکام کے اہداف ہیں۔ ان میں نہ تو آپ کو غربت کے خاتمے کے بارے میں کچھ ملے گا۔ اور نہ ہی تعلیم اور صحت کے شعبے کا کوئی ذکر نظر آئے گا۔ اس میں دولت کی تقسیم کا کوئی ذکر بھی نہیں ملتا۔ ایسے میں اگر یہ کہا جائے کہ اب ہم رُخ بدل کر دوسری طرف جارہے ہیں تو یہ زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جناب والا! ہمیں مثالیہ (Paradigm) تبدیل کرنے کی طرف جانے کی ضرورت ہے۔

جناب والا! میری گزارش کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ خدا کے لیے آپ محض ٹیکس وصول کرنے والے نہ بنیں۔ حکومت کا کام محض ٹیکس وصول کرنا اور فنڈ اکٹھا کرنا نہیں ہے۔ بلاشبہ حکومت کی ضرورتیں پوری ہونی چاہییں اور جیسا کہ وزیر خزانہ نے کل کہا تھا، صرف ضرورتیں ہی پوری نہیں ہونی چاہییں بلکہ وسائل کا صحیح استعمال ہونا چاہیے۔ تنفیذی مشینری اور خدماتی نظام ٹھیک ہونا چاہیے، اچھی حکمرانی اور اس کے لیے کرپشن کا خاتمہ ضروری ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم چیز وہ تصور اور وہ اصول ہے جس کو آپ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔

جناب والا! اگر آپ اس ملک میں خوشحالی دیکھنا چاہتے ہیں تو ٹیکس نہ دیکھیے بلکہ آپ یہ دیکھیے کہ کسی طرح اس ملک میں پیداوار بڑھے۔ کسی طرح اس ملک میں ہر شخص پیداوار کا حامل ہو جائے گا۔ اس سے ہی روزگار پیدا ہو گا۔ اس طرح دولت کی تقسیم بنیادی سطح پر ہو گی۔

جناب والا! میں ایک واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں جو ہے تو داستان والا اور میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا لیکن ہمارے اس وقت کے موضوع سے براہ راست متعلق ہے۔ اس داستان کے مطابق ایک بادشاہ کہیں راستہ بھول گیا اور اکیلا کسی باغ میں چلا گیا سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ اس نے باغ کے مالک سے کہا مجھے کچھ پینے کو دو۔ باغ کے مالک نے ایک انار توڑ کر

اس کو نچوڑا تو گلاس پورا بھر گیا۔ بادشاہ نے پیا اور اس کو بہت فرحت حاصل ہوئی۔ بادشاہ نے ایک اور گلاس طلب کیا۔ لیکن اس اثناء میں بادشاہ یہ سوچتا رہا کہ اگر اس باغ کے انار سے اتنا جوس نکلتا ہے تو اس پر ٹیکس لگانا چاہیے۔ باغ کے مالک نے جب انار توڑا اور اس میں سے جوس نکالا تو وہ گلاس ایک تہائی بھرا۔ بادشاہ نے کسی قدر حیرانی سے سوال کیا کہ یہ کیا ہوا۔ اس انار سے اتنا کم جوس کیوں نکلا ہے؟ جواباً مالک نے جو بات کہی وہ سونے کے حرف میں لکھنے کے لائق ہے۔ اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقفہ کے دوران حاکم کی نیت خراب ہو گئی ہے۔

ہمارا سارا مسئلہ حاکم کی نیت کا ہے۔ آپ ساری پالیسی ٹیکس لگانے کے لیے بناتے ہیں، میں کہتا ہوں اپنی سوچ کو تبدیل کیجیے۔ آپ پالیسی بنایئے سہولتیں دینے کے لیے تاکہ لوگوں کی پیداواری صلاحیت، روزگار اور خوشحالی بڑھے۔ اس سے پھر آپ کو ٹیکس بھی ملے گا اور کم شرح پر زیادہ ملے گا۔ تاریخ گواہ ہے، یہ تو کہا جاتا ہے کہ انکم ٹیکس اتنا اور اتنا ہو جائے گا۔ لیکن ساری شہادتیں اس کے خلاف جا رہی ہیں۔ لوگ جتنا دینا چاہتے ہیں اتنا دیتے ہیں، آپ وصول نہیں کر پاتے۔ بہتر یہ ہے کہ اس نظام کو آپ بہتر بنایئے۔ آپ کی توجہ ہونی چاہیے پیداوار کے بڑھنے پر، روزگار کے بڑھنے پر، لوگوں کی ضروریات زندگی کے پورے ہونے پر، ان کا معیار زندگی بہتر ہوگا تو اس سے خوشحالی آئے گی۔ ملک آگے بڑھے گا ترقی حاصل ہوگی اور پھر اس سے آپ کی آمدن خود بخود بڑھے گی۔ جب تک اپنے نقطہ نظر کو نہیں بدلیں گے، آپ ابتری کے موجودہ چکر سے نہیں نکل سکیں گے۔ آپ ہزار بار کہتے رہیں کہ IMF خدا حافظ! لیکن آپ کے ڈھانچے، شرائط اور پالیسیوں کے خطوط کار بعینہ ماضی کی طرح وہی ہیں جو اس صورت حال کا سبب ہیں۔

اسی طرح اقتصادی ترقیاتی ڈھانچہ ہے۔ اس میں ریلوے ہے، سڑکیں ریل اور مواصلات کا نظام ہے۔ یعنی یہ وہ تمام چیزیں ہیں جن ۷۰-۱۹۶۰ء میں سرمایہ کاری کی گئی تھی اور آج تک ہم اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں آپ نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اسی طرح مثالیہ کی تبدیلی کے تحت ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ خود انحصار

معیشت کی طرف آئیں۔ پروپیگنڈے کے لیے یہ اچھی بات ہے کہ ہمارے وزیر خزانہ بار بار دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے آئی ایم ایف کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی آپ کا بیرونی قرضہ ساڑھے چونتیس ارب ڈالر ہے[1]۔ اور یہ اس بناء پر ہے کہ پچھلے چھ سال میں آپ نے ۶ بلین سے زیادہ نئے قرضے لیے ہیں۔ آپ کے اندرونی قرضے بھی پچھلے چار سال میں ۲۲ فیصد بڑھے ہیں اور اس وقت آپ کا اندرونی قرض تقریباً ۲ ٹریلین روپے کے برابر پہنچ گیا ہے[2]۔

پھر آپ یہ دیکھیے کہ ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے آئی ایم ایف کو خیر باد کہہ دیا ہے لیکن دوسری طرف دیکھیں تو آپ کا متبادل اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آئی ایم ایف سے کم از کم یہ فائدہ تھا کہ آپ کو قرضہ سستا ملتا تھا۔ آئی ایم ایف کی خرابی اس کا قرض نہیں بلکہ قرض کی شرائط ہیں۔ لیکن اب آپ مارکیٹ سے ۶ سے ۷ فیصد پر قرضہ لے رہے ہیں۔ ابھی آپ نے یورو بانڈ جاری کیے ہیں یہ نیا قرض ہے جو بازار سے لیا گیا ہے اور جو ایک جانب کسی مخصوص ترقیاتی منصوبے کے لیے نہیں ہے دوسری جانب مارکیٹ کی شرح سے دو فیصد زیادہ ہے۔ درحقیقت یہ محض غلط بیانی ہے کہ ہم نے قرضوں کی سیاست کو ختم کر دیا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ خود انحصاری کی طرف آئیں۔

قرضے اثاثے بنانے کیلیے لیے جائیں: جناب چیئر مین! میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ معاشیات کے اعتبار سے ایک قرضہ صرف اس وقت مفید ہو سکتا ہے جب وہ اثاثے بنانے کے لیے لیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرض کے نتیجہ میں آپ کی پیداواری صلاحیت بڑھے اور آپ قرض بمعہ سود ادا کرنے کے لائق ہو سکیں۔ ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے کہ قرض محض

[1] بیرونی قرضے اور واجبات کے موجودہ اعداد مزید تشویشناک ہو گئے ہیں۔ دسمبر ۲۰۲۰ء تک کے اعداد کے مطابق بیرونی قرضے ۱۱۵ء۷ بلین ڈالر ہو گئے جو دسمبر ۲۰۱۹ء میں ۱۱۰ء۷ بلین ڈالر تھے۔

[2] سال ۲۰۱۸ء میں یہ عدد ۱۶ء۴ کھرب روپے تھا جو ۴۰ فیصد اضافے کے ساتھ سال ۲۰۲۰ء کے اختتام پر ۲۳ کھرب روپے ہو گیا۔

عیاشی کے نقطہ نظر سے لیے گئے ہیں۔ میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہتا ہوں کہ جب مجھ پر منصوبہ بندی کمیشن کی ذمہ داری آئی تھی، وہاں میں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ آپ منصوبہ کس بنیاد پر بناتے ہیں تو دوٹوک طور پر مجھے یہ معیار بتایا گیا کہ جس منصوبے پر ہمیں قرضہ مل جائے۔

ابھی دو ہفتہ پہلے قائمہ کمیٹی برائے مالیات کا اجلاس ہوا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے مالیاتی کمیٹی کے اجلاس میں یہ بات پوچھی کہ ۱۹۷۰ء سے پہلے کی باتوں کو چھوڑتے ہوئے آپ نے پچھلے ۳۴سالوں کے اندر ۵۵ بلین ڈالر کے قرضے لیے۔ ان میں سے آپ ۳۰ / ۳۲بلین ڈالر ادا کر چکے ہیں اور باقی قرضہ آپ کے اوپر ہے۔ ان ۵۵ بلین ڈالر کے نئے قرضوں کے بارے میں بتائیے کہ کیا آپ نے کوئی رپورٹ بنائی ہے کہ ان سے ملک میں کتنے اثاثے بنائے گئے ہیں۔

جناب چیئرمین! پوری فنانس ٹیم نے کہا کہ ہم نے کوئی رپورٹ نہیں بنائی۔ یہ اصل غلطی ہے کہ آپ قرضوں کی معیشت بڑھا رہے ہیں لیکن اثاثے بنا نہیں رہے ہیں۔

ضمناً یہ بات بھی عرض کروں کہ اسلام کے نظام کی تو خوبی یہ ہے کہ اسلام نے قرض لینے کو منع نہیں کیا، اسلام نے سود کی بنیاد پر قرض لینے کو منع کیا ہے۔ آپ سرمایہ وہ لیجیے جو اثاثے بنانے کے لیے کام آئے، جس کے ذریعے معیشت بڑھے اور روزگار پیدا ہو لیکن آپ نے قرضے لیے ہیں اثاثے بنانے کے بغیر۔ غیر جانبدار ماہرین معیشت نے اب تک جو مطالعہ کیا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ پاکستان نے اپنے قیام کے بعد سے اب [۲۰۰۴ء] تک تقریباً ۷۰، ۷۲ ارب ڈالر کے قرضے لیے ہیں لیکن اثاثے بمشکل ۸ سے ۱۰ بلین ڈالر کے بنائے ہیں۔ باقی سارا کہاں گیا، میں یہ جواب آپ لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔ نقطہ نظر اور رویہ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے کہ آپ قرضوں کی بجائے شراکت کی بنیاد پر آئیں، اثاثے بنائیں اور خودانحصاری پر آئیں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اپنی معاشی خودمختاری بحال کر لی ہے۔ معاف کیجیے یہ ایک طفل تسلی ہے۔ اگر آپ کا انحصار بیرونی قرضوں پر رہے گا جس طریقے سے آج ہے تو آپ کبھی آزادی اور خودانحصاری حاصل نہیں کر سکتے۔

اسلامی معیشت

ایک مسلمان معاشرے کی پہلی ضرورت تمام انسانوں کی ضروریات کا خوش اسلوبی کے ساتھ پورا ہونا ہے۔ قرآن پاک نے جو ماڈل ہمیں مکہ کا دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ: الذی اطعمھم من جوع وا منھم من خوف اس کا مفہوم ہے کہ بھوک اور خوف (Fear)، ان دونوں سے محفوظ ہونا اور ان دونوں سے نجات دلانا یہ اس ماڈل کا حصہ ہے۔ چنانچہ خوف اور بھوک سے نجات ہماری ساری معاشی حکمت عملی کا حصہ ہونا چاہیے۔

اسی تسلسل میں جناب والا! میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی معیشت ہمارے ایمان کا تقاضا بھی ہے اور ہمارے دستور کا تقاضا بھی ہے۔ صرف اغراض و مقاصد ہی نہیں بلکہ ریاستی پالیسی کے رہنما اصول اٹھا کر دیکھ لیجیے، وہ سب کے سب اس کو حکومت کی ایک ذمہ داری قرار دیتے ہیں اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہ ہمارے ملک کی لازمی ضرورت ہے۔ اسلامی معیشت کیا ہے؟ اسلامی معیشت اس بات کا نام ہے کہ محض چند سرمایہ داروں یا ریاست کی افسرشاہی کا پیٹ نہ بھر اجائے بلکہ ملک کا ہر شہری عزت کی زندگی گزارے۔ قرآن نے اس کو حیات طیبہ کہا ہے، جس میں آپ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں اور آپ عزت سے زندگی گزار سکیں۔ آپ کو مواقع حاصل ہوں۔ اسلامی معیشت حلال اور حرام کا فرق پیش نظر رکھنے کا نام ہے۔ حرام وہ ہے جو آپ کو استحصال اور غلط چیزوں کی طرف لے جائے۔ اسلامی معیشت دراصل انصاف اور فلاح کا نام ہے۔ انسان کو انسان کی حیثیت سے اس معیشت کی تشکیل کا کام تفویض کیا گیا ہے۔ بلاشبہ سود کا خاتمہ اور زکوٰۃ کا نفاذ اس کے بنیادی ستون ہیں لیکن اسلام کا معاشی نظام اس سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اسے قائم کریں۔ میں اس بات کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے اسلامک بینکنگ کے لیے تصدیقی قواعد مرتب کیے ہیں اور حوصلہ افزائی کی ہے کہ بینک ان خطوط پر کام کریں۔ اسلامی معیشت کے مجموعی تناظر میں یہ ایک اچھا لیکن بہت چھوٹا قدم ہے۔

زکوٰۃ: زکوٰۃ کی بات آپ کرتے ہیں لیکن قوم کے اعتماد کا حال یہ ہے کہ جو لازمی کٹوتی آپ کاٹتے ہیں وہ تو آپ کو دیتے ہیں لیکن رضاکارانہ آپ کو کچھ نہیں دیتے۔ جبکہ چند سال قبل (۱۹۹۸ء) کی آغاخان فاؤنڈیشن کی رپورٹ بتاتی ہے کہ رضاکارانہ زکوٰۃ اور صدقات اس ملک میں ۷۰ بلین روپے سالانہ دیے جا رہے ہیں اور یہ وہ نظام ہے جس کی وجہ سے لوگ غربت سے باہر نکل رہے ہیں۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ لوگ تو زکوٰۃ دیتے ہیں لیکن آپ پر اعتماد نہیں کیونکہ آپ کا عالم یہ ہے کہ آپ کے زکوٰۃ فنڈ میں اس وقت بھی ۲۰ ارب روپے غیر استعمال شدہ پڑے ہوئے ہیں اور شاید اس پر آپ سود بھی لے رہے ہوں۔ یہ طریقہ اسلام کو لانے کا نہیں ہے۔ اسلام کو لانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کھلے دل کے ساتھ اسلام کے پورے پروگرام کو لے کر چلیں۔ اس سے فی الحقیقت انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ ملک میں بنیادی سطح پر تبدیلی آئے گی، اعتماد پیدا ہو گا، خیر کو فروغ ملے گا، اخلاقی رویے بہتر ہوں گے اور ایک دوسرے کی مدد کا ماحول بنے گا۔

بجٹ سازی کا طریقہ کار

جناب چیئرمین! بجٹ سازی بھی ہمارے یہاں ایک سانحہ سے کم نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ بجٹ محض افسر شاہی اور کچھ آپ کہہ لیں کہ معاشیات سے تعلق رکھنے والے وزراء کی جاگیر بن گئی ہے۔ پارلیمنٹ تو کیا کابینہ کا بھی اس میں کردار نہیں ہے۔ شوکت عزیز ایک اچھے انسان ہیں، میں ان کو ایک مدت سے جانتا ہوں۔ لیکن مسئلہ افراد کا نہیں، مسئلہ نظام کا ہے اور نظام کا عالم یہ ہے کہ بجٹ سازی ہم سازشی انداز میں کرتے ہیں جبکہ دنیا میں بجٹ سازی کھلی ہوا کرتی ہے۔ دنیا میں عالم یہ ہے کہ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں بجٹ سازی اتنے کم وقت میں ہوتی ہو۔ مثال کے طور پر آسٹریا میں قانونی طور پر ۱۰ ہفتے، بیلجیم میں ۳ مہینے، برازیل میں ۳ مہینے، کینیڈا اور ڈنمارک میں ۴ مہینے، فن لینڈ میں ۲ مہینے، فرانس میں ۲ء۵ مہینے، اٹلی میں ۶ مہینے، جاپان میں ۳ مہینے، کویت میں ۲ مہینے، نیوزی لینڈ میں ۳ء۵ مہینے، ناروے میں ۲ء۵ مہینے میں بجٹ سازی کا پورا عمل مکمل کیا جاتا ہے۔ لیکن پاکستان میں ۲ ہفتے دیئے جاتے ہیں

اور وہ بھی اس طرح کہ اقتصادی جائزہ تک ایک دن پہلے آتا ہے گویا وہ بھی کوئی خفیہ دستاویز ہے۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے، تین مہینے پہلے کے اعداد و شمار لے کر اقتصادی جائزہ کم از کم پندرہ دن پہلے لائیں۔ اس کے بعد مئی کے آخری ہفتے میں آپ بجٹ لے آیئے اور اس پر بات چیت اور بحث کرنے کے لیے پورا ایک مہینہ لیجیے۔

دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ بجٹ پیش ہونے سے بھی پہلے بجٹ بنانے میں پارلیمنٹ کو شریک کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے انگلستان میں اجرت اور ضروریات کمیٹی کو شریک مشورہ کرنے کا طریقہ ہے اور ہندوستان اور دس بارہ دوسرے ممالک میں طریقہ ہے کہ پارلیمنٹ میں بجٹ کمیٹی کو شامل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی اچھی مثال ہے جس پر میں اپنی بات کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ بجٹ کمیٹی کے معنی یہ ہیں کہ دونوں ایوانوں کی منتخب کمیٹی بنائی جائے اور اس میں اصول یہ ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ میں مختلف سیاسی جماعتوں کی متناسب نمائندگی کی بنیاد پر کمیٹی تشکیل پائے۔ اس طرح پوری پارلیمنٹ کی رائے شامل ہو جاتی ہے۔ بجٹ قومی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت سے بھی بنتا ہے اور جہاں پر دو ایوانی نظام ہو سینیٹ کا بھی اس میں کردار ہوتا ہے۔ بجٹ کمیٹی بجٹ بنانے سے تین مہینے پہلے کام شروع کر دیتی ہے اور یہ لوگوں سے شنوائی بھی کرتی ہے۔ عوام اور اداروں سے بھی تجاویز لیتی ہے اور اس طرح گویا کہ اس کا بجٹ بنانے میں براہ راست کردار ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جلدی میں سارا کام کیا جاتا ہے، یہ ختم ہونا چاہیے۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ قواعد میں تبدیلی کر کے بجٹ کمیٹی بنائی جائے۔ یہ لازمی کیا جائے کہ کم از کم ۵ ہفتے بجٹ پر بحث اور کھل کر بات ہو۔ (۱۵ جون ۲۰۰۴ء[۱])

---

[۱] نوٹ: تقریر میں ۱۹ جون ۲۰۰۴ء کو ہونے والی تقریر کے کچھ نکات بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ ۱۹ جون ۲۰۰۴ء کی اس تقریر میں پروفیسر خورشید احمد نے وہ بجٹ سفارشات پیش کی تھیں جو ۱۶ مختلف سینیٹرز نے مشترکہ طور پر تیار کی تھی۔ یہ تمام بجٹ ۵-۲۰۰۴ء کی مختلف مدات اور رقوم میں تبدیلی سے متعلق تھیں اور یوں ان کی اہمیت وقتی نوعیت کی تھی۔ یہاں صرف وہ اضافی نکات شامل ہوئے ہیں جو حکمت عملی کے امور سے متعلق ہیں۔

قومی بجٹ (۰۵-۲۰۰۴ء) پر بحث کے بعد

جناب چیئرمین! اس سال سینیٹ نے بجٹ پر بحث کا جو طریقہ کار اور جو روایت قائم کی ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کے اوپر غور کیا جائے اور اسے آئندہ کے لیے مزید مستحکم اور بہتر کیا جائے۔ حکومت اور ہمارے درمیان بجٹ کے سلسلے میں بڑے بنیادی اور ہمہ گیر اختلافات رہے ہیں اور ان کا اظہار تین دن کی بحث میں آپ کے تعاون سے ایوان اور قوم کے سامنے بھرپور انداز میں آگیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک روشن چیز یہ سامنے آئی ہے کہ جہاں تک اس ملک کی معیشت، اس کے استحکام، اس کی سلامتی اور اس کی ترقی کے تقاضے ہیں، حکومت اور اپوزیشن کے ارکان سر جوڑ کر مشترک چیزوں پر تعاون کے لیے تیار ہیں۔ دوسری جانب جہاں اختلاف ہے وہاں اپنے اختلاف کو بھی بھرپور انداز میں بیان کرنے اور اپنے اپنے انداز میں آگے بڑھانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وزیر خزانہ نے بھی جس مصالحت اور قومی اتحاد کا اپنی تقریر کے اختتام پر ذکر کیا ہے یہ بھی بذات خود بڑی صحت مند روایت ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے اختلافات ختم ہو گئے بلکہ یہ اظہار ہے کہ ہم اختلافات کے باوجود مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اقتصادی پالیسی کے ماڈل: جناب والا! دراصل اقتصادی پالیسی کے دو ماڈل ہیں۔ ایک وہ ہے جس کی بنیاد ثمرات کی نچلی سطح پر بتدریج منتقلی ہے۔ یعنی پیداوار حاصل کر لو پھر عام شہری کے لیے اس کے فوائد کی نچلی سطح پر بتدریج منتقلی کے اثرات ازخود ہوں گے جو انھیں خوشحالی پہنچائیں گے۔ لیکن دوسرا ماڈل یہ ہے کہ ترقی کا وہ آہنگ حاصل کیجیے جس میں دولت کی نامساویانہ تقسیم نہ ہو بلکہ شروع ہی سے بنیادی اہمیت روزگار اور مواقع پیدا کرنے پر ہو۔ بنیادی سطح پر یعنی زراعت اور چھوٹی صنعت پر توجہ دی جائے۔ یہ دو مختلف ماڈل ہیں۔ اقتصادی ثمرات کے نچلے طبقات تک بتدریج منتقلی کا تصور آج نہیں بلکہ ۴۰ سال پہلے شروع ہوا تھا اور عملاً ناکام ہوا ہے۔ اسی لیے سینیٹ کی مشترکہ تجاویز میں ہم نے ثمرات کی نچلے طبقات تک بتدریج منتقلی کے فلسفے سے انکار کیا ہے۔

بجٹ تجاویز

سینیٹ کے معزز ارکان نے ۲۱۰ تجاویز دی تھیں۔ جن میں سے ۸۸ کا تعلق سرکاری بنچوں کے ارکان سے تھا۔ ۵۸ ایم ایم اے کی اور ۳۷ حزب اختلاف کی باقی تمام جماعتوں کی ہیں۔ اس طرح کل ۲۱۰ تجاویز آئی تھیں۔ ان میں سے ۲۲ تجاویز ایسی ہیں جن پر کہ ہم اتفاق رائے پیدا کر سکے۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ اتفاق رائے کی صورت میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنے مؤقف سے کچھ نہ کچھ ہٹنا پڑا۔ مثلاً ہم چاہتے تھے کہ ٹیکس کے لیے کم از کم حد ایک لاکھ پچاس ہزار ہو لیکن اتفاق رائے ایک لاکھ بیس ہزار پر ہو سکا۔ یہ ہمیشہ ہوتا ہے کہ جب بھی اتفاق رائے کی کوشش کی جائے تو ہر فریق کو کچھ نہ کچھ لین دین کرنا پڑتا ہے۔

جناب والا! میں توقع رکھتا ہوں کہ حکومت، وزیر خزانہ اور قومی اسمبلی ان تجاویز کو خاطر خواہ اہمیت دے گی۔ آپ یہ دیکھیں گے کہ ہم نے ان کو دو حصوں میں پیش کیا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے کہ جس کا تعلق فنانس بل کی متعین دفعات سے ہے۔ یہ سینیٹ کا ایک کردار ہے کہ باوجود اس کے کہ محکمہ قانون نے اس بل کو حتمی شکل دے دی تھی لیکن اس میں کئی خامیاں مسودہ، زبان وبیان اور الفاظ کے انتخاب کی موجود تھیں۔ وقت کم تھا اس لیے شاید ہم سب کا حق ادا نہیں کر سکے لیکن کچھ کو درست کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسری جانب کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ٹھوس بنیاد پر بھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے سامنے آئیں۔ مثلاً اس بل میں اصول دیا گیا تھا کہ وارنٹ کے بغیر تلاشی نہیں لی جاسکتی لیکن اس کے معاً بعد یہ موجود تھا کہ وارنٹ کے بغیر بھی تلاشی لی جاسکتی ہے۔ اس تضاد کو انہوں نے محسوس نہیں کیا، ہم نے وارنٹ کے بغیر تلاشی کو حذف کرنے کے لیے کہا ہے تا کہ جو بھی تلاشی ہو، وہ وارنٹ کی بنیاد پر ہو اور اس طرح قانون کی حکمرانی قائم ہو سکے۔ اس میں مصالحت (Arbitration) کا جو طریقہ کار بتایا گیا ہے یہ میری نگاہ میں اچھا طریقہ کار اور ایک بہتر پیشرفت ہے لیکن اس میں بڑے موٹے موٹے سقم تھے۔ خاص طور پر اس میں

جو بات مبہم تھی کہ کیا اس ادارہ کے فیصلے مجوزہ ہوں گے۔ ہم نے متعلقہ ادارے کو اس کی اصل شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس پر ٹھیک عمل کیا جائے تو ملک میں عدالتی اپیلیں نمایاں طور پر کم ہو سکیں گی۔

جناب والا! ابھی وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں فنی و تکنیکی تعلیمی مقتدرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہماری تجاویز میں یہ پہلو بہت اہم ہے کہ اس مالی سال سے جو نئے ادارے قائم ہوئے ہیں، ان کے لیے ٹیکس سے استثنیٰ پانچ سال سے بڑھا کر دس سال کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے اس میدان میں ایک مؤثر ترغیب ملے گی۔ دوسرے الفاظ میں خود قانون میں بھی ہم نے جو تبدیلیاں تجویز کی ہیں، وہ بڑی مؤثر تجاویز ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر بجٹ میں جو اچھے اقدامات کیے گئے تھے، وہ زیادہ کامیاب اور مؤثر بن سکیں گے۔

صوبوں پر قرضوں کا بوجھ: جناب والا! صوبوں پر قرضوں کا جو بوجھ ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ ناقابل تصور حد تک استحصالی ہے، میں نے پہلے بھی یہ کہا تھا، آج پھر کہتا ہوں کہ این ڈبلیو ایف پی (KPK)، جس کو آپ نے پچھلے ۳۰ سال میں ۴۳ ارب روپے قرضہ دیا ہے۔ اس پر آپ آج تک ۶۸ ارب وصول کر چکے ہیں لیکن اب بھی انہوں نے ۸۳ ارب روپے اور ادا کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ۴۳ ارب روپے کا قرض لے کر وہ ایسے مجرم بن گئے ہیں کہ اس پر انہیں ۱۰۰ ارب روپوں سے زیادہ آپ کو سود دینا ہو گا اور یہ آپ اپنی ہی صوبائی حکومت سے اپنے ملک میں وصول کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے اسے ختم کیجیے۔ سینیٹ کی متفقہ تجویز یہ ہے کہ پورے معاملے پر نظر ثانی کیجیے اس کی شرح کو کم کیجیے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہیں اس بات کا موقع دیجیے کہ وہ اپنے قرضوں کو چاہے بازار سے بھی قرض لے کر ادا کر سکیں تو کریں تا کہ اس لعنت سے نجات پائیں۔

غیر ملکی قرضے: جناب والا! سینیٹ کی تجاویز میں دو نکات ایسے ہیں کہ جن کے بڑے دور رس اثرات ہیں، میں آپ سے اور تمام ارکان سے اور خصوصی طور پر حکومت سے متعلق ارکان سے یہ بات کہوں گا کہ یہ مسئلہ اپوزیشن یا حکومت کا نہیں ہے اور مجھے بڑی خوشی ہے کہ

سینیٹ کی مالیاتی کمیٹی نے اپنی مشترک سفارشات میں ان دونوں نکات کو شامل کیا ہے۔ پہلا یہ کہ جتنے بھی غیر ملکی قرضے ہیں ان کی تفصیل پارلیمنٹ اور سینیٹ کے سامنے آنی چاہیے۔ ہمارے ملک میں مفادات کی خاطر بہت ہی غلط شرائط پر ماضی میں قرضے لیے گئے ہیں ایسی صورت آئندہ نہیں بنی چاہیے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں پارلیمنٹ کی بالادستی قائم ہو۔

بجٹ سازی میں پارلیمنٹ کا کردار

دوسری تجویز ہماری یہ ہے کہ بجٹ بنانے کے پورے طریقے پر نظر ثانی کی جائے۔ ہم نے اس سلسلے میں ایم ایم اے کی طرف سے تفصیلی تجاویز دی تھیں لیکن ان پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ تاہم ان تجاویز میں یہ اصول مانا گیا ہے کہ بجٹ سازی میں دونوں ایوانوں میں پارلیمنٹ کا کردار اس وقت بڑا محدود اور نمائشی ہے۔ اسے بالکل بدلنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ہم آپ سے کوئی خفیہ معلومات نہیں مانگ رہے لیکن دفاع کے اخراجات کے بارے میں تنخواہوں پر کتنا خرچ ہو رہا ہے، عمومی سرمایہ کاری کتنی ہے، بنیادی اخراجات کتنے ہیں، یہ تفصیل ایوان کے سامنے آئے۔

جناب والا! سینیٹ کی تجاویز صرف لفظی اور قانون کی نوک پلک کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ اس وقت جو اہم بنیادی مسائل ہیں ان کے بارے میں ہیں لیکن میں اپنے ساتھ ناانصافی کروں گا اگر یہ نہ کہوں کہ اتفاق رائے کی خاطر ہم نے ان تجاویز کے اندر صرف ان معاملات پر توجہ مرکوز کی ہے جہاں حکومت اور ہمارے درمیان اتفاق رائے ہو سکا ہے۔ ہماری نگاہ میں ابھی بہت سارے اور نہایت اہم معاملات ایسے ہیں جن میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔

جناب والا! میں ممنون ہوں قائد ایوان کا، آپ کا اور سارے ساتھیوں کا کہ بجٹ میٹنگ میں آپ حضرات نے اس بات کا ہمیں موقع دیا ہے کہ سینیٹ کی جو چیزیں اتفاق رائے سے

منظور نہیں ہو سکیں ان میں سے ہم کچھ تجاویز علیٰحدہ سے پیش کر دیں۔ تا کہ ان پر ہاؤس میں غور کیا جاسکتا ہو اور اگر حکومت کا دل کھل جائے تو انہیں قبول کر لیا جائے۔ یہ موقع ملنا، میں سمجھتا ہوں بڑی مبارک چیز ہے۔ میں آپ کے اور لیڈر آف دی ہاؤس کے تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور بات ختم کرنے سے پہلے میں یہ بھی کہوں گا کہ ہم میں سے سب سے زیادہ محنت انور بھنڈر صاحب نے کی، دونوں سطح پر، تجاویز مرتب کرنے سے پہلے بھی اور تجاویز پر غور کے درمیان بھی۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ سینیٹ کے سٹاف، سیکرٹری سینیٹ اور خصوصیت سے فنانس کمیٹی کے سیکرٹری افتخار اللہ بابر اور ان کی پوری ٹیم نے جتنی محنت کی ہے، جتنا وقت دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دل پر اس کا بڑا نقش ہے، ہم اس کا کھلے دل سے اعتراف چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ جس شکل میں بھی ان کی خدمات کا اعتراف ہو سکتا ہے اس کا آپ اہتمام کریں۔

میں اپنے ساتھیوں کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے کمیٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے یہاں گفتگو کا موقع دیا اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ وزیر خزانہ صاحب اس وقت موجود نہیں ہیں، لیکن میری خواہش ہے اور دعا ہے کہ وہ ان تجاویز پر غور کر سکیں۔ یہ ان کے لیے ایک امتحان بھی ہے۔ پچھلے سال سینیٹ کی تجاویز کا جو حشر اسمبلی میں ہوا اور جس طرح ہوا، میری نگاہ میں وہ بڑا افسوسناک واقعہ ہے۔ اس دفعہ سینیٹ نے ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ جانفشانی سے پیشہ ورانہ طور پر اپنی ذمہ داری کو ادا کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وزارت خزانہ، کابینہ اور اسمبلی، سینیٹ کے ارکان کی تجاویز کو قرار واقعی اہمیت دے گی اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی نہ کوئی نقش اس بجٹ میں ہو جو بالآخر قومی اسمبلی ۲۹ جون کو قبول کرے گی۔

(۱۸ جون ۲۰۰۴ء)

قومی بجٹ (۰۷-۲۰۰۶ء): تبصرہ و تجاویز

اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں اور اس سے پہلے بجٹ ۵-۲۰۰۴ء پر تبصرہ و تجاویز سے متعلق باب میں حکومت کی اقتصادی پالیسیوں اور ان کے نتائج پر تفصیلی مباحث شامل ہیں۔ ان مباحث میں معیشت کے حوالہ سے حکومتی اپروچ اور پالیسیوں کے نقائص اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل میں تبدیلی کی تجاویز بہت تفصیل سے بیان ہو چکی ہیں۔ اس تناظر میں ۷-۲۰۰۶ء میں بجٹ پر بحث کے دوران کی جانے والی زیر نظر تقریر میں تکرار کو کم از کم کرتے ہوئے محض اضافی اہمیت کے نکات اور بجٹ ۰۷-۲۰۰۶ء سے متعلق نکات برقرار رکھے گئے ہیں۔

پہلی بات جناب والا! میں یہ کہوں گا کہ تین، چار بڑے ہی بنیادی سوال ہیں جن کو تکنیکی بنیادوں کے اوپر اٹھانا ضروری ہے۔ جناب چیئرمین! میں نے جناب لیاقت علی خان مرحوم کی ۴۷-۱۹۴۶ء کی بجٹ تقریر بھی سنی ہے اور پھر شوکت عزیز صاحب اور وزیر مملکت صاحب کی پچھلے سال کی تقریر بھی سنی ہے۔ مجھے یہ بات تشویش کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ جو متانت، شائستگی اور توازن، بجٹ تقریر کا خاصا ہے اس سال اس سے ہم بہت دور رہے ہیں۔ ہمارے وزیر مملکت نوجوان سیاستدان ہیں[1]، ان کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے کہ بجٹ تقریر کو انتخابی تقریر نہیں بنایا جاتا۔

بجٹ کی پیشکش کا طریقہ کار: دوسری بات جناب والا! ہم نے گزشتہ سالوں میں بھی کہی تھی، آج پھر کہہ رہے ہیں کہ بجٹ اور اس سے متعلقہ امور قومی اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ اس

---

[1] اس وقت جناب عمر ایوب خان وزیر مملکت برائے خزانہ تھے۔

سے متعلقہ تمام دستاویزات کو پڑھنے، سمجھنے، ہضم کرنے اور پیش کرنے لیے پورا وقت ملنا چاہیے۔ پچھلے سال بھی اسی ایوان میں ہم نے یہ بات اٹھائی تھی کہ اکنامک سروے میں کوئی خفیہ معلومات نہیں ہوتیں اس کو بجٹ سے کم از کم دو ہفتے پہلے آنا چاہیے تاکہ لوگوں کو اسے پڑھنے کے لیے وقت مل سکے۔ اسی طرح بجٹ دستاویز کو مکمل ہونا چاہیے۔ خاص طور پر سپلیمنٹری گرانٹس کا مسئلہ ایک بڑا بنیادی، معاشی اور قانونی مسئلہ ہے اس لیے کہ یہ وہ رقوم ہوتی ہیں جو آپ پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیے بغیر پہلے سے خرچ کر دیتے ہیں۔ اب جس دن آپ کو اسے پاس کروانا ہوتا ہے اسی دن آپ اس کو پیش کرتے ہیں اور پاس کروا لیتے ہیں، یہ پارلیمنٹ کے ساتھ ایک ظلم اور دستور کی روح سے متصادم عمل ہے جو برابر جاری ہے۔

ایک اور قابل توجہ پہلو بجٹ کی رازداری سے متعلق ہے۔ شاید پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ جو بجٹ تجاویز پارلیمنٹ میں اب سامنے آئی ہیں، ان میں سے ۶۰ سے ۷۰ فیصد وہ ہیں جو پچھلے دو دنوں کے اخبارات اور آج ٹی وی کے مختلف چینلز پر آرہی ہیں۔ یہ ایک بڑا ہی سنجیدہ معاملہ ہے۔ اس ملک میں بجٹ سازی کی روایت یہ ہے کہ بجٹ نہ صرف اراکین اسمبلی سے بلکہ کابینہ سے بھی خفیہ رکھا جاتا ہے اور انہیں صرف آخری وقت میں اعتماد میں لیا جاتا ہے اور جب کابینہ منظوری کا فیصلہ کرلیتی ہے تو پھر وزیر خزانہ اسے اسمبلی میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں بہتری کے حوالہ سے میں بات کر چکا ہوں لیکن اس کی تحقیق ہونی چاہیے کہ پارلیمنٹ کے سامنے کوئی چیز آئے بغیر یہ کس طرح عام ہوئی ہے۔ ہمارے نظام میں بجٹ تجاویز کے بارے میں رازداری ضروری ہے۔ ان تجاویز کا اس طرح باہر آنا ایک بہت بڑا دھچکہ ہے اور میری نگاہ میں یہ صحیح نہیں ہے[1]۔

دوسری جانب جناب والا! فنانس بل کو عمومی قانون سازی کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ دستور آرٹیکل ۷۳ کی صریح خلاف ورزی ہے۔ آرٹیکل ۷۳ میں ایک چھوٹی سی

---

[1] بجٹ کی رازداری سے متعلق یہ اقتباس پروفیسر خورشید احمد کی ۵ جون ۲۰۰۶ء کی تقریر سے لیا گیا ہے۔

گنجائش محض ناگہانی امور کی رکھی گئی تھی لیکن اس کا وحشیانہ استعمال تسلسل کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس میں یہ لوگ اتنے جری ہو گئے ہیں کہ اس سال تو اس کے ذریعہ ضابطہ فوجداری میں ترمیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک اور عجیب و غریب چیز جو مالیاتی بل کے صفحہ دس پر آپ کو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ شاید پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ محض نوٹیفکیشن کے ذریعہ ٹیکس لگانے کا اختیار مانگا جارہا ہے جو اصل میں پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے:

> Federal Government may, by a notification, levy an additional custom duty on all or any of the goods imported or exported as specified in the first schedule at a rate not exceeding 75% of value of such goods as determined under section 25.

ہم نے کمیٹی میں اس پر گفتگو کی اور نوٹس لیا ہے اور دونوں طرف کے نظریات کو دیکھا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ پارلیمنٹ کے ساتھ ایک بہت بڑا مذاق ہے۔

سازگار حالات لیکن ناقص کارکردگی: ان تین تکنیکی حوالوں کے بعد جناب والا! اب میں اس سال کے بجٹ کی طرف آتا ہوں۔ میری پہلی گزارش یہ ہے کہ اس حکومت کو محض پچھلے چار سال نہیں بلکہ کل ملا کر دراصل سات سال اپنی اقتصادی پالیسیوں کو پیش کرنے، ان پر عمل کرنے اور حالات کو بہتر کرنے کے لیے ملے ہیں۔ عام طور پر چار سے پانچ سال کا عرصہ ہوتا ہے جس میں کسی بھی پارلیمانی حکومت کی کارکردگی کو پرکھا جاتا ہے۔ ان کو جو سات سال ملے ہیں وہ بھی اس طرح گزرے ہیں کہ انھیں مکمل یکسوئی سے حکمرانی کا موقع میسر تھا جو ے سال بلا روک ٹوک ان کو ملا ہے۔ دوسری غیر معمولی بات یہ ہے کہ بین الاقوامی حالات اور ہماری موجودہ پالیسیوں کی وجہ سے، اگرچہ ان پالیسیوں میں بہت سی خامیاں اور غلطیاں بھی ہیں اس حکومت کو کم از کم ایک فائدہ یہ ہوا کہ بیرونی اداروں اور ملکوں سے بے مثال مالیاتی چھوٹ حاصل ہوئی ہے۔ بیرونی قرضے کچھ معاف کیے گئے اور کچھ مؤخر کیے گئے ہیں۔ ترسیلات زر ایک بلین ڈالر آتی تھیں جو بڑھ کر ۴ بلین ہو گئی ہیں۔ اس طرح تقریباً کوئی ۱۵ بلین ڈالر کے اضافی وسائل ملک کو حاصل ہوئے ہیں جس سے دراصل اخراجات میں مدد

بھی ملی ہے اور دوسری طرف سرمایہ کاری کے لیے وسائل بھی حاصل ہوئے۔ یوں سارے پہلو آپ دیکھیں تو غیر معمولی مالیاتی وسائل ان کو حاصل تھے جو ان سے قبل کی حکومتوں کو حاصل نہیں تھے۔ یہ دوسروں کو برا بھلا بہت کہتے ہیں اور اس بجٹ میں بھی اپنے کارنامے بیان کرنے کی بجائے زیادہ وقت دوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں استعمال کیا گیا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس سات سال میں جو مالیاتی چھوٹ حاصل ہوئی تھی اس کو آپ نے کس طرح استعمال کیا ہے۔

اعداد و شمار کا دھوکہ: جناب والا! جو اعداد و شمار وزیر خزانہ نے پیش کیے ہیں اور دستاویزات سے ملے ہیں اور ان کو اگر آپ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ غربت نہیں ہے اور نہ ہی بیروزگاری ہے حتّٰی کہ دولت مندی اور خوشحالی نمایاں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سرکاری اداروں میں ایوان صدر اور ایوان وزیراعظم میں، سیرینا، میریٹ اور پی سی جیسے ہوٹلوں میں وقت گزارنے والے لوگوں کے لیے ایسا ہی ہو۔ حقیقت بہر حال یہ نہیں ہے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ اعداد و شمار نہایت مشتبہ ہیں۔ چند مثالیں دے کر میں آپ کو بتادوں جناب والا! انہوں نے کہا ہے کہ ان پانچ سالوں میں فی کس آمدنی ۴۰۰ ڈالر سے بڑھ کر تقریباً ۸۵۰ ڈالر پر آگئی ہے۔ یہ ۱۰۰ فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہے۔ تاہم بطور ایک ماہر معیشت جب میں دیکھتا ہوں کہ ان پانچ سالوں میں ترقی کی سالانہ شرح کیا رہی ہے، تو یہ ۵ء۱ فیصد، ۳ء۳ فیصد، ۳ فیصد، ۴ فیصد، ۵ء۸ فیصد اور ۶ء۶ فیصد ہے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ترقی کی شرح اگر یہ رہی ہے تو فی کس آمدنی دگنی کیسے ہو گئی ہے۔ میں اسے نہیں مان سکتا۔

اور آگے بڑھیے، کہا جارہا ہے کہ مال مویشی میں ۸ فیصد کا اضافہ ہوا ہے جبکہ حیوانی مصنوعات میں اضافہ نہیں ہوا، مال مویشی کے دودھ لیں یا دیگر اشیاء اور یا گوشت لیں، ان کی قیمتیں بڑھی ہیں تو پھر یہ ۸ فیصد کے اضافہ کے اثرات کہاں گئے۔

سب سے بڑا سنگین مذاق یہ ہے کہ کہا جارہا ہے کہ غربت کم ہو گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے جناب چیئرمین! کہ ۲۰۰۱ء سے پہلے کے جائزے کی رو سے ہمارے ہاں غربت

سرکاری سطح پر ۳۳ فیصد تھی۔ بین الاقوامی آزاد ماہرین معیشت حتّٰی کہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیویلپمنٹ اکنامکس کے دو آزاد مطالعات اس شرح کو قبول نہیں کرتے۔ اس کے باوجود میں ۳۳ فیصد مان لیتا ہوں۔ اب آگے دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ کم ہو کر ۲۳ فیصد رہ گئی ہے یعنی ان پانچ سالوں میں ۱۰ پوائنٹ کی کمی ہوئی ہے لیکن جناب والا! سوال یہ ہے کہ کس بنیاد پر یہ بات کہی جا رہی ہے۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں! ایک خصوصی سروے ہوا ہے جو عمومی سروے کی ایک تہائی تعداد پر مشتمل ہے اور وہ ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۵ء میں غربت کا موازنہ کر رہا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۲۰۰۲ء ایک غیر معمولی سال ہے، اس لیے کہ اس وقت خشک سالی تھی پورے ملک میں، زرعی پیداوار، مال مویشی حتّٰی کہ صنعتی پیداوار بھی نیچے تھی۔ اگر اس مندی کے سال کو آپ موازنے کے لیے بنیاد بناتے ہیں اور ۲۰۰۵ء جس میں کہ پیداوار میں سب سے زیادہ اضافہ ہے، تو آپ کا یہ موازنہ مکمل طور پر غیر منصفانہ ہے۔

چلیں تھوڑی دیر کے لیے میں یہ بھی مان لیتا ہوں۔ کہا کیا جا رہا ہے ذرا غور کیجیے۔ فرمایا جاتا ہے کہ غربت ۳۳ فیصد سے کم ہو کر ۲۳ فیصد پر آ گئی ہے۔ اجازت دیں مجھے یہ بات کہنے کی کہ سروے کے اس اعلان اور وزیر خزانہ کی تقریر سے ایک ہفتہ پہلے وزیر اعظم اور مشیر اقتصادیات دونوں نے سرکاری طور پر یہ بات کہی ہے کہ ۲۰۰۲ء میں یہ شرح ۳۲ فیصد تھی۔ اب ایک ہفتے کے اندر موازنہ کے لیے منتخب اس سال میں ۲ فیصد بڑھا کر اسے ۳۴ فیصد کہہ رہے ہیں اسی طرح غربت کی آج کی شرح کے بارے میں وزیر اعظم نے ریکارڈ پر کہا ہے کہ یہ ۲۵ فیصد ہے۔ لیکن اب جو اعلان کیا ہے اس میں اسے ۲۳ فیصد بتایا گیا ہے یوں اگر آپ کے اپنے اعداد و شمار کو درست مان بھی لیا جائے تو ایک ہفتہ میں آپ نے غربت میں تو ۷ فیصد کمی کی بجائے ۱۰ پوائنٹ کمی کر دی ہے۔ یہ کیسے ہو گیا! جناب چیئرمین! ایک اور پہلو سے بھی سوچیئے اس ۱۰ فیصد کے معنی ہیں کہ ۳۴ فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے تھے، ان میں سے ایک تہائی امیر ہو کر غربت کی لکیر سے اوپر چلے گئے ہیں۔ یعنی غریبوں میں شامل ۳۳ فیصد لوگوں کو اس زمانے میں اتنی دولت ملی ہے کہ وہ غربت کی لکیر سے اوپر چلے گئے ہیں۔ کیا یہ

ممکن ہے؟ میں کہتا ہوں آپ اپنے ہی سروے کو پڑھ لیجیے۔ اس سروے میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا آپ ۲۰۰۵ء میں ۲۰۰۳ء کے مقابلے میں بہتر ہیں؟

جناب والا! ۲۴ فیصد نے یہ کہا ہے کہ ہم پہلے سے بہتر ہیں۔ جبکہ ۷۶ فیصد نے یہ کہا ہے ہم بہتر نہیں ہیں۔ یہ کیا ظلم ہے، کون اعتبار کرے گا آپ کی باتوں کے اوپر؟

ایک اور چیز دیکھیے، کہا جارہا ہے روزگار بڑھ گیا ہے اور تھوڑا بہت بھی نہیں، پانچ ملین کا اضافہ ہے۔ اس سے پہلے کے سارے سالوں کے سروے دیکھ لیں۔ میں نے جتنے لوکل سروے مطالعہ کیے ہیں کسی ایک میں بھی ایسا نہیں ہے جس کے مطابق کسی بھی سال میں روزگار میں ایک ملین یا ایک ملین سے زیادہ اضافہ ہوا ہو۔ یہ کیسا معجزہ ہوا ہے کہ اس بار ایک سال میں پانچ ملین کا اضافہ ہو گیا۔ جناب والا! میں آپ کو بتاؤں کہ یہ معجزہ کیسے ہوا ہے۔ یہ ہے جناب والا! محنت کشوں کا وہ سروے جس کی تازہ ترین رپورٹ اکتوبر سے دسمبر ۲۰۰۵ء میں آئی ہے، اس میں سب سے پہلے روزگار کی تعریف دیکھنا بہت ضروری ہے۔ تعریف یہ ہے کہ جو عرصہ ہے روزگاری کا، وہ ایک ہفتہ ہے۔ ٹھیک ہے آپ کو اختیار ہے، آپ ایک ہفتہ بھی دے سکتے ہیں اور ایک ماہ بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن جو سب سے اہم چیز ہے وہ یہ کہ برسرروزگار کا معنی کیا ہے۔ جناب والا! برسرروزگار مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ تمام افراد جو دس سال یا اس سے بڑے ہیں اگر انھوں نے ایک ہفتے میں ایک گھنٹہ کام کیا ہے تو وہ برسرروزگار قرار پائیں گے۔ یعنی اس ایک گھنٹے کی آمدنی کافی ہے کہ آپ ایک ہفتے تک روٹی کھا سکتے ہیں یہ آپ کی روزگار کی تعریف ہے۔

جناب چیئرمین! میں یہ بھی آپ کو بتلاوں کہ مزید معجزات کیا کیا ہیں۔ سب سے اہم اس میں ٹیبل نمبر ۱۰ ہے۔ اس ٹیبل میں ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۵ء تک کا موازنہ ہے۔ جناب والا! اس میں بتایا گیا ہے کہ تمام برسرروزگار میں ۹ء۰ فیصد وہ ہیں جو آجر تھے۔ ۱ء۳۷ فیصد وہ ہیں جو خود روزگار پیدا کر رہے تھے اور ۹ء۳۷ فیصد وہ ہیں جو ملازم ہیں۔ اب جو ۱ء۲۴ فیصد رہ گئے وہ کیا ہیں؟ ذرا غور سے سنیے۔ فرماتے ہیں بلا اجرت خاندانی مددگار، گھر میں بیوی جو آپ کے

ساتھ کام کرتی ہے۔ زراعت میں خواتین، دوست احباب آپ کے ساتھ کام کرتے ہیں وہ بھی تو شامل ہیں۔ ۰۴-۲۰۰۳ء میں یہ ۲۴ء۱ فیصد تھے۔ ذرا جگر تھام کر کے تازہ صورت حال بھی دیکھ لیجیے۔ جس میں یہ کہہ رہے کہ ۵ ملین افراد کو ہم نے روزگار فراہم کیا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ۰۶-۲۰۰۵ء کا سروے یہ بتلاتا ہے کہ آجر یہ وہی ۰۹ء۰ فیصد رہے، خود روزگار والے ۱ء۳۷ فیصد سے کم ہو کر کے ۳۴ فیصد رہ گئے، ۹ء۳۷ فیصد ملازم کم ہو کر ۴ء۳۷ فیصد رہ گئے، لیکن وہ جو سب سے آخری قسم ہے بلا اجرت خاندانی ملازم کی وہ ۱ء۲۴ فیصد سے بڑھ کر کے ۴ء۲۷ فیصد ہو گئے ہیں۔ یہ ہے آپ کا روزگار میں اضافہ، اگر اس کا نام روزگار ہے تو یہ صریحاً دھوکہ دہی کے علاوہ اور کیا ہے۔

غریب پرور بجٹ کی حقیقت: جناب چیئرمین! میں اس کے بعد اب دوسرے مسئلے پر آنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس بجٹ میں دعوے کیے گئے ہیں کہ یہ غریب پرور، عوامی اور ترقی والا بجٹ ہے۔ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ ایک پیشہ ور معیشت دان کی حیثیت سے مجھے یہ بات کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ پہلے تین سال ان کی ساری پالیسی کا محور اوپری استحکام تھا۔ جس کے نتیجے کے طور پر افراط زر کم ہوتا ہے لیکن ترقی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد دو سال یہ تھوڑا سا ترقی کی طرف آئے لیکن ایسی مالیاتی پالیسی نہیں تھی کہ ترقی کے ساتھ افراط زر نہ ہو۔ ظاہر ہے اس کے نتیجہ میں افراط زر کے رجحان کا ایک دھماکہ ہوا۔ اب اس سال یہ کچھ غریب کو ریلیف کی باتیں کر رہے ہیں، اس سلسلے میں جو تجاویز آئی ہیں ان کے مطابق ۱۵ء۳ ٹریلین روپے کے بجٹ میں تقریباً ۱۶ بلین روپے کا زر تلافی غریبوں کے نقطہ نظر سے رکھا گیا ہے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سے کیا انقلاب آجائے گا۔

جناب والا! اگر میں تکنیکی الفاظ استعمال کروں تو ان کا سارا فلسفہ یہ ہے کہ اگر ترقی ہو گی تو نچلی سطح پر فوائد کی منتقلی (Trickle down effect) ہو گی۔ یہ دنیا کے سارے ممالک میں ناکام رہا ہے، اس سلسلے میں بہترین اسٹڈیز خود عالمی بینک کے نائب صدر اور چیف اکنامسٹ جوزف اسٹگلٹز (Joseph Stiglitz) کی ہیں۔ اس نے دکھلایا ہے کہ دنیا کے کسی

ملک میں بھی یہ نہیں ہوا ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب حکومت ایسی مؤثر پالیسی اختیار کرے کہ جو محروم طبقے ہیں وہ ترقی کر سکیں اور جو بیروزگار ہیں ان کو روزگار مل سکے۔

جناب والا! میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا بجٹ اور آپ کے دعوے بہت ہی گمراہ کن مغالطوں کا ایک ملغوبہ ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ ایک شخص بیمار تو ہو لیکن بیماری کا بھی انکار کرے۔ اگر آپ بیماری کا انکار کریں گے تو بیماری کا علاج کیسے ہو سکے گا؟ بیماری کو تسلیم کر لیں تو سب سے پہلے جاننا ہوتا ہے کہ بیماری کیا ہے، اس کی صحیح تشخیص ہو تو پھر اس کا علاج ہوتا ہے۔ یہ بنیادی خرابی ہے جو یہاں ہو رہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ میری نگاہ میں یہ غلطی ہے کہ ہم اب بھی اسی خالص سرمایہ دارانہ ڈھانچے میں ہیں جس میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر چند شعبوں میں پیداوار میں اضافہ ہو جائے تو باقی آبادی تک اس کے اثرات از خود ہی پہنچ جائیں گے۔

جناب والا! ہمارے انتظامی اخراجات اور طرز زندگی نامنصفانہ ہے۔ یہ جو درآمدات کی آزادی کے نام پر آپ نے ایک دروازہ کھول دیا ہے یہ بھی قابل توجہ ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ نجکاری اور اس کے ساتھ کھلی اور باضابطہ (Regulated) معیشت دونوں کا ایک کردار ہے اور ہونا چاہیے لیکن اسے قومی سطح پر فائدہ مند ہونا چاہیے۔ صورت حال یہ ہے کہ اس وقت تقریباً ڈیڑھ بلین ڈالر کی پر تعیش کاریں آپ نے باہر سے منگوائی ہیں۔ دوسری جانب ملک میں کاروں کی پیداوار ایک لاکھ پینتیس ہزار ہے، استعمال شدہ کاریں اس کے علاوہ ہیں۔ ظاہر ہے جب آپ کی کوئی ٹرانسپورٹ پالیسی نہیں ہے اور ایسے میں جب پبلک ٹرانسپورٹ کا انتظام ناقص ہو گا اور آپ کاروں کی کھلی اجازت بھی دے رہے ہوں گے تو کاروں کا استعمال تو بڑھ ہی جائے گا۔ نتیجتاً پٹرول کی کھپت اور قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ زرمبادلہ جا رہا ہے، سمگلنگ بھی ہو رہی ہے، سڑکوں کا حال خراب ہے، آلودگی کی کیا کیفیت ہے۔ سرکاری ٹرانسپورٹ پالیسی سب سے زیادہ محروم ہے۔ ریلوے لے لیں جتنی طویل ریلوے لائنیں ۱۹۴۷ء میں تھیں جناب والا! آج بھی وہی ہیں۔ محض پانچ سو کلومیٹر کا اضافہ ہوا ہے یہ تمام چیزیں ایک نئی اپروچ کا تقاضا کرتی ہیں۔

مالیاتی پالیسی: دوسرا آپ دیکھیں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تجارتی خسارہ ۱۰ بلین ڈالر سے زیادہ ہو گا۔ یہ آپ کی ضابطوں سے آزاد پالیسی کے نتیجے میں ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ چار بلین ڈالر کی بیرونی ترسیلات زر کے باوجود آپ کا ادائیگیوں کے توازن کا خسارہ پانچ اور چھ بلین ڈالر کے درمیان ہونے جارہا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ اس پورے بجٹ میں اس کا کوئی شعور نہیں ہے۔ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ:

> Liberalization and privatization will take care of everything. They will never. We are heading towards crisis.

مالیاتی پالیسی بدلنی چاہیے تھی تاکہ جو صنعتی اور زرعی خرچے ہیں ان کو سستا بنایا جاسکے، آپ کی پیداوار مقابلے کی ہو تاکہ ملکی ضرورت بھی پوری ہوں اور برآمد بھی بڑھ سکیں۔ چھوٹی اور درمیانے درجے کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ایس ایم ای کا کردار اس وقت یہ ہے کہ دنیا کے کچھ ممالک میں تو ۸۰ فیصد برآمدات ایس ایم ای سے ہی ہیں ہمارے ہاں یہ بیس فیصد بھی نہیں۔

تجارتی پالیسی: اس کے ساتھ ہی میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک نئی تجارتی پالیسی کی ضرورت ہے۔ ڈبلیو ٹی او کا نام لے کر یا اس سے ڈرا کر اپنے دروازوں کو کھول دینا اور اس طرح بین الاقوامی کثیر القومی کمپنیوں کے لیے ایک آسان ٹوکری بن جانا، یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ ہمیں لازماً اسے تبدیل کرنا پڑے گا۔ میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے دائرے میں بھی تعیشات کو روکنے کے لیے گنجائش موجود ہے۔ اس میں ایک باضابطہ ڈیوٹی کی گنجائش موجود ہے، اس میں ذخیرہ اندوزی پر ڈیوٹی کی گنجائش موجود ہے لیکن ہم اس کا فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ درحقیقت اگر ضرورت پڑے تو ڈبلیو ٹی او سے آگے بھی جانا چاہیے۔ امریکہ گیا ہے، یورپ گیا ہے۔ انڈیا گیا ہے دوسرے ممالک گئے ہیں آخر ہم کیوں نہیں جاسکتے؟

بینکنگ کا منفی کردار: مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ بینکاری کے شعبے نے بھی ایک بڑا ہی منفی

کردار ادا کیا ہے۔ ہم اس کے حق میں ہیں کہ بینکاری کو فروغ ملے وہ ضروری ہے لیکن آپ ذرا سوچیں ایک سال میں بینکوں کو ۹۰ بلین روپے کا منافع ہوا ہے۔[1] جس کے معنی ہیں کہ جو ڈیپازٹ آپ دیتے ہیں اور ایڈوانس جو وصول کرتے ہیں اس کے درمیان فرق بہت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں یہ بینک کی کارکردگی کے برابر نہیں ہے۔ یہ بینک آپ کی خدمت میں یہاں نہیں کمارہے ہیں، یہ بینک اچھے انتظام سے نہیں کمارہے ہیں بلکہ ہمارا خون چوس کر کما رہے ہیں۔ اسٹیٹ بینک اور حکومت اس پر خاموش ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اقدام نہیں کر سکتے ہیں۔ جناب والا! میں سمجھتا ہوں کہ یہ بد انتظامی ہے، مسخ شدہ تفاوت ہیں، بیرونی مفادات کا تحفظ ہے۔ نتیجہ ان کا یہ ہے کہ عوام کو مشکلات برداشت کرنا پڑ رہی ہیں۔

چار بنیادی مسائل

جناب والا! اس وقت کے چار بنیادی مسائل کو اس بجٹ میں نظر انداز کیا گیا ہے اور ان کے سلسلہ میں بے حسی دکھائی گئی ہے۔ پہلا زراعت ہے، زرعی استعمال کی اشیاء، ان کی مارکیٹ میں موجودگی اور ان کا صحیح قیمت پر ملنا جب تک آپ یہ نہیں کریں گے۔ آپ ترقی نہیں کر سکیں گے۔

دوسری بنیادی چیز عوام کی ضرورتوں کو پورا کیا جانا ہے۔ اسے پالیسی کا مقصد ہونا چاہیے کہ کس طرح عوام کی بنیادی ضروریات، مناسب مقدار میں، مناسب قیمت پر دستیاب ہوں، رسد اور طلب دونوں کی بروقت موجودگی اور منافع کے امکانات ہونے چاہییں اور ان ضروریات زندگی کی فراہمی ممکن ہونی چاہیے۔ یہ ہمارے ہاں نہیں ہے۔

تیسرا بڑا مسئلہ میری نگاہ میں اس وقت تجارتی امانتیں اور ادائیگیوں کے توازن میں خسارہ ہے اور اس بجٹ میں اس کا کوئی شعور نہیں ہے۔ ایک بھی پالیسی اس صورتحال سے نکلنے کے لیے مجھے نظر نہیں آئی۔ چوتھا بڑا مسئلہ ہے صوبوں کے درمیان انصاف اور

---

[1] سال ۲۰۲۰ء کے اختتام پر بینکوں کا منافع ۲۳۱ بلین روپے ہو گیا ہے۔

توازن۔ صوبوں کے درمیان توازن اسی طرح ضروری ہے جس طرح انسانوں کے درمیان ضروری ہے۔ اگر یہ چاروں صوبے چار پہیے ہیں اور ان میں ایک پہیہ چھوٹا اور دوسرا بڑا ہو تو گاڑی کیسے چلے گی۔ یہ اسی وقت چلیں گے جب ان میں توازن اور برابری ہو اور ان میں یہ احساس ہو کہ اپنے وسائل کو ٹھیک استعمال کریں۔ ہم کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیں گے لیکن اس کی مثال نہیں ہے۔ اس کے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

جناب والا! ان چاروں مسائل کے بارے میں میری نگاہ میں اس بجٹ کے اندر کوئی مثبت اور ٹھوس اقدام نہیں ہے۔

(۱۰ جون ۲۰۰۶ء)

قومی بجٹ(۰۹-۲۰۰۸ء): تبصرہ و تجاویز

بجٹ ۰۹-۲۰۰۸ء پر اس باب کی ابتداء میں پروفیسر خورشید احمد کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ذاتی طور پر سینیٹ رکن کی حیثیت سے کی ہے۔ اس تقریر میں پیش کیے گئے خیالات کا ایک حصہ بہت مختصر یا حذف کر دیا گیا ہے جو بالعموم ان حقائق اور دلائل کی تکرار پر مبنی تھا جو اس سے پہلے کے ابواب میں تفصیل سے آ چکے ہیں۔

باب کا آخری حصہ [صفحہ ۱۶۹] ان تجاویز پر مشتمل ہے جو سینیٹ کمیٹی نے بجٹ ۰۹-۲۰۰۸ء کے حوالہ سے مرتب کی تھیں اور سینیٹ میں قائد ایوان، قائد حزب اختلاف اور فنانس کمیٹی کے چیئرمین کی جانب سے کہنے پر پروفیسر خورشید احمد نے پیش کیں۔

جناب چیئرمین! میں وزیر خزانہ سے ہمدردی کے جذبات کے ساتھ بجٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ انہیں اس بجٹ کو تیار کرنے میں چند ہفتوں سے زیادہ مدت نہیں ملی ہے اور مجھے اس بات کا بھی پورا احساس ہے کہ گزشتہ آٹھ، ساڑھے آٹھ سالوں میں جن معاشی پالیسیوں پر عمل کیا گیا، وہ نمائشی زیادہ اور حقیقی ترقی کی ضامن کم تھیں۔

جناب والا! سابقہ حکومت کے پہلے اڑھائی، تین سال شدید بحران کے رہے۔ البتہ ۰۲-۲۰۰۱ء کے بعد پالیسی کی بناء پر نہیں، بغیر پالیسی عوامل اقتصادی معاملات میں کچھ آسانی ہوئی۔ ایک جانب بین الاقوامی قوتوں کے ساتھ اپنی آزادی اور عزت کو قربان کر کے ہم نے کچھ وسائل حاصل کیے۔ یا کچھ وسائل حالات کی تبدیلی کی بنا پر آپ سے آپ آئے جن میں بیرونی ترسیلات زر کا بڑا اہم کردار تھا کہ وہ ایک بلین ڈالر سالانہ سے بڑھ کر ۶ بلین ڈالر سالانہ

ہو گئے۔ اس زمانے میں بیرون ملک پاکستانیوں سے ۲۵ سے ۳۰ بلین ڈالر ہمیں ایسے حاصل ہوئے جن پر ہمیں نہ کوئی سود دینا تھا، نہ اسے واپس کرنا تھا۔ یہ ایک ایسی مالیاتی گنجائش تھی جو کسی اور حکومت کو اس سے پہلے حاصل نہیں ہوئی تھی، لیکن ان تمام چیزوں کو بدقسمتی سے محض نمائشی اور سطحی انداز میں استعمال کیا گیا۔

۲۰۰۷ء میں جو سیاسی بحران پیدا ہوا، خاص طور پر ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو عدلیہ پر حملہ کے ساتھ ہی معاشی پھیلاؤ سکڑنا اور پھیلنا شروع ہوا اور اس کے پورے اثرات ۲۰۰۷ء کے آخر میں اور ۲۰۰۸ء کے شروع تک افراط زر اور خاص طور سے اشیاء خوردنی کی شدید مہنگائی کی صورت میں وقوع پذیر ہوئے۔ پھر اس کے ساتھ بجٹ خسارہ، تجارتی توازن کا خسارہ، ادائیگیوں کے توازن کا خسارہ، بیرونی قرضوں کا بوجھ اور پھر ان آٹھ سالوں میں ملکی قرضوں میں ۱۰۰ فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے کے طور پر قرضوں کے اخراجات اور سود کے خرچے میں بھی حکومت نے اسٹیٹ بینک سے خطیر رقم کے قرض لیے ہیں۔ یہ بڑی گھمبیر صورتحال تھی۔

ناانصافی ہو گی اگر میں اس کا سارا بوجھ موجودہ حکومت اور وزیر خزانہ پر ڈال دوں۔ لازماً پچھلی حکومت کو اپنی ناکام، سطحی اور غیر متوازن پالیسی کی ذمہ داری قبول کرنی ہو گی اور آج اگر وہ اس حکومت پر اپنے ریکارڈ کو نظر انداز کر کے حملہ آور ہوتے ہیں تو وہ حق و انصاف کے مطابق نہیں ہے۔ میں اپوزیشن میں ہونے کے باوجود حقائق اور انصاف کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں۔ اس لیے میں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس حکومت کو ورثے میں جو صورتحال ملی وہ بڑی غیر معمولی بلکہ میری نگاہ میں تو پاکستان کی ۶۱ سالہ تاریخ میں جو اقتصادی بحران اور پیچیدہ صورتحال ان کو ملی ہے وہ اس سے پہلے کسی اور کو نہیں ملی تھی۔ اس بناء پر میں ہمدردی کے ساتھ ان کے بجٹ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

سالانہ معاشی جائزہ: جناب والا! ہمیں جو اقتصادی سروے دیا گیا ہے، اس کے جس پہلو پر بھی آپ نگاہ ڈالیں صورت حال حوصلہ افزا نظر نہیں آتی۔ یعنی جی ڈی پی میں اضافہ کی توقع تھی

۲ء۷ فیصد عملاً وہ ۸ء۵ ہوا ہے۔ دوسری جانب موازنہ کے لیے نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ہندوستان میں جی ڈی پی میں اضافہ ۹ فیصد ہوا ہے اور ۵ سال کا ۸ء۸ فیصد اوسط ہے۔ سری لنکا میں جنگ کی کیفیت ہے لیکن وہاں بھی یہ اضافہ ۷ء۷ فیصد ہوا ہے۔ افغانستان کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں لیکن ۲۰۰۶ء میں وہاں اضافہ ۵ء۷ فیصد اور ۲۰۰۷ء میں ۱۳ فیصد ہوا ہے۔ بنگلہ دیش ۵ء۶ فیصد، لیکن ہمارے ہاں ۸ء۵ فیصد رہا۔

دعویٰ یہ تھا کہ افراط زر کا ہدف ۵ء۶ فیصد ہو گا، جو اعداد و شمار سروے میں آئے وہ ۳ء۱۰ فیصد کے ہیں، لیکن آج کے اخبارات میں مئی کے بارے میں جو اعداد آئے ہیں وہ ۲ء۱۹ فیصد سے لے کر ۲۸ اور ۲۹ فیصد تک ہیں۔ یہ افراط زر کی کیفیت ہے۔ اگر آپ اس کا موازنہ باقی ممالک سے کریں تو افغانستان میں یہ افراط زر ۲۰۰۶ء میں ۱ء۵ فیصد اور ۲۰۰۷ میں ۹ء۵ فیصد تھا۔ بنگلہ دیش میں ۲ء۷ فیصد تھا۔ ہندوستان میں ۲۰۰۶ء میں ۷ء۶ فیصد اور ۲۰۰۷ء میں ۵ء۵ فیصد تھا، بھوٹان میں ۵ فیصد، نیپال میں ۴ء۶ فیصد، مالدیپ میں ۷ فیصد تھا لیکن ہمارے ہاں ۱۹ فیصد اور ۲۹ فیصد کی خبر لا رہا ہے۔ مالیاتی خسارہ کی توقع ۴ فیصد تھی، اب جو دعویٰ کر رہے ہیں وہ ۷ فیصد ہے حقیقتاً یہ ۸ سے ۹ فیصد کے درمیان ہے۔

جناب چیئرمین! ہمارے یہاں قانون کا احترام کہیں بھی نہیں ہے، جب دل چاہتا ہے دستور کو معطل کر دیتے ہیں، پس پشت ڈال دیتے ہیں اور کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ چنانچہ ملک میں مالیاتی نظم و ضبط کی بھی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ جناب والا! مالیاتی نظم و ضبط کے حوالہ سے وہ قانون آپ کو یاد ہو گا جو بڑے دعوے کے ساتھ منظور کیا گیا تھا ضمناً میاں رضا ربانی کو یاد دلاؤں کہ اس کے بارے میں ایک متفقہ ترمیم اس ایوان نے تجویز کی تھی جو کہ آج تک میرے علم کے مطابق قانون کا حصہ نہیں بن سکی، مجوزہ ترمیم کا تقاضا یہ تھا کہ جو رپورٹس اس سلسلہ میں آئی ہیں وہ سینیٹ میں بھی آئیں۔ قطع نظر اس ترمیم کے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ مالیاتی نظم و ضبط کے قانون کی رو سے مالیاتی خسارہ کبھی بھی ۵ء۴ فیصد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری جانب اس کی رو سے ہر سال قرضوں سے کم از کم ۵ء۲ فیصد

فراغت ہونی چاہیے جبکہ آپ کے ہاں فراغت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں اس وقت صحیح اعداد نہیں ہیں کہ کتنا قرض بڑھا ہے۔ لیکن اس پورے زمانے میں قرضہ بڑھا ہے کم نہیں ہوا ہے۔ جناب والا! اس سلسلے میں اپنے ہی کیے ہوئے وعدے سے انحراف شدید لا قانونیت اور محتاط اقتصادی پالیسی کی تشکیل کے خلاف ہے۔

آپ سارے اشاریے دیکھ لیجیے۔ یہ ہر ایک میں پیچھے رہے ہیں۔ میں بڑے دکھ سے کہوں گا کہ شاید ہمارے وزیر خزانہ اتنے مصروف تھے کہ جس دستاویز کو انہوں نے اپنے دستخطوں سے پیش کیا ہے اسے شاید پڑھا بھی نہیں ہے۔ اس تحریر میں اقتصادی ترقی تیز تر ہونے کی بات کی گئی ہے اگر تیز تر ترقی یہ ہوتی ہے جس کی کہ تصویر ابھی میں نے آپ کے سامنے پیش کی اور آپ ہی کی دستاویزات سے پیش کی تو یہ کس طرح قابل فہم قرار دی جا سکتی ہے۔ مجھے توقع نہیں ہے کہ انہوں نے اس پر دستخط پڑھنے کے بعد کیے ہوں گے۔ یہ ہماری حکمرانی کا عمومی انداز ہے۔

جناب والا! میں نے ایک مثال دی ہے۔ ایسی دسیوں مثالیں میں دے سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر غربت بہت بڑا اور گھمبیر مسئلہ ہے۔ غربت کے سلسلے میں جو اعداد و شمار شوکت عزیز صاحب کے زمانے میں پیش کیے گئے وہ قطعاً قابل اعتبار نہیں۔ تمام آزاد ماہرین معیشت جنہوں نے جائزہ لیا ہے اسے رد کیا ہے۔ شوکت عزیز صاحب کے زمانے میں بنیادی حوالے کے لیے جو سال لیا گیا وہ قحط سالی کا اور خراب ترین سال تھا۔ دوسری جانب جس سال سے موازنہ کیا گیا اس میں ترقی کی شرح سب سے اونچی ہے۔ یہ شماریات کے اصولوں کے ہی نہیں پیشہ ورانہ وقار کے خلاف بھی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ موجودہ وزیر خزانہ نے خود اسی سارے مواد کو دوبارہ اس کے اندر شامل کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ہی یہ کہا گیا ہے کہ جو کام ہم نے کیا ہے عالمی بینک نے اس کی تائید کی ہے۔ جناب والا! عالمی بینک کی رپورٹ میں نے خود پڑھی ہے انہوں نے کہا ہے ہمیں اصولوں پر اختلاف نہیں تاہم اگر ان ہی اصولوں کو استعمال کیا جائے تو چار سال کے اندر ۱۰ فیصد غربت میں کمی کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ

ساری معلومات دیے بغیر آپ نے کہہ دیا ہے کہ:

Our result has been endorsed by the World Bank. This is dishonest.

آزاد ماہرین معیشت نے اسی عرصے کا جو سروے کیا ہے، ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس وقت غربت ۳۴ فیصد سے زیادہ ہے۔ جناب والا! یہ ساری باتیں میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خدا کے لیے اعداد و شمار کے بارے میں غلط بیانی سے کام نہ لیجیے، وہ اچھے ہوں یا برے ہوں، آپ کے پسندیدہ ہوں یا ناپسندیدہ ہوں، جب تک صحیح حقائق نہیں ہوں گے اس کے بغیر کوئی صحیح پالیسی نہیں بنائی جاسکتی۔ اس بنا پر یہ بات بہت ضروری ہے کہ موجودہ حکومت حقائق کا سامنا کرے، قوم کو اعتماد میں لے اور بتائے کہ حالات خراب ہیں اور پھر پالیسی بنائے کہ ہم اس کا اس طرح سامنا کریں گے۔

اقتصادی مسائل کی سیاسی وجوہات: جناب والا! اس وقت ملک میں معاشی بحران کی اقتصادی وجوہات تو ہیں لیکن سیاسی وجوہات بھی ہیں۔ نائن الیون کے بعد سیاسی وجوہ سے ہمیں اقتصادی مواقع ملے ہیں اسی طرح اس وقت کی عالمی صورت حال میں تیل اور خوراک کی قیمتوں کے بڑھنے کے اثرات بھی پڑے ہیں، اس سے بھی انکار نہیں ہے۔ لیکن داخلی پالیسی کی ناکامی ایک بڑا عامل ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عدلیہ کی بحالی کا سب سے نازک مسئلہ جسے نئی حکومت کو اقتدار میں آنے کے بعد پہلے ہفتے کے اندر طے کر دینا چاہیے تھا اس میں انہوں نے تاخیر کی۔ وزارت عظمیٰ کا حلف لینے کے بعد وزیراعظم گیلانی کی حکومت کو پہلا کام یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ ججوں کو بحال کرتے۔ یہ وہ غلطی ہے جس کی وجہ سے سیاسی غیر یقینی اور معاشی غیر یقینی یا عدم استحکام دونوں ہوئے ہیں۔

جناب والا! موجودہ بجٹ میں اس ملک کے قانون اور دستور کے ساتھ بھی ایک مذاق یہ ہوا ہے کہ مالیاتی بل میں ایک ترمیم کے ذریعے سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد کو بڑھایا گیا ہے۔ یہ ظلم، بددیانتی اور ایک دھوکا ہے۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ یہ حکومت اس حد

تک جائے گی۔ جناب والا! معاشی اور سیاسی حالات کو جدا کر کے غور نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ یہ ان کی غلطی ہے اور اب بھی اگر یہ اس معاملے میں کوئی بروقت اقدام نہیں کرتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بہت بڑی قیمت انہیں ادا کرنی پڑے گی۔

جناب والا! جو غلطیاں ان کے پیش رونے کیں مجھے ڈر ہے کہ یہ وہی کر رہے ہیں۔ یہ بجٹ میں نے بغور پڑھا ہے، وزیر خزانہ کی تقریر کو میں نے بغور سنا بھی اور دوبارہ پڑھا بھی ہے۔ اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ یہ بجٹ کسی ایسی ٹیم نے بنایا ہے جس نے ۱۸ فروری کے انتخابی مینڈیٹ کو سامنے رکھا ہو۔ اس بجٹ کے پیچھے وہی ذہن کام کر رہا ہے جو اس سے پہلے بجٹ بناتا رہا ہے۔ سجاوٹ کے لیے چند باتیں کی گئی ہیں لیکن ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

زراعت سے متعلق امور: زراعت کے بارے میں بجٹ میں جو چند باتیں کہی گئی ہیں، اگر ان پر عمل ہو تو اس سے فائدہ ہو گا لیکن یہ ناکافی ہیں۔ زراعت میں اصل مسئلہ کیا ہے؟ زراعت میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ زیر کاشت اراضی میں اضافہ نہیں ہوا۔ آب پاشی والے علاقے کا تناسب بہتر نہیں ہو پا رہا۔ آب پاشی میں پانی کا ضیاع ہے۔ کپاس کی کمی کا بھی خطرہ ہے لیکن اب تک جو تحقیقات ہوئی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فوری مسئلہ پانی کے انتظام کا ہے۔ اگر پانچ سال تک ہم نے اس کی فکر نہ کی تو پانی کی مقدار کے حوالہ سے بحران آئے گا۔ چنانچہ پانی کے انتظام کے بارے میں انہوں نے چند باتیں کی ہیں یعنی نہروں کو پختہ کرنا اور نالے ٹھیک کرنا، لیکن اس کا پورا پور اظہار ترقیاتی منصوبے میں نہیں ہے۔ اس کے بعد آب پاشی اور آب پاشی کے طریقے ہیں۔ اس کے بعد ہمارا مسئلہ فی ایکڑ پیداوار یعنی پیداواریت کم ہونے کا ہے۔ پیداوار کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ صحیح بیج ہو اور صحیح وقت پر اس کی بوائی ہو۔ بیج کے بارے میں کیا ہو رہا ہے؟ لوکل بیج کم سے کم استعمال ہو رہا ہے اور درآمدی بیج آپ استعمال کر رہے ہیں۔ جناب والا! اس بارے میں رپورٹ پڑھ کر میں دکھی اور حیران بھی ہوا کہ بین الاقوامی کمپنیاں جو بیج ہمیں فراہم کر رہی ہیں، انہوں نے اسے جنیاتی طور پر

اس طریقے سے تیار کیا ہے کہ اس بیج سے نیا بیج پیدا نہیں ہو سکتا۔ تاریخی طریقہ یہ تھا کہ فصل سے بیج نکلتا تھا اور اس بیج سے آپ آگے فصل لیتے تھے تو اب انہوں نے اس کو بانجھ کر دیا ہے۔ ایسا کیوں کیا ہے تاکہ آپ ان کے بیج کو درآمد کریں، زرمبادلہ خرچ کریں، ان پر آپ کا انحصار بڑھے اور آپ کبھی ان کے چنگل سے نکل نہ سکیں۔ ان معاملات میں کوئی پیش بینی نہیں ہے۔

اس کے بعد قرضوں کی بات ہے۔ زرعی قرضے تھوڑے بہت اضافے کے باوجود سنجیدہ مسئلہ ہیں۔ بدقسمتی سے سندھ میں پنجاب سے بھی زیادہ خراب صورتحال ہے جہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نصف سے زائد ہاریوں کی تعداد جاگیرداروں یا Moneylenders کے ہاتھوں یرغمال ہوتی ہے۔ جب تک آپ زرعی قرضہ جات کے بارے میں کوئی صحیح پالیسی اختیار نہیں کریں گے اور وہ بھی نچلی سطح [مائیکرو لیول] کے اوپر اور مسابقتی شرائط پر اس وقت تک معاملہ درست نہیں ہو سکتا۔

پھر کھاد کا مسئلہ ہے اس کی قیمت کم ہونی چاہیے۔ زرعی اصلاحات کے ضمن میں جو اصل کرایہ دار کاشتکار ہے، آپ اس کے مسائل کی طرف نہیں آئے ہیں۔ آپ نے جو چند نمائشی چیزیں کی ہیں ان سے وہ بنیادی فرق نہیں پڑے گا جو وقت کی ضرورت ہے آپ عالمی منڈی میں اپنی زرعی پیداوار کو ایک بڑی سطح پر لے جاسکتے ہیں بشرطیکہ آپ کی زرعی پالیسی صحیح ہو لیکن مجھے اس کی کوئی جھلک اس بجٹ میں، اس ترقیاتی منصوبے میں اور اس سرکاری شعبے کے ترقیاتی منصوبے میں نظر نہیں آرہی۔

غریبوں کے لیے نقد امداد کی حکمت عملی: جہاں تک نقد امدادی بے نظیر کارڈ ہے۔ اصولی طور پر میں اس کی تائید کرتا ہوں، لیکن جناب والا! بطور معیشت دان میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ غربت کے خاتمہ کے لیے ایک بڑے منصوبے کی ضرورت ہے۔ تاریخ سے سبق سیکھیے۔ نقد امداد ایک اچھی تجویز ہے لیکن صرف اس وقت جب آپ کے پاس ایک قومی سوشل سیکورٹی سسٹم ہو جس کے ذریعے سے آپ وہ ڈھانچہ پیدا کرلیں جو حقیقی ضرورت مند

تک آپ کو پہنچا سکے اور یہ شفاف ہو۔ یورپ کے ممالک میں قومی سوشل سیکورٹی سسٹم بنائے گئے ہیں، ان میں کامیاب بھی ہیں اور ناکام بھی ہیں۔ میں یہ صاف کہنا چاہتا ہوں کہ امدادی نوعیت کی نقد امداد صرف بچوں، بیواؤں، بوڑھوں اور معذوروں کے لیے ہونی چاہیے۔ یہ چار اقسام ہیں اور ان کا حق ہے، ان کو ملنا چاہیے۔ لیکن اگر باقی لوگوں کو آپ نقد امداد دیتے ہیں تو وہ بھیک کی صورت میں اس پر مستقل انحصار کرتے ہیں۔ باقی لوگوں کے لیے آپ کوشش کریں کہ انھیں روزگار ملے، ان کو قرضے دیں اور ان کے لیے وہ مواقع فراہم کریں جہاں وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

ہمارے سوشل سیکورٹی نظام میں زکوٰۃ کے نظام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نظام میں فوری امداد کے علاوہ ایک اہم اسپرٹ یہ ہے کہ معاشرے کے افراد کو اس لائق بناؤ کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کا مشہور واقعہ ہے جس میں انہوں نے ایک شخص کو تین اونٹ زکوٰۃ سے دیے۔ صحابہ کرامؓ نے یہ سوال کیا کہ امیر المومنینؓ آپ تین اونٹ اس ایک فرد کو کیوں دے رہے ہیں؟ آپ کا جواب تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا! میں اسے تین اونٹ اس لیے دے رہا ہوں کہ اگلے سال یہ زکوٰۃ دینے والا بنے، زکوٰۃ لینے والا نہ بنے۔ درحقیقت سوشل سیکورٹی سسٹم اور غربت میں کمی کا وہی پروگرام کامیاب ہو سکتا ہے جو روزگار کے مواقع پیدا کرے اور ہر فرد کو پیداواری سرگرمی میں شریک کرے۔ ہماری خواتین نے گھر میں صرف کھانا پکانے کا کام نہیں کیا ہے ہماری خواتین نے گھریلو صنعتوں کو فروغ دیا ہے اور اپنے خاندانوں کو سپورٹ کیا ہے۔ آپ کپڑے دھونے والی مشینیں، کپڑے سینے والی مشینیں، چھوٹی موٹی امداد کی چیزیں مہیا کر کے ان کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ وہ اپنی روزی کمائیں، عزت سے رہیں اور آپ کی محتاج نہ رہیں۔

جاپان کے ماڈل کو آپ دیکھیں۔ جاپان نے کوشش کی کہ دیہات میں ہر گھر کو بجلی فراہم کر کے تقسیم کا ایسا سسٹم بنائیں کہ ہر گھر ایک پیداواری مشین بن جائے۔ اس کے بعد

انھوں نے نظام بنایا کہ ہر بیس دیہات کے اوپر خام مال دیتے تھے اور تیار شدہ مصنوعات لیتے تھے، پھر یہ تیار شدہ مصنوعات آگے استعمال کی جاتی تھیں۔ آپ یہ کام کیجیے۔ اس کے لیے وقت، سوچ بچار، صحیح ویژن اور سب سے بڑھ کر سیاسی عزم کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی ترقی میں سب سے بڑا مسئلہ ایک منصوبہ بندی ہے جو نہ ملک کے ذہن سے کی جاتی ہے، نہ ملک کے حالات سامنے رکھ کر کی جاتی ہے اور نہ اس میں تمام متعلقہ فریقین کو شامل کیا جاتا ہے۔

ترقیاتی منصوبوں کی صورت حال: جناب چیئرمین! میں تین چار سال پہلے عالمی بینک کی شائع کردہ ایک رپورٹ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، جس میں عالمی بینک نے یہ صاف کہا ہے کہ موجودہ حالت میں یہ منصوبہ بندی کمیشن، منصوبوں اور کامیابیوں کے اعتبار سے وسائل کا ضیاع ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ ہمیں منصوبے ملتے ہیں لیکن منصوبوں کی تکمیل کی کوئی رپورٹ نہیں ملتی۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں اور میں میاں رضا ربانی کو دعوت دوں گا کہ اس وقت آپ پی ایس ڈی پی کے تقریباً ۳۰۰ منصوبوں پر کام کر رہے ہیں، اس ایوان کے سامنے لائیے کہ یہ منصوبے کب شروع ہوئے ہیں، کتنا ان پر خرچ ہوا ہے اور کیا کامیابیاں ہیں؟

جناب والا! عالمی بینک کی اس رپورٹ کے مطابق، وہ کہتے ہیں کہ منصوبوں کے اخراجات ۳۰ سے ۳۰۰ فیصد تک بڑھ گئے۔ تکمیل کا عرصہ تین سال سے تیس سال تک بڑھا ہے اور پھر بھی ہمیں معلوم نہیں ہو رہا ہے کہ منصوبہ کا نتیجہ کیا ہوا ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اگر منصوبے کے نتیجے کے طور پر اثاثے نہیں بنتے، تو اس کا مطلب صرف قرضوں کا بوجھ ہی بڑھنا ہے۔

ایک تازہ ترین رپورٹ جو ابھی ایک حکومتی ادارے کی طرف سے ہی آئی ہے اس کے مطابق اس وقت ۱۲۷۰۰ اسکول بند ہیں، میں پھر کہوں گا کہ سندھ میں بدقسمتی سے سب سے زیادہ بند اسکول ہیں۔

جناب والا! یہی کیفیت ہر جگہ ہے۔ کرپشن، تفویضی نظام کا نہ ہونا، شفافیت کی کمی،

احتساب اور نگرانی کی عدم موجودگی جب تک ان تمام امور پر آپ توجہ نہیں کریں گے آپ ملک کی معیشت کا رخ تبدیل نہیں کر سکتے۔

ٹیکس کا نظام: جناب والا! ٹیکسوں کے سلسلے میں بھی، اس سے پہلے اسی ایوان نے بار بار یہ بات کہی کہ ہم اپنے غریبوں کو ٹیکس دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ بالواسطہ ٹیکس ایک بڑھتا ہوا ٹیکس ہے، اس کا سب سے زیادہ بوجھ غریبوں پر پڑتا ہے۔ آپ کے بالواسطہ ٹیکس عملاً ۷۰ فیصد ہیں، براہ راست بمشکل ۳۰ فیصد ہیں۔ آپ کو ایک نئی ٹیکس پالیسی کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ آپ امیر طبقے کو ٹیکس نیٹ ورک میں لا سکیں۔ لیکن آپ کا حال کیا ہے؟ یہ سینیٹ ہر سال تجویز پیش کر رہا ہے کہ کیپٹل گین ٹیکس لایئے۔ لیکن ابھی آپ نے اس بارے میں ذرا سا اشارہ ہی کیا تھا کہ اسٹاک ایکسچینج کے بڑے بڑے مگرمچھ آپ کے پاس آگئے اور آپ سے مزید دو سال کے لیے چھوٹ کی ضمانت لے گئے۔ اگر گورننس کا یہ طریقہ ہے آپ کا تو یہ پچھلے والوں سے کہاں مختلف ہے اور اس سے تبدیلی کیسے آئے گی۔

جائیدادوں کے لیے آپ ٹیکس لائے ہیں، اصولی طور پر میں اس کے حق میں ہوں لیکن جو آپ لائے ہیں وہ بھی رجعت پسند ہے۔ اس میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ پانچ مرلے کے پلاٹ کو بالکل معاف کرنا چاہیے۔ اس کے بعد پلاٹ سائز اور پلاٹ کی لوکیشن دونوں کی روشنی میں ایک بڑھتا ہوا پیمانہ ہونا چاہیے۔ ہم سب یہ کہتے ہیں کہ ٹیکس کی شرح بہت کم ہے اور حقیقت میں یہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے تیسری دنیا کے ممالک کی اوسط ۱۷-۲۰ فیصد کے مقابلہ میں ہمارے یہاں محض ۱۰ سے ۱۱ فیصد ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک کی تو اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن بالواسطہ ٹیکسوں کو اندھا دھند بڑھائے چلے جانے کی بجائے جامع حکمت عملی کے تحت براہ راست ٹیکس بڑھائے جانے چاہییں۔

غیر ترقیاتی اور ترقیاتی اخراجات میں توازن اور ترجیحات: جناب والا! پچھلے دس پندرہ سال میں مالیاتی خسارہ کی بنیادی وجہ ضرورت سے زائد اور محض پیسے کے ضیاع پر مبنی غیر ضروری اور غیر ترقیاتی اخراجات ہیں۔ پچھلے سال آپ نے چھ جہاز خریدے، ایک صدر کے لیے،

ایک پرائم منسٹر کے لیے، چار چیف منسٹر ز کے لیے۔ اس سال جب کہ غربت میں اضافہ ہو رہا تھا، لوگ فاقہ کشی کر رہے تھے اور گلیوں میں چلا رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید نئی حکومت اس معاملے میں کوئی اچھا رویہ اختیار کرے گی۔ لیکن صورت حال مایوس کن ہے۔ پہلا جو سعودی عرب کا دورہ آپ نے کیا ہے، اس کے بارے میں اگر اخبارات کی اطلاع صحیح ہے، تو اس وفد میں ۸۶ افراد شریک تھے۔ یہ بھی رپورٹ ہے کہ دورے کے دوران ۴ دن تک پی آئی اے کا جہاز انتظار کرتا رہا ہے جس سے اس کی آمدنی کا بھی نقصان ہوا ہے۔ اگر یہ مثال آپ قائم کریں گے تو ہم عوام سے تعاون کی توقع کیسے رکھیں، جب تک آپ کے پیٹ پر دو پتھر نہ ہوں عوام ایک پتھر نہیں باندھیں گے۔ عوام قربانی دیں گے، لیکن اسی وقت جب کہ آپ اپنی مثال قائم کریں گے۔ اس لیے بڑے پیمانے پر غیر ترقیاتی اخراجات میں کمی کی ضرورت ہے۔ میں خوش آمدید کہتا ہوں کہ پرائم منسٹر نے ۳۰ فیصد کم کیا ہے۔ میں آپ کو بھی اور نیشنل اسمبلی کو بھی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ آپ لوگوں نے اپنے اپنے بجٹ کو گھٹایا ہے اور میرا خیال ہے ہمیں مزید یہ کرنا چاہیے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ پچھلے پانچ چھ سال میں غیر ترقیاتی شعبے کا بجٹ بے تحاشا طور پر بڑھا ہے۔ جب تک آہنی ہاتھوں سے آپ اس کو قابو نہیں کریں گے، آپ معیشت میں توازن نہیں لا سکتے۔

میں اس ضمن میں یہ بھی کہوں گا کہ آپ کے ترقیاتی اخراجات بھی کمزور منصوبہ بندی کے ہیں اور صحیح ترجیحات کی عکاسی نہیں کرتے۔ حقیقت میں نہ منصوبے صحیح ہیں اور نہ منصوبوں کی جانچ پڑتال صحیح ہے۔ بر وقت فنڈز کی فراہمی اور پھر ان کا مالیاتی اور طبعی آڈٹ بھی متاثر ہے۔ بجٹ دستاویز کے مطابق سرکاری محکموں اور وزارتوں کے علاوہ پانچ سو سے زیادہ خود مختار کمیشن، ادارے اور تنظیمیں ہیں، میرا خیال ہے کہ ان میں سے ۱۰ فیصد بھی پیداواری نہیں ہیں۔ یہ پیسہ کہاں جا رہا ہے، یہ ضیاع ہے۔ جس طرح وسائل کو حرکت دینا ضروری ہے، اسی طرح اخراجات کی بھی صحیح صحیح جانچ، اس کی ترقی اور صحیح مدات میں لگانا اور ترقیاتی اور غیر ترقیاتی اخراجات میں توازن اور دونوں میں کہاں کہاں چھانٹی ہو سکتی ہے ہمارا

ایجنڈا ہونا چاہیے۔ ہمیں دو ٹریلین روپے کا عدد نہیں چاہیے۔ یہ ایسا موٹاپا ہے جو طاقت نہیں دیتا، ہمیں وہ صحت مند نظام چاہیے جو متحرک ہو، جو کارکردگی دکھا سکے۔

جناب والا! عوامی نقطہ نظر اب بہت بدل رہا ہے۔ آج کے عوام وہ نہیں ہیں جو چند سال پہلے ہوتے تھے۔ برقی ذرائع ابلاغ نے ذہنوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے اور یہ ایک مثبت چیز ہے۔ لیکن اگر آپ نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا، اپنے رخ کو نہیں بدلا تو عوامی غم و غصہ کوئی بھی رخ اختیار کر سکتا ہے۔ حقیقت میں ہمیں ترقی چاہیے ایسی ترقی جو دیرپا ہو اور جو عیب دار نہ ہو، وہ ترقی جو متوازن ہو، جس میں ترجیحات صحیح ہوں اور وہ ترقی جس کے نتیجے کے طور پر ملک میں غربت کم ہو، روزگار بڑھے، لوگوں کو ضروریات زندگی مل سکیں، قیمتوں میں استحکام ہو اور ہمیں خود انحصاری حاصل ہو۔

جناب والا! میں توقع رکھتا ہوں کہ سینیٹ سے جو تجاویز آئیں گی حکومت کھلے ذہن کے ساتھ ان کو کوئی اہمیت دے گی اور ان کے نتیجے میں بجٹ میں تبدیلی کرے گی۔ یہ جو ایک رواج بن گیا ہے کہ بجٹ میں جو کہہ دیا گیا ہے بس کہہ دیا گیا اب بس اسے قبول کر لیا جائے یہ صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ بجٹ میں حسب ضرورت نظر ثانی فلور پر ہونی چاہیے۔

میری نگاہ میں اس بجٹ کی کلی طور پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ ان دعوؤں، ان توقعات، ان امیدوں، ان عزائم اور ان وعدوں کا، جو آپ نے قوم سے کیے ہیں، صحیح عکاس نہیں ہے۔ میں ہمدردی کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن میرا فرض ہے کہ میں یہ بات کہوں کہ اگر آپ اس بجٹ کی ترقیاتی حکمت عملی کا رخ تبدیل نہیں کرتے ہیں تو پھر ہم مشکلات کی طرف جا رہے ہیں، سہولت اور استحکام کی جانب نہیں۔

(۱۴جون ۲۰۰۸ء)

سینیٹ فنانس کمیٹی کی تجاویز

جناب چیئر مین! سینیٹ فنانس کمیٹی کی تجاویز کی وضاحت کے لیے موقع دینے پر میں خصوصیت سے قائد ایوان، قائد حزب اختلاف اور چیئر مین فنانس کمیٹی کا ممنون ہوں۔ سینیٹ نے متفقہ طور پر منظوری کے لیے ۷٦ تجاویز پیش کی ہیں۔ ان میں سے ۳۷ کا تعلق قانون میں متعین تبدیلیوں سے ہے جبکہ ۳۹ سفارشات کا تعلق ٹیکسیشن، پالیسیوں، ترجیحات اور بجٹ کے ذریعے سے معاشی اصلاحات کے بارے میں تجاویز پر سینیٹ کے رد عمل سے ہے۔

جناب چیئر مین! ان ۷٦ تجاویز کے علاوہ اس مرتبہ فنانس کمیٹی نے یہ کام بھی کیا ہے کہ سینیٹرز کی وہ تمام تجاویز بھی اس دستاویز میں شامل کر دی ہیں جو اگرچہ براہ راست بجٹ سے متعلق نہیں لیکن ہماری نگاہ میں یہ اپنی اہمیت کی بناء پر حکومت کے سامنے آنی چاہییں اور ان سفارشات پر متعلقہ محکمہ، وزارت یا ادارے کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ ایسی تجاویز کی تعداد ۳۱ ہے اور کمیٹی کا خیال یہ ہے کہ ان تجاویز کا ہم مسلسل پیچھا کریں گے۔ مختصراً میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے چار کا تعلق وزیراعظم کے دفتر سے ہے، سات کا منصوبہ بندی کمیشن سے، پانچ کا فنانس سے، دو کا پٹرولیم، توانائی و آبی وسائل اور صحت سے اور اس کے بعد پھر ایک، ایک تقریباً نو مزید وزارتوں کے بارے میں ہیں۔ اس طرح ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ سینیٹرز نے جو محنت کی ہے اور بجٹ میں جتنی بھی چیزیں ہمارے سامنے آئی ہیں ان سب کو نہ صرف یہ کہ خود دیکھیں بلکہ سینیٹ کمیٹیوں کے ذریعے ان کو آگے بڑھائیں۔

جناب والا! اب جو بجٹ سے متعلق ۳۹ تجاویز ہیں، میں ان پر آتا ہوں۔ ان میں سینیٹ نے بجٹ بنانے کے طریقہ کار کو بہتر بنانے کے لیے بڑی اہم تجاویز دی ہیں۔ جناب چیئر مین! یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ قومی اسمبلی اسے نظر انداز کر رہی ہے۔ نئے آئینی پیکج کے اندر ایک مسئلہ لایا گیا ہے لیکن اس مسئلے کو زیادہ سنجیدہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہماری نگاہ میں اس میں کم از کم چار تبدیلیاں ضروری ہیں۔

بجٹ سازی اور سینیٹ کا کردار

۱۔ یہ کہ بجٹ بنانے کا عمل محض چودہ پندرہ دن کے اندر نہ کیا جائے بلکہ اس کے لیے وقت کو بڑھایا جائے۔ ہم نے ۶۰ سے ۷۵ دن تجویز کیے ہیں۔ اس کا آغاز اس طرح ہونا چاہیے کہ پہلے بجٹ کے عام حصوں پر بحث ہو، اس کے بعد بجٹ تیار ہو اور پھر وہ بجٹ پارلیمنٹ کی کمیٹیوں، اسمبلی اور سینیٹ دونوں میں آئے۔ جہاں بحث کے بعد بجٹ منظور کیا جائے۔ یہ بہت ہی اہم تجویز ہے اس طرح اس طریقہ کار میں پارلیمانی کمیٹیوں اور پارلیمنٹ کے کردار اور بجٹ سازی کے لیے کل وقت، یہ تین چیزیں سامنے رکھی گئی ہیں۔

۲۔ جناب والا! دوسری اہم چیز یہ ہے کہ سینیٹ کی تجاویز کے لیے اسمبلی کم از کم دو گھنٹے بحث کے لیے رکھے۔ یہاں میں خاص طور پر وزراء حضرات کی توجہ چاہتا ہوں کہ سینیٹ ممبران میں سے جو وزراء اسمبلی میں موجود ہوں گے ہم ان کی ذمہ داری لگا رہے ہیں کہ سینیٹ کی تجاویز کو وہ وہاں پر توجہ دلائیں۔

۳۔ جناب والا! اگلا مسئلہ پارلیمنٹ کے کردار کا ہے۔ یہ بھی ایک بڑا اہم مسئلہ ہے اور اس کے بارے میں چار تجاویز سینیٹ کی ان سفارشات میں آرہی ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ جتنے بھی بین الاقوامی معاشی معاہدے اور قرضوں کے معاہدے ہیں، وہ تمام اسمبلی اور سینیٹ میں آنے چاہییں۔ اسی طرح پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے بارے میں تجویز ہے کہ اس میں سینیٹ کے ارکان بھی شامل ہونے چاہییں۔ اس طرح یہ کمیٹی مشترکہ ہو تاکہ سینیٹ کو بھی اس کے اندر اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے زور دیا ہے کہ مالیاتی بل کو غیر متعلق قوانین میں تبدیلی کے لیے استعمال نہ کیا جائے تاکہ قانون سازی کے عمل میں سینیٹ نظر انداز نہ ہو۔

۴۔ چوتھی چیز جو بڑی اہم ہے اور گو ہم نے مضاربہ ایکٹ کے ذریعے سے مخصوص

طریقے پر اس کا آغاز بھی کیا ہے لیکن ہم یہ مستقل اصول بنانا چاہتے ہیں کہ ذیلی قانون سازی کے بارے میں ضوابط کار طے کر دیے جائیں کہ یہ لازماً پارلیمنٹ میں اس کی اطلاع کے لیے آنے چاہییں تاکہ وہ ان پر نظر ثانی اور حسب ضرورت تبدیلی کر سکے۔ یہ چار چیزیں ہیں جو پارلیمنٹ کے کردار کے بارے میں تجویز کی جارہی ہیں۔

وفاقی اکائیوں کے مفادات کا تحفظ

جناب والا! سینیٹ کی خصوصی ذمہ داری ہے کہ وہ فیڈریشن اور وفاقی اکائیوں کے مفادات کا تحفظ کرے۔ اس پہلو سے ان سفارشات میں پانچ باتیں ہم نے رکھی ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ قومی مالیاتی ایوارڈ صحیح، دستوری شکل میں منظور کیا جائے۔ اس کے معنی ہیں کہ این ایف سی کو دوبارہ تشکیل کیا جائے اور اس کے ایوارڈ کی روشنی میں مالیاتی وسائل کی تقسیم ہو۔

۲۔ صوبوں کا مطالبہ یہ ہے کہ مجموعی فنڈ کا پچاس فیصد صوبوں کو جائے اور پچاس فیصد مرکز کے پاس ہو۔ اس وقت یہ ۴۳ء۷ فی صد دیا جاتا ہے[۱]۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ صوبوں کا مطالبہ تسلیم کیا جائے اور ان کو کم از کم پچاس فیصد حصہ مجموعی فنڈ سے دیا جائے۔

۳۔ تیسرا مطالبہ سرحد کے پن بجلی منافع سے متعلق کیا گیا ہے جو چھ بلین روپے سے زائد ہے اور جسے ۱۹۹۰ء سے روک دیا گیا ہے۔ یہ شدید ناانصافی ہوئی۔ تاہم اس کے بعد اتفاق رائے سے ایک ثالثی ایوارڈ آیا ہے اور ثالثی ایوارڈ کے دلائل سے بے شک اختلاف ہو لیکن جو آخری فیصلہ ہے وہ متفق علیہ ہے اور اس میں کہا گیا ہے کہ ماضی

---

[۱] یہ صورت حال اب تبدیل ہو چکی ہے۔ ساتویں این ایف سی ایوارڈ [۲۰۱۰ء] کے مطابق مجموعی فنڈ کا ۵۷ء۵ فیصد صوبوں کو جاتا ہے۔

کے منافع کے حصہ کے طور پر کم از کم ایک سو بیس بلین روپے صوبے کا حق بنتا ہے اور آئندہ کے لیے اس میں دس فیصد اضافہ کرنا چاہیے تاکہ ہر سال اس کی مناسبت سے آگے بڑھتا رہے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اسی طرح بلوچستان کا حق گیس رائلٹی اور دوسری مدات میں ان کو ادا کیا جائے۔ اگلی چیز کہ بلوچستان کی ترقی کے سلسلے میں مندوخیل صاحب کی تجاویز سے متعلق ہے۔ ہم نے پہلے بھی ان کی تائید کی ہے اس کو ہم نے پورا پورا اپنے پیکج میں شامل کیا ہے۔ یہ تمام چیزیں صوبائی خود مختاری کے لیے اس میں شامل کی گئی ہیں۔

ادارتی اصلاحات

ادارتی اصلاحات کے بارے میں بھی ایک اہم چیز اس میں آئی ہے۔ اس وقت ساری معاشی منصوبہ بندی کا انحصار شماریاتی بیورو کے اعداد و شمار پر ہے۔ اس ادارہ کی ساکھ پر ہی ملک میں اور ملک سے باہر آپ کی باتوں کی ساکھ اور اعتبار ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں اس کی خود مختاری کا مطالبہ آپ سے بار بار کیا جاتا رہا ہے۔ ہم نے مطالبہ کیا ہے کہ اس مالیاتی سال کے اندر اندر اسے لازماً خود مختار کر دیا جائے۔ ایک مطالبہ جناب والا! آپ سے بھی کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تحقیق کے لیے جو ادارہ بنایا جا رہا ہے سینیٹ کی مالیاتی کمیٹی اس قانون سازی میں معاونت کے لیے مکمل سپورٹ دے اور اس کے لیے مالیاتی رقوم مختص کرے۔

عمومی پالیسی

جناب والا! عمومی پالیسی کے بارے میں بھی بڑی اہم سفارشات کی گئی ہیں اور یہ محض خانہ پری کے لیے نہیں ہیں بلکہ سینیٹ پوری سنجیدگی کے ساتھ حکومت سے توقع رکھتی ہے کہ وہ ان پر غور کرے گی۔ ہم سے اگر بات چیت کی ضرورت ہے، بحث کرنے کے لیے تو فنانس کمیٹی موجود ہے۔ بہر حال ان تجاویز کو محض کاغذ کا حصہ نہیں ہونا چاہیے، ان کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔

۱۔ ہماری پہلی سفارش یہ ہے کہ بالواسطہ ٹیکس اس وقت بہت زیادہ ہیں، براہ راست ٹیکس کم ہیں ان کا تناسب تبدیل ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسری تجویز معاشی طور پر کمزور طبقات کو مدد فراہم کرنے سے متعلق ہے۔ جہاں ہم نقد امداد کی تجویز کو اچھا کہتے ہیں، وہیں سینیٹ یہ بات بھی کہنا چاہتا ہے کہ اصل ضرورت ملک میں سماجی تحفظ کے حوالہ سے نظام کی ہے۔ اس کو جامع ہونا چاہیے، ایک ایسا نظام جس میں وہ حقیقی مستحق جو کبھی بھی کمانے کے لائق نہیں ہوں گے، مثلاً بچہ ایسی بیوہ جس کا کوئی سرپرست نہیں ہے، بزرگ یا معذور افراد ان چاروں اقسام کو آپ نقد امداد دیں لیکن باقی لوگوں کو خیرات کے اوپر چھوڑنے کی بجائے ان کو معاشی طور پر فعال بنائیں۔ آپ کا سارا پروگرام اس بنیاد پر بننا چاہیے کہ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا ہے۔ نیز آپ قومی انشورنس لائیے، صحت کے لیے بھی، تعلیم کے لیے بھی اور ملازمت کے لیے بھی۔ ایک قابل عمل نظام ہونا چاہیے جس میں معاشرہ کے خوشحال لوگ بھی تعاون کریں اور حکومت بھی تعاون کرے۔

۳۔ ہماری تیسری تجویز کا تعلق چھوٹی اور درمیانی درجے کی صنعتوں سے ہے۔ ہمارے خیال میں معیشت کے لیے یہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن انہیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ہم نے تجویز کیا ہے کہ قرضے بلا سود ہوں البتہ قبائلی علاقوں سمیت ملک کے سارے حصوں میں سروس چارجز کی بنیاد پر ماڈل ترقیاتی علاقے بنائے جائیں۔ اس طریقے سے روزگار نچلی سطح پر فراہم کیا جاسکے گا۔

۴۔ جناب والا! ہماری چوتھی تجویز نجکاری پالیسی کے متعلق ہے۔ سینیٹ کی اس تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں ہم نجکاری پسند کرتے ہیں، وہاں اس بات کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے کہ نجکاری ملک کے تزویراتی مفادات، خود انحصاری اور سب سے اہم پارلیمنٹ کی نگرانی کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ ہمارے سامنے سرمایہ دارانہ ماڈل نہیں ہے بلکہ وہ ماڈل ہے کہ جس میں سرکاری شعبہ اور نجی شعبہ دونوں مل کر کام کریں

گے۔ پالیسی میں یہ تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ پانچویں سفارش یہ ہے کہ مالیاتی و بینکاری خدمات کو فروغ دیا جائے۔

۶۔ چھٹی زرعی قرضہ جات کے بارے میں ہے۔ زرعی ترقیاتی بینک کا ریکارڈ بڑا خراب ہے اور سینیٹ نے تجویز کیا ہے کہ اس کے اوپر خصوصی نگرانی بھی ہو اور زرعی قرضے اس کے ذریعے دینے کی بجائے وہ راستہ اختیار کیا جائے جس سے قرضوں کا بھی استعمال یقینی ہو سکے۔

۷،۸۔ دو بڑی اہم مزید تجاویز اس ضمن میں اور بھی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بینکاری کا شعبہ اس وقت سب سے زیادہ منافع میں ہے، ایک سو بلین روپے سے زیادہ ایک سال میں منافع کمایا ہے جب کہ ان کی ٹیکس شرح جو کبھی ۶۵ فیصد ہوا کرتی تھی وہ اب کم ہو کر ۳۸ فیصد ہو گئی ہے۔ ہم نے تین چیزیں تجویز کی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس شرح پر نظر ثانی کرتے ہوئے اس میں اضافہ کیا جائے۔ دوسری یہ کہ اخلاقی ترغیب یا دانش مندانہ قواعد و ضوابط سے اس کو یقینی بنایا جائے کہ بینک اپنے منافع کا ایک حصہ تعلیم اور صحت کے فروغ اور غربت کے خاتمے کے لیے استعمال کریں۔ تیسری چیز یہ ہے کہ سٹیٹ بینک اپنے تمام ذرائع استعمال کرے تاکہ بینکاری کا پھیلاؤ کچھ کم ہو۔ ہمارے ملک میں پانچ سے سات فیصد بینکاری پھیلاؤ ہے جب کہ دنیا بھر میں تین سے چار ہے جس کے نتیجے کے طور پر رقوم جمع کرانے والوں کو ان کا حق نہیں مل رہا ہے۔

۹۔ اس سلسلے کی آخری چیز یہ ہے کہ بین الاقوامی کمپنیوں کو جہاں ہم خوش آمدید کہتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ ملک میں سرمایہ کاری کریں وہیں یہ پالیسی کا لازمی جز ہونا چاہیے کہ یہ کمپنیاں اپنے منافع کا کم از کم ۲۵ فیصد اس ملک میں ہی سرمایہ کاری کریں۔

ٹیکسوں اور وسائل کی فراہمی

جناب والا! اس کے بعد بہت سی اہم تجاویز ٹیکسوں اور وسائل کی فراہمی اور اس میں شراکت کو سامنے رکھ کر دی گئی ہیں۔ فی الحقیقت سینیٹ کی کمیٹی نے پوری گہرائی میں جا کر یہ سفارشات تیار کی ہیں۔

۱۔ پہلی اہم سفارش یہ ہے کہ کیپٹل ویلیو ٹیکس جسے اسٹاک ایکسچینج کی لابی نے دو سال کے لیے رکوانے کی کوشش کی ہے اسے نہ صرف روکا نہ جائے بلکہ اسے ۰۲ء۰ سے بڑھا کر کم از کم ۴ء۰ فیصد کیا جائے۔

۲۔ جناب والا! ہماری دوسری تجویز یہ ہے کہ ہم تنخواہوں میں اضافہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ اسے صحیح قدم سمجھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم نے یہ بات بھی کہی ہے کہ وہ ملازمین جن کی تنخواہیں کم ہیں، خاص طور پر گریڈ ۱۶ تک کے ملازمین، ان کے لیے تنخواہ میں اضافہ زیادہ ہونا چاہیے اور جن کی زیادہ تنخواہ ہے اس میں اضافہ کم کریں۔ سینیٹ نے تجویز کیا ہے کہ گریڈ ۱۶ تک ۳۰ فیصد اور اس سے اوپر ۱۵ فیصد اضافہ ہو۔ یہ انصاف و مساوات کا تقاضا ہے۔

۳۔ اس سلسلہ کی تیسری بات قومی بچت اسکیم سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں بھی جو اضافہ ۲ فیصد کیا گیا ہے وہ ناکافی ہے۔ اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بچت کی شرح پوری دنیا میں بلکہ میں کہوں گا کہ ترقی پذیر ممالک میں بھی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خطے میں بھی سب سے کم ہے۔ بحث کی شرح بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ ترغیبات بڑھائی جاتیں، جس کا تقاضا ہے کہ منافع کم از کم مارکیٹ کی شرح کو سامنے رکھ دیا جائے۔

۴۔ چوتھی چیز جناب والا! یہ ہے کہ حکومتی اخراجات کو مزید کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ۳۰ فیصد وزیر اعظم نے کم کیا ہے۔ ہم نے اسے خوش آمدید کہا ہے۔ آپ

بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اس سلسلہ میں سینیٹ نے پہل کی ہے۔ قومی اسمبلی نے اقدام لیا ہے یہ بھی قابل تعریف ہے۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ مطالبہ کرتے ہیں کہ ایوان صدر، نیشنل سیکورٹی کونسل اور دیگر جتنے بھی ادارے ہیں وہ یہی روش اختیار کرتے ہوئے اخراجات کو مزید کم کریں۔ اخراجات پر قابو پائے بغیر آپ معیشت کو بہتر بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۵۔ ہماری ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ضروری اشیاء کو سیلز ٹیکس اور درآمدی ڈیوٹی سے زیادہ سے زیادہ مستثنیٰ کیا جائے۔ ایک اور تجویز صنعتی وکاروباری سرگرمیوں کے حوالہ سے تحقیق (R & D) پر توجہ دینے کی ہے۔ ہماری نگاہ میں کپڑے اور خاص طور پر چند دوسری صنعتوں میں برآمدات کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس وقت اس کے لیے کوئی رقم اس بجٹ میں مختص نہیں کی گئی ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ حکومت دوبارہ غور کرے اور اس مد کے لیے رقوم مختص کرے۔

۶۔ پراپرٹی کے سلسلے میں جائیداد پر ٹیکس کو ہم نے سراہا ہے لیکن ہم نے اس کے ساتھ کہا ہے کہ تین تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ کم از کم حد پانچ مرلے مقرر کی جائے تاکہ غریب کے مکان پر یہ ٹیکس نہ لگیں۔ اس کے بعد پلاٹ سائز کو نظر انداز کر کے چھوٹے بڑے پلاٹ پر ایک ہی شرح، یعنی گزوں کے حساب سے لگانا صحیح نہیں ہے۔ مختلف پلاٹ سائز کے حساب سے یہ شرح مختلف ہونی چاہیے۔ تیسری بڑی اہم چیز یہ ہے کہ آپ نے پورے ملک کے لیے جائیداد پر ٹیکس کی ایک ہی شرح رکھی ہے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شہر میں بھی مختلف علاقوں میں قیمتیں مختلف ہوتی ہیں۔ کراچی میں آپ دیکھیے کہ کلفٹن اور لیاری کا علاقہ ایک سا نہیں ہے لیکن آپ نے ایک ہی شرح رکھی ہے۔ اسی طریقے سے کراچی اور ایبٹ آباد میں بھی آپ نے کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ ٹیکس کی شرح کا تعین کرتے

ہوئے سائز اور لوکیشن کا فرق ہونا بہت ضروری ہے، اس کے بغیر یہ ٹیکس منصفانہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ اس تجویز پر عمل کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ اس ٹیکس سے جو آمدنی اس وقت تصور کر رہے ہیں اس سے کئی گنا بڑھ جائے گی۔

۷۔ اس کے علاوہ ایک اہم تجویز یہ ہے کہ گھر کی تعمیر کے قرضے پر لازمی انشورنس لائی جائے تاکہ نادہندگی کی صورت میں خواہ وہ کسی بھی وجہ، بیوہ، یتیم یا کوئی اور سبب سے ہو تو قرض ادائیگی خود بخود انشورنس سے کور ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے ضوابط میں تھوڑا بہت فرق پڑ جائے لیکن یہ اتنی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل اہم چیز یہ ہے کہ قرضوں کے اندر لازمی انشورنس ہونی چاہیے۔ کیپٹل ویلیو ٹیکس کے بارے میں بھی ہم نے یہ بات کہی ہے کہ اسے مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ کیپٹل گین ٹیکس ایک براہ راست ٹیکس ہے اور اس کی وجہ سے ملک میں زیادہ مساویانہ نظام بنے گا۔

۸۔ ہماری آٹھویں ٹیکس تجویز چھوٹے قرضوں کے بارے میں یہ ہے کہ اس کی بھی وصولی تو ضرور ہونی چاہیے لیکن اس کی عدم وصولی پر آپ بہت زیادہ سختی سے گریز کریں، مجھے خوشی ہے کہ کل وزیر خزانہ نے یہ کہا ہے کہ ہم کم از کم نیلام اور جائیداد ضبط کرنے کا معاملہ نہیں کریں گے۔ لیکن ہماری تجویز یہ ہے کہ صنعت، زراعت، ہاؤسنگ تینوں میں ایک لاکھ تک کی حد جہاں جہاں خراب صورتحال ہے اسے آپ معاف کرنے یا کم از کم ری شیڈول کرنے کے بارے میں غور کریں۔

تعلیمی بجٹ

تعلیم کے بجٹ کے بارے میں جناب والا! سینیٹ کی کمیٹی اور سینیٹ مطمئن نہیں ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اس بجٹ کے اندر تعلیم کے لیے کم از کم جی ڈی پی کا ۳ فیصد رکھا

جائے اور اگلے سال سے وعدے کے مطابق جی ڈی پی کے ۴ فیصد پر لے جایا جائے۔[1]

جناب والا! یہ کہنا کہ ہم نے جو تجاویز دی ہیں وہ واضح نہیں ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ ہماری تمام تجاویز واضح ہیں۔ میں نے ان ۳۹ تجاویز کو ۶ کیٹیگریز میں واضح کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کچھ دو اور دو چار کی طرح قوانین میں تبدیلی کے بارے میں ہیں، کچھ پالیسی کے حوالہ سے ہیں، کچھ ٹیکسوں کے ڈھانچے میں تبدیلی کے بارے میں ہیں۔ ساتھ ہی کچھ ان مختلف معاملات کے بارے میں ہیں جن کے نتیجے کے طور پر اس ملک میں بجٹ سازی یا بجٹ کے اوپر پارلیمنٹ کا کنٹرول بہتر ہو گا۔

جناب والا! آخری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں بہت خوشی محسوس کرتا ہوں کہ کم از کم سینیٹ میں ہم نے سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر غور نہیں کیا ہے۔ ہمارے پیش نظر پاکستان کا مفاد اور اصول کی اہمیت رہی ہے۔ ایک خوشحال فلاحی معاشرہ کی تشکیل اور وفاقی اکائیوں کے ساتھ انصاف کا حصول ہمارے اہداف رہے ہیں۔

میں توقع رکھتا ہوں کہ حکومت ان تجاویز کو وہ اہمیت دے گی جن کی یہ مستحق ہیں اور ماضی کی طرح اسمبلی محض کارروائی پورکرنے کے لیے ان کو سن کر ختم نہیں کرے گی بلکہ سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرے گی۔ ہماری مالیاتی کمیٹی ہر سطح کے اوپر مزید گفتگو کے لیے تیار ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کمیٹی کے تمام ارکان، خصوصاً اس کے صدر اور سینیٹ سٹاف، انہوں نے بڑی محنت سے کام کیا ہے، ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ اس مثال کی اوروں کو بھی پیروی کرنی چاہیے اور جو محنت کی گئی ہے، پالیسی میں تبدیلیاں اگر اس کی روشنی میں ہوتی ہیں تو ہم سمجھیں گے حق محنت وصول ہو گیا۔ (۱۸ جون ۲۰۰۸ء)

---

[1] سال ۲۱-۲۰۲۰ء میں پاکستان نے تعلیم کے لیے کل جی ڈی پی کے تناسب سے ۲ء۳ فیصد بجٹ رکھا ہے جو ظاہر کر رہا ہے کہ بتدریج تعلیم پر ہماری توجہ کم ہوتی جا رہی ہے۔

قومی بجٹ (۱۰-۲۰۰۹ء): تبصرہ و تجاویز

سالانہ قومی بجٹ پر تبصروں اور تجاویز پر گزشتہ ابواب کی طرح زیر نظر باب میں بھی تکرار کو کم کرتے ہوئے ان نکات کو شامل رکھا گیا ہے جو اس سے پہلے کے مباحث میں براہ راست زیر بحث نہیں آئے یا سیاق وسباق کے اعتبار سے ضروری ہیں اور خصوصی طور پر ۱۰-۲۰۰۹ء کے تناظر میں ہیں۔

بجٹ کا آئی ایم ایف ماڈل

وزیر مملکت برائے خزانہ نے پچھلی حکومت کی پالیسیوں کی ناکامیاں، مایوس کن نتائج، حتّٰی کہ مصنوعی ترقی پر بھرپور تنقید کی ہے۔ مجھے ان کی تنقید سے اتفاق ہے۔ وہ حقیقی ترقی کا دور نہیں تھا، بلکہ عارضی اور مصنوعی ترقی کا دور تھا۔ جس کے نتائج ہم آج بھی بھگت رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ موجودہ حکومت کو اگرچہ اس مایوس کن ورثے سے، جس پر اس کا اختیار نہیں تھا، اپنے کام کا آغاز کرنا پڑا لیکن کم و بیش اس نے ان کی پالیسیوں کا تسلسل اختیار کیا، یہ افسوسناک ہے۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ کچھ معاملات میں پالیسی بنانے والے اور پالیسیوں کا دفاع کرنے والے، جو اس زمانے میں تھے، آج بھی وہی ہیں۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ بجٹ پر محض تنقید کافی نہیں ہے بلکہ آپ کو اس بات کی جوابدہی کرنا پڑے گی کہ آپ ایک طرف ان پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں اور دوسری طرف ان ہی پالیسیوں کو، چاہے ان کا تعلق سیکورٹی سے ہو یا معیشت سے ہو جاری رکھتے ہیں۔ حتّٰی کہ عدلیہ اور آئینی معاملات میں بھی آپ کے طرز عمل میں کوئی فرق واقع

نہیں ہوا ہے۔

جناب چیئر مین! اس بجٹ میں کچھ اچھی چیزیں بھی ہیں، جن کا میں اپوزیشن میں ہونے کے باوجود اعتراف کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک اچھا قدم یہ ہے کہ ماضی کی روایت کی طرح فنانس بل کو بڑے پیمانے پر قوانین میں تبدیلی کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ ایک اچھا قدم ہے لیکن ناکافی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ذہن اب بھی نہیں بدلا ہے، رویہ وہی ہے۔ چنانچہ جس بل کو پاس کیا گیا ہے اور جہاں ترمیم بھی کی گئی ہے وہ قوانین مالیات کے زمرے میں تو ضرور آتے ہیں لیکن جن موضوعات کو لیا گیا ہے، ان کا تعلق فنانس بل سے نہیں، انتظامیہ سے ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر ان کو بلاروک ٹوک جانے دیا گیا تو ٹیکس جمع کرنے والوں کے صوابدیدی اختیار سے ہم نے جو نجات پائی تھی، وہ سلسلہ دوبارہ قائم ہو جائے گا۔ اسی طریقے سے خود تشخیص کے جو فوائد ہمیں حاصل ہوئے تھے، وہ ختم ہو جائیں گے۔ دو تین چیزیں اور بھی میری نگاہ میں اچھی ہیں۔ جن میں سیمنٹ پر ڈیوٹی کم کرنا، جن میں ادویات اور دوسری ایسی چیزوں کے بارے میں درآمدی ڈیوٹی کا کم کیا جانا شامل ہیں، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، لیکن اس حد تک اعتراف کے بعد میں یہ بات پوری ذمے داری سے کہتا ہوں کہ بجٹ میں سابقہ حالات اور حکمت عملی کو جوں کا توں رکھا گیا ہے۔ اس میں معاشی نقطہ نظر اور ترقی کی حکمت عملی میں کوئی بنیادی تبدیلی دور دور تک نظر نہیں آتی۔ میری نگاہ میں، یہ الفاظ ذرا سخت ہیں لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ عوام کو دھوکا دینے کے لیے تو استعمال ہو سکتا ہے لیکن ٹھوس تبدیلی نہیں ہے۔

پچھلی بجٹ تقریر میں یہ بات کی گئی تھی کہ ہم نے مشکل حالات میں آغاز کیا ہے لیکن بحالی اور ترقی کا سال ۰۹-۲۰۰۸ء ہو گا۔ ہوا کیا ہے؟ جمود اور محتاجی کا سال ثابت ہوا ہے۔ آپ کی صنعت ۷ء۷ فیصد نیچے گئی ہے۔ برآمدات اور درآمدات نیچے گئی ہیں، مالیاتی خسارہ، تجارتی خسارہ اور ادائیگیوں کے توازن کا فرق بڑھا ہے۔ آپ افراط زر کو قابو نہیں کر سکے۔ یہاں آپ اعداد و شمار کے ساتھ بھی ناانصافی کر رہے ہیں۔ آپ نے اسٹیٹ بینک کی

آج ہی جو رپورٹ دی ہے، اس میں اس دور کا اس مہینے تک افراط زر ۲۲ فیصد قرار دیا گیا ہے اور غالباً یہ صحیح ہے لیکن بجٹ تقریر میں آپ نے ۵ء۱۵ فیصد کی بات کی اور یہ خوشنما باغ دکھایا کہ اگلے سال یہ نامعلوم کس طرح ۵ء۹ فیصد ہو جائے گا۔ میرے خیال میں یہ شعبدہ بازی نہیں ہونی چاہیے، ہمیں حقائق کا سامنا کرنے چاہیے۔

جناب والا! بجٹ بنانے کے حوالہ سے اس وقت دو اصولی نکتہ ہائے نظر ہیں۔ ایک وہ ہے جو ہمیں آئی ایم ایف نے کہا ہے اور اس کا عنوان ہے اوپری استحکام (Macro Economic Stability) دوسرا عنوان ترقی کی حقیقی سمت ہے۔ ایک مالیاتی پالیسی جو پیداوار اور نفع بخش شعبہ کو بڑھانے پر توجہ دیتی ہے۔ اس مالیاتی پالیسی کے بنیادی مقصد کے طور پر سماجی انصاف فراہم کرنے، عوام کی ضروریات کو پورا کرنے، کاروبار میں اضافہ، چھوٹی، درمیانی اور بڑی صنعت، زراعت اور بنیادی ڈھانچہ کی تعمیر پر توجہ دی جاتی ہے۔ جناب والا! اس وقت ہمارے پاس وسائل کی کمی نہیں ہے۔ میں آپ کو ایشیائی ترقیاتی بینک کی ایک تحقیقی ٹیم کا ایک حوالہ دوں جس نے پاکستان کے حالات پر اپنی رپورٹ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "Indeed, we believe that the IMF conditions will reduce the capacity to engineer a solution to the causes of deflation and falling foreign currency reserves without increasing the unemployment..."

انہوں نے یہ صاف کہا ہے کہ مسائل کے حقیقی حل کے لیے سماجی طور پر قابل قبول حل چاہیے، آئی ایم ایف حل ناکام ہو چکا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ اہم بات کہتے ہیں کہ:

> "Pakistan faces high inflation and insufficient progress towards development. The country is not fully utilizing its domestic resources".

جناب والا! کہا جاتا ہے کہ ہم وسائل کہاں سے لائیں؟ لیکن خود بورڈ آف ریونیو کے مطالعات بتاتے ہیں کہ اس وقت ٹیکس گیپ (Tax Gap) تقریباً ہماری ٹیکس آمدنی کا

۵۰ فیصد ہے[1]۔ یہ بورڈ آف ریونیو کے مطالعات ہیں ٹیکس گیپ کے معنی ہیں کہ موجودہ شرح پر جتنا ٹیکس آنا چاہیے اور جو آیا ہے، اس کے درمیان کتنا فرق ہے۔ اگر آپ کا اا ٹریلین ٹیکس وصول ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ٹیکسوں میں کسی تبدیلی کے بغیر ساڑھے پانچ سو ارب روپے کی مزید صلاحیت موجود ہے بشرطیکہ آپ کرپشن، نااہلی، عدم حکمرانی اور صوابدید کے غلط استعمال کو قابو کر سکیں۔ صرف ان ذرائع سے آپ اسی ٹیکس ڈھانچے کے اندر پانچ سو بلین روپے سے زیادہ مزید وصول کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ٹیکس کا مقصد حکومت کی آمدنی لیا جاتا ہے۔ حالانکہ مالیاتی پالیسی کا یہ صرف ایک مقصد ہوتا ہے اصل مقصد ترقی اور ترقی کی صلاحیت پیدا کرنا، معیشت کی توسیع، فلاح و بہبود اور سماجی انصاف ہوتا ہے تاکہ معاشی عدم مساوات دور ہو اور ترقی کے ثمرات سے تمام لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

جناب چیئر مین! ہمارے اپنے ملک کے حالات پر تحقیق کی روشنی میں تجزیہ یہ ہے کہ مجموعی قومی دولت میں جو سو روپے بڑھتے ہیں، اس کے ۴۳ روپے جو خوشحال ترین دس فیصد امیر ہیں ان کے حصے میں آتے ہیں اور غریب کے حصے میں صرف تین فیصد آتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک اصول ہے ٹیکس کا بوجھ یعنی ٹیکس کا فی الحقیقت بوجھ کہاں بڑھ رہا ہے۔ پاکستان کے بارے میں جو مطالعات ہوئے ہیں، ان کا نتیجہ ہے کہ جو دس فیصد انتہائی امیر ہیں، ان کا ٹیکس کا بوجھ صرف ۱۱ فیصد ہے اور جو دس فیصد انتہائی غریب ہیں، ان کا ۱۶ فیصد ہے۔ یہ نظام ملک میں ظلم، استحصال اور عدم مساوات کو فروغ دے رہا ہے۔ اسی سے غربت اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ یہ آئی ایم ایف کے ماڈل کی بناء پر ہے جو پوری دنیا میں ناکام ہوا ہے۔ میں اس ضمن میں نوبل انعام یافتہ مسٹر جوزف اسٹگلٹز کا جو عالمی بینک کے نائب صدر اور چیف اکنامسٹ رہے ہیں، اس ایوان میں کئی بار حوالہ دے چکا ہوں۔ ان کے بقول اس ماڈل کی کامیابی کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ہے۔ ہم دوبارہ بخوشی اس جال میں گئے ہیں اور

---

[1] سال ۲۰-۲۰۱۹ء کے ایف بی آر کے اعداد کے مطابق ٹیکس کی دو بڑی مدات، سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کا ٹیکس گیپ بالترتیب ۶۵ اور ۵۷ فیصد پر پہنچ گیا ہے۔

بڑھتے چلے جارہے ہیں، نتیجہ کیا ہے کہ آج آپ کا بیرونی قرضہ جو اس وقت جب مشرف صاحب برسر اقتدار آئے تھے ۳۰ سے ۳۲ بلین ڈالر تھا۔ جب وہ چلے گئے ہیں تو یہ ۳۸ سے ۳۹ بلین ڈالر تھا۔ اور آج یہ ۵۱ بلین ڈالر ہے۔ صرف سولہ مہینوں میں ۱۲ بلین ڈالر کا بیرونی قرضہ بڑھا ہے اور اس کے ساتھ تقریباً ۲ ٹریلین روپے یعنی بیس کھرب روپے کا اندرونی قرضہ بڑھا ہے۔ آج آپ کے بجٹ میں قرضوں کے اخراجات سب سے بڑی مد ہے۔ آپ ۷۲۲ ارب روپے صرف سود اور قرض کی ادائیگی پر خرچ کریں گے[1]۔ جب تک کہ اس ماڈل کو آپ تبدیل نہیں کرتے، آپ اس جھنجھٹ سے نہیں نکل سکتے۔ ایسے بجٹ پر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔

ایوان صدر اور وزیر اعظم کے اخراجات: جناب والا! ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ وزیر اعظم سیکرٹریٹ کے اخراجات ۳۰ فیصد کم کیے جائیں گے۔ اب یہاں پر کیا ہوا ہے؟ اخراجات ۵۰ فیصد بڑھے ہیں اور آئندہ بڑھانے کی تیاریاں ہیں۔ عجیب و غریب معاملہ ہے، میں کہاں تک آپ کو اعداد و شمار دوں، لیکن میں چند چیزیں آپ کو بتاتا ہوں۔ وزیر اعظم سیکرٹریٹ کے لیے ۲۳۰ ملین روپے تھے، عملاً نظر ثانی شدہ تخمینہ کیا ہے؟ ۳۸۴ ملین روپے یعنی ۱۵۴ ملین زیادہ ہو گئے اور آئندہ کے لیے ۴۲۸ ملین کی تجویز ہے[2]، یعنی ایک اور ۱۰ فیصد اضافہ۔ اسی طرح ایوان صدر میں ۱۱ فیصد کا اضافہ شامل ہے لیکن ایک اور چیز جو مجھے بہت تکلیف دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایوان کے ساتھ مذاق بھی کیا جاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس قوم کو آسانی سے بیوقوف بنایا جاسکتا ہے۔

آپ دیکھیے کہ وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ کے اخراجات کو ایک جگہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ مختلف وزارتوں میں ان کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ تمام چیز ایک جگہ پوری طرح

---

[1] یہ رقم اب تین گنا بڑھ چکی ہے۔ ۲۱-۲۰۲۰ء کی بجٹ دستاویزات کے مطابق، قرضوں پر سود اور قرضوں کی ادائیگی کی مد میں پاکستان اس سال ۲۹۴۶ ارب روپے خرچ کرے گا۔

[2] بجٹ دستاویزات ۲۱-۲۰۲۰ء میں وزیر اعظم آفس کے داخلی اور پبلک اخراجات کی مد میں ۸۶۳ ملین روپے رکھے گئے ہیں۔

سامنے نہ آسکے۔ مثال کے طور پر پی ایس ڈی پی میں سماجی شعبہ اور ترقی کا ایک بڑا مقدس منصوبہ ہے۔ اس میں سی ڈی اے کو ۶۹ء۳ بلین روپے دیے گئے ہیں، اگر آپ اس کی تفصیل پڑھیں تو جناب چیئر مین! ہمارے سامنے پہلی بات یہ آتی ہے کہ اس میں ایوان صدر کی تزئین و آرائش شامل ہے۔ یعنی اسے ایوان صدر کی مد میں نہیں ڈالا بلکہ سی ڈی اے اور پی ایس ڈی پی میں ڈال کر نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ ایوان صدر میں پولیس کی رہائش گاہیں ۴۰ ملین روپے، ایوان صدر کی تزئین نو ۴۸ ملین روپے، ایوان صدر کی ٹھنڈک کو بہتر بنانے، غور فرمائیے! ملک میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے اور یہاں ٹھنڈک بڑھانے پر بات کی جارہی ہے اور اس کے لیے ۲۵ ملین روپے رکھے ہیں۔ تو گویا پی ایس ڈی پی کے منصوبوں میں ایوان صدر کے لیے ۹ء۱۱۳ ملین روپے رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح وزیر اعظم کے بیرونی دوروں، ان کے لاہور میں دفاتر اور ملتان میں دفاتر پر کروڑوں روپے خرچ ہوئے ہیں لیکن وہ وہاں نہیں دکھائے گئے بلکہ تعمیرات میں اور ترقیاتی منصوبوں میں ڈالے گئے ہیں۔

ایک لطیفہ اور سن لیجیے۔ پی ایس ڈی پی (Public Sector Development Program) کے معنی یہ ہیں کہ وہ اثاثوں کے بنانے کے اخراجات ہیں جن کے ذریعے ملک میں ترقیاتی عمل مستحکم ہوتا ہے۔ لیکن جناب چیئر مین! آپ کو معلوم ہے کہ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ۷۰ ارب روپے ترقیاتی منصوبوں کی مد میں ڈالے گئے ہیں۔ اندرون ملک بے گھر افراد کے لیے جو ۵۰ ارب روپے دیے جارہے ہیں، وہ بھی وہاں ڈالے گئے ہیں، دوسرے الفاظ میں ۱۲۰ ارب روپے ترقیاتی منصوبے میں وہ ہیں جن کا کوئی تعلق ترقی اور اساسی ڈھانچہ کی تشکیل سے نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ اخراجات ضروری نہیں ہیں، ان پر خرچہ ہونا چاہیے، میں اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد کے لیے تجویز کر رہا ہوں کہ اس سے زیادہ وسائل مختص ہونے چاہییں، یہ ناکافی ہیں لیکن اس کی جگہ پی ایس ڈی پی نہیں ہے کہ آپ ترقی کا نام لے کر ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کریں، یہ ایک بڑی مذموم حرکت ہے، اسے ختم ہونا چاہیے۔

غیر ترقیاتی اخراجات: جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ غیر ترقیاتی اخراجات ۳۰ فیصد سے زیادہ ہو رہے ہیں، ٹھیک ہے کہ جہاں تک تنخواہ دار طبقے کا تعلق ہے، ہم بھی نہیں کہتے کہ اس کی تنخواہ میں کمی کیجیے لیکن میں مطالبہ کرتا ہوں کہ غیر ترقیاتی اخراجات میں مجموعی طور پر کم از کم ۳۰ فیصد کمی ہونی چاہیے۔ جب تک آپ اپنے وسائل میں زندگی گزارنے کا راستہ اختیار نہیں کرتے، آپ کبھی بھی بحران سے نہیں نکل سکتے۔ اس کے لیے حکومت اور اس کے ذمہ داران کی جو عیاشیاں اور شاہ خرچیاں ہیں انھیں ختم ہونا چاہیے۔ وسیم سجاد نے آپ کو ابھی جن بیرونی دوروں کا بتایا ہے، میں ان کو دہراؤں گا نہیں لیکن یہ ساری چیزیں اہم اور لائق توجہ ہیں اور جب تک آپ یہاں کمی نہیں کریں گے، وسائل مہیا نہیں ہوں گے۔

میری نگاہ میں دھوئیں اور فضائی آلودگی پر جو ٹیکس لگایا گیا ہے، یہ ایک ظلم اور ایک دھوکہ ہے، ظلم کیوں ہے؟ آپ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آج دنیا میں ماحول دوست پالیسیوں کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ اس میں ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ پٹرول اور ڈیزل کا استعمال کم کیا جائے اور گیس کے استعمال کو بڑھایا جائے۔ یہ بات کوئی راز نہیں کہ گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا نہیں کرتی بلکہ اس کو بچاتی ہے اور یوں پٹرول اور ڈیزل کے مقابلہ میں ماحول دوست ہے۔ یہی پس منظر ہے جس میں دہلی کا پورا ٹرانسپورٹ سسٹم وہاں کی سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق سی این جی پر آیا ہے اور انھوں نے ڈیزل سے نجات پائی ہے۔

اب طرفہ تماشا یہ ہے کہ آپ سی این جی پر ٹاکسٹی (Toxicity) کے نام سے ٹیکس لگاتے ہیں۔ کاربن کے نام پر اس طرح ٹیکس لگانا، دھوکہ اور غیر معمولی فراڈ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے کہنے پر آپ کو پٹرول کی قیمت میں کمی کرنی تھی جسے آپ کسی اور طرح سے واپس لینا چاہ رہے ہیں۔ جناب والا! ہوا یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے ایک اہم ہدایت دی جو کسی مفاد پر نہیں بلکہ تحقیق پر مبنی ہے۔ یہ ہدایت اس پس منظر میں تھی کہ جب تیل کی قیمت ۱۴۷ ڈالر فی بیرل سے کم ہو کر ۳۰ اور ۳۲ پر آگئی تو اس کا فائدہ عوام کو کیوں نہیں پہنچتا؟ سپریم کورٹ نے ایک کمیشن کے تحت ریسرچ کروائی، ان کا کہنا تھا کہ تیل

کی قیمت میں ۲۰ فیصد کمی ہونی چاہیے تھی، حکومت نے محض ۲٫۵ فیصد کم کی۔ لیکن اب کاربن ٹیکس لگا کے اس پورے کے پورے عمل کو پلٹ دیا گیا ہے، یہ دراصل سپریم کورٹ کے فیصلے کی خلاف ورزی ہے اور اس سے بچنے کے لیے ایک دوسرا راستہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قطعاً غلط ہے، اسے واپس ہونا چاہیے۔ ۱۱۲ سے ۱۱۳ بلین روپے کی جو آمدنی یہاں سے حاصل کرنا چاہ رہے ہیں، وہ آپ غیر ترقیاتی اخراجات اور تنخواہوں کے خرچے کو کم کرکے حاصل کریں، کوئی خلا پیدا نہیں ہو گا۔

جناب والا! یہ کہا جارہا ہے کہ زراعت کے لیے بہت کچھ کر دیا گیا ہے لیکن دیکھیں اس کی وجہ کیا ہے، جہاں تک گندم کی قیمت کا تعلق ہے، مجھے اصولی طور پر اتفاق ہے گو کہ مجھے بہت تحفظات ہیں کہ ۵۵۰ سے ۹۵۰ روپے ایک دم بڑھائی گئی ہے۔ کیا وہ ایک عقلمندانہ فیصلہ تھا اور کیا اس کو خوراک کی عالمی منڈی کی قیمتوں کے تغیرات کی روشنی میں برقرار رکھا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ اب ماضی ہے۔ اس وقت وہاں پر اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہاں اصل مسئلہ کھاد کی عدم فراہمی اور اس کا صحیح وقت پر نہ ملنا اور پانی کی عدم دستیابی ہے۔ آپ کی بجلی کے مسئلے نے ڈیزل کے ٹیوب ویل جن سے پانی حاصل کر رہے تھے، انہیں غیر مؤثر اور ناکارہ بنا دیا تو پانی کی فراہمی ایک بحران کی صورت اختیار کر گئی۔ ان کا تیسرا بنیادی مسئلہ زرعی قرضوں کا ہے۔ جناب چیئرمین! اس سلسلے میں جتنے سائنسی مطالعے ہوئے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ زراعت میں قرضوں کی ضرورت کا صرف ۲۱ فیصد اس وقت اداراتی ذرائع سے پورا ہو رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ۷۹ فیصد زرعی قرضے نہیں مل رہے، آپ کو اسے قابل حصول کرنا چاہیے، اس سے زراعت آگے بڑھ سکے گی۔

صنعتی بحران: جناب چیئرمین! اگلا بنیادی مسئلہ صنعتوں کا بحران ہے۔ درحقیقت گزشتہ سال پاکستان کے ۳۰ سالہ ماضی اور مستقبل کے درمیان تاریخ کا پہلا تفریقی سال ہے کہ آپ کی صنعتی ترقی منفی ۷٫۷ فیصد ہوئی ہے۔ آپ اب جو امید دلا رہے ہیں، پالیسی میں کسی نئی تبدیلیوں کے بغیر کہ وہ اگلے سال ۱٫۸ فیصد ہو گی اس پر کیسے یقین کر لیا جائے؟ اگر آپ کی

یہی پالیسی رہتی ہے تو صنعتی ترقی ۸ء۱ فیصد نہیں ہوسکتی، آپ دوبارہ زوال میں رہیں گے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

صنعت کے قیام اور کارکردگی کے لیے اہم ترین چیز اس کا منافع بخش ہونا ہے، جس کا براہ راست تعلق اشیاء کی لاگت پیداوار سے ہے اور لاگت کا ایک بڑا حصہ سرمایہ کی کم شرح پر فراہمی سے جڑا ہوتا ہے۔ ہم سب یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اس وقت ۱۴ فیصد رعائتی شرح ہے جس کے نتیجے کے طور پر عملاً تجارتی بینک ۱۸ سے ۲۰ فیصد سود پر سرمایہ دے رہے ہیں، اس شرح سود پر کوئی سرمایہ کاری نہیں آسکتی۔ اس وقت ہندوستان میں یہ شرح ۵ فیصد ہے، امریکہ اور یورپ میں ایک فیصد ہے، جاپان میں زیرو فیصد پر لے گئے ہیں، ساری دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ آپ سرمایہ کاری کا ماحول پیدا کریں اور اس کے لیے وسائل کو متحرک کریں۔ آپ کو اس کے لیے نرم مالیاتی پالیسی اختیار کرنی پڑے گی، آپ نے اس کے برعکس سخت پالیسی اختیار کی ہوئی ہے، یہ نہایت ہی غلط ہے۔

صنعت کی افزائش کے لیے دوسری اہم چیز توانائی ہے۔ توانائی کی فراہمی نہ ہونے کی وجہ سے ہماری صنعتی پیداوار نیچے گئی ہے اور مجھے بظاہر نظر نہیں آرہا ہے کہ بجلی کی بلاتعطل فراہمی کے لیے دسمبر ۲۰۰۹ء کی جو خوشخبری دی گئی ہے، وہ پوری ہوسکتی ہے۔ غالباً اس لیے ایک وزیر خورشید شاہ نے یہ بات کہی ہے کہ ۲۰۰۹ء نہیں دسمبر ۲۰۱۰ء کی بات ہم کر رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ماہرین کی کمیٹی نے کہا ہے کہ اس مسئلہ کے حل میں ۴ سے ۵ سال لگیں گے، اگر یہ صورت حال رہتی ہے تو صنعتی ترقی کیسے ممکن ہے؟ لوڈشیڈنگ سے عوام کی جان کیسے چھوٹے، اس کے لیے ایک ہنگامی پروگرام کی ضرورت ہے جو شفافیت کے ساتھ اور بدعنوانی سے پاک ہو۔

آپ کو علم ہے کہ میں ذاتی حملے نہیں کیا کرتا ہوں، لیکن میرے پاس دسیوں افراد یہ کہنے کے لیے آئے ہیں کہ ہم نے منصوبے دیے ہیں لیکن ہم سے کمیشن مانگا گیا ہے اور ہم اس میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جناب والا! ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے اپنی تازہ ترین رپورٹ میں یہ

کہا ہے کہ پاکستان میں ۱۰ سے ۱۵ فیصد جی ڈی پی کرپشن کی نظر ہو رہا ہے یہ ایک بہت بڑی رقم ہے، خدا کے لیے اس چیز کی فکر کیجیے۔ پھر آپ نے جو روپے کی قدر میں کمی کی ہے اس کمی کی وجہ سے تمام در آمدی خام مال اور مشینری ۳۰ فیصد مہنگی ہو گئی، کاروباری لاگت بڑھ گئی ہے کم نہیں ہوئی، جبکہ آپ کی حکمت عملی کاروباری لاگت کم کرنے کی ہونی چاہیے۔ جناب والا! یہ بالکل الٹی پلٹی پالیسی ہے، آپ کو اسے مکمل طور پر نئی شکل میں تشکیل دینا پڑے گا، جب تک کہ آپ کے اموالِ تجارت کے شعبے میں اس قسم کے اقدامات نہیں ہوتے تو میں نہیں سمجھتا کہ ملک موجودہ معاشی بحران سے نکل سکتا ہے۔

زرتلافی: جناب والا! آئی ایم ایف کے دباؤ کے تحت زر تلافی کا ہٹایا جانا غلط ہے۔ بلا شبہ زر تلافی ایک ترقیاتی معیشت کی ضرورت ہے اگرچہ بطور معیشت دان ایسی بلا تخصیص عمومی پالیسی کو میں بھی صحیح نہیں سمجھتا۔ تاہم مجھے اندازہ ہے کہ ترقی یافتہ معیشتوں میں بھی ترقی کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے زر تلافی دی گئی ہے۔ اس وقت یورپ میں زراعت پر تقریباً دو ڈھائی سو بلین ڈالر سالانہ زر تلافی دی جاتی ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں ۶ بلین ڈالر سے زائد صرف زراعت پر زر تلافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ خاص مقاصد کے لیے ایسا کیجیے، اس طرح کیجیے کہ آپ کا ترسیل کا نظام ہو اور اس کے لیے صحیح تنظیم و ترتیب ہو، لیکن آنکھیں بند کر کے زر تلافی کو ختم کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مہنگائی بڑھائے گا، یہ ان رکاوٹوں کو دور نہیں کر سکے گا جن کی بناء پر پیداوار نہیں بڑھ رہی ہے۔

افراط زر: جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں افراط زر کسی متوازن پالیسی کے نتیجہ میں مطلوبہ افراط زر نہیں ہے۔ فی الحقیقت ہمارے ہاں افراط زر لاگت کی بنا پر ہے اور یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اگر زرعی و صنعتی پیداوار کے لیے درکار اشیاء کی مہنگائی ہو گی تو اشیاء مہنگی بنیں گی اور اس کے نتیجے کے طور پر قلت بھی ہو گی اور افراط زر بھی پیدا ہو گا۔ بر آمدی اشیاء بھی اس کے نتیجہ میں غیر منافع بخش ہوں گی۔ چنانچہ ہماری ساری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم لاگت کم کریں کیونکہ جب تک کہ تجارت نہیں بڑھے گی اس وقت تک افراط زر کم

نہیں ہو سکتا۔ سخت مالیاتی پالیسی کے چار سال ہونے کے باوجود اگر افراط زر قابو میں نہیں آیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ ہمیں اس ناکامی کو تسلیم کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ جب تک کہ فراہمی کی صورت بہتر نہیں ہوتی اس وقت تک ہم افراط زر کو قابو نہیں کر سکتے۔ نقد رقم میں اضافہ سے تمام افراد کی حقیقی آمدنی خصوصاً غریب طبقات کی نیچے جا رہی ہے۔ کیونکہ آپ جو بھی نقد رقم دیتے ہیں، وہ حقیقی قوت خرید نہیں بڑھائی آپ تنخواہ میں ۱۵ فیصد کا اضافہ کر رہے ہیں اور اس میں کبھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ یہ پوری معیشت میں جائے گا۔ اس کا ایک حصہ سرکاری شعبہ میں اور بہت سی کارپوریشنز میں بھی جاتا ہے۔ جناب والا! میں مطالبہ کروں گا کہ اس بات کو اصل اہمیت دی جائے کہ فی الحقیقت افراط زر کو کنٹرول کیا جا سکے اور وہ سخت مالیاتی کنٹرول سے نہیں ہو گا۔ وہ اس پالیسی سے ہو گا جس سے کے نتیجے کے طور پر سرمایہ کاری اور پیداوار بڑھے اور لوگوں کو معقول قیمت پر اشیاء ضرورت فراہم ہوں۔ ہمیں پالیسی کی پوری پیراڈائم تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

کم از کم اجرت: میں یہ بھی مطالبہ کروں گا کہ کم از کم اجرت کی شرح کو بڑھنا چاہیے۔ میری رائے میں اس وقت جو حالات ہیں اس میں غریب سے غریب خاندانوں کو بھی اگر دس ہزار روپے ماہانہ ملیں تو وہ دو وقت کی روٹی نہیں کھا سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ کہیں گے کہ ہم یہ پیسہ کہاں سے لائیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ یہ پیسہ اپنے غیر ضروری اخراجات کو ختم کر کے لائیے۔ یہ پیسہ امراء پر ٹیکس لگا کر لائیے، یہ پیسہ ٹیکس چوری کو قابو میں لا کر لائیے، یہ پیسہ آپ اچھی حکمرانی اور بہتر انتظام سے لائیے، یہ پیسہ آپ کرپشن کو ختم کر کے لائیے۔ اگر آپ نے اس ملک کے عوام کو زندگی کی سہولت دینا ہے، اگر ملک کو مستقبل کے خونی انقلابات سے بچانا ہے تو اس کے لیے غریبوں کی، فاقہ کرنے والوں کی، ان ماں اور باپ کی جو اپنے بچوں کو بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور یا جو خودکشی کی طرف جا رہے ہیں مدد کا آپ کو انتظام کرنا ہو گا۔ درحقیقت اسی کے نتیجہ میں ملک میں معاشی استحکام بھی آئے گا۔ معاشی استحکام محض دولت مندوں کے مزید دولت مند بن جانے سے نہیں ہوتا، معاشی استحکام آئی ایم ایف اور

بین الاقوامی بھیک سے پیسہ لا کر نہیں ہوتا۔ یہ ملتا ہے محنت اور شراکت سے۔

تعلیم، صحت، روزگار یہ وہ تین چیزیں ہیں جنھیں آپ کو ترجیح دینی ہوگی اور اس کے لیے بڑے پیمانے پر وسائل لانے کی ضرورت ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا نقد امداد وقتی چیز ہے، میں اس کا مخالف نہیں ہوں اس لیے کہ لوگ دلبرداشتہ ہیں اور ان کو ہزار روپے بھی ملتے ہیں تو کم از کم کچھ دن ایک وقت کی روٹی کھا سکتے ہیں لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ نقد امداد صرف ان لوگوں کو دیجیے جو بیوہ یا بزرگ ہیں، جن کے لیے محنت کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ سارے وسائل ہنرمندوں کی تربیت اور روزگار کو وسیع کرنے میں مخصوص کریں۔ اس کے لیے جو شعبے سب سے زیادہ روزگار فراہم کرتے ہیں وہ تین ہیں، زراعت، تجارت اور چھوٹی صنعتیں۔ ان پر اہمیت دیجیے اور آپ دیکھیں گے کہ تین سال میں ہمارے حالات بدلنے شروع ہو جائیں گے۔

جناب چیئرمین! اقوام متحدہ کی جو تازہ ترین رپورٹ آئی ہے اس میں اگر دو ڈالر روزانہ آمدنی کو غربت کی بنیاد مانا جائے تو پاکستان کی آبادی کا ۵۷ فیصد غربت کی لکیر سے نیچے ہے۔ دوسری جانب منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین نے ریکارڈ پر کہا ہے کہ ان کی تعریف کے اعتبار سے ۴۰ فیصد آبادی بیروزگار ہے۔ جس کے معنی یہ ہے کہ تقریباً ۵ کروڑ افراد بیروزگار ہیں۔ آج سے دس سال پہلے جب جمہوری حکومت ختم ہو گئی تھی تو یہ تعداد صرف ۲۴ ملین تھی اور آج یہ اس سے بڑھ کر ۵۰ ملین ہو گئی ہے۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟

خدا کے لیے ان ساری چیزوں کو دیکھیے اور غور کیجیے کہ آپ ملک کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ آپ کی معیشت اس طرح کبھی نہیں اٹھ سکتی، آپ پر قرض کا بار بڑھتا چلا جائے گا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ پیراڈائم تبدیل ہو، فلاحی اور ترقی و پیداوار میں اضافے اور معاشرے کے نچلے طبقات کو اٹھانے، محنت اور معاشرے کی ضروریات کے لائق بنانے کے لیے، ان میں تعلیم اور صحت کے ساتھ ساتھ اس طرح ہنرکاری پیدا کریں کہ وہ کار آمد

بنیں۔ خدا کے لیے وقت کے تقاضوں کو سمجھیے اور پالیسیوں کو تبدیل کیجیے۔ اپوزیشن آپ کا ساتھ دے گی اگر آپ کوئی صحیح کام کرتے ہیں۔ لیکن جو غلط کام آپ کر رہے ہیں اس کے لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم گرفت کریں اور ان شاء اللہ ہم یہ فرض ادا کرتے رہیں گے۔

(۱۷جون ۲۰۰۹ء)

قومی بجٹ (۱۱-۲۰۱۰ء): تبصرہ و تجاویز

۱۱-۲۰۱۰ء کا قومی بجٹ پیپلز پارٹی کی حکومت کے اس وقت کے وزیر خزانہ عبدالحفیظ شیخ صاحب نے پیش کیا تھا۔ شیخ صاحب کی وزارت خزانہ کی یہ مدت ۲۰۱۰ء سے فروری ۲۰۱۳ء تک جاری رہی۔ اس سے قبل عبدالحفیظ شیخ جنرل پرویز مشرف کے دورِاقتدار میں پہلے (۲۰۰۰ء) سندھ کے صوبائی وزیر خزانہ اور بعد ازاں (۲۰۰۳ء) مرکزی حکومت میں نجکاری کے وزیر رہے تھے۔ ۲۰۱۹ء میں وہ ایک بار پھر پہلے وفاقی حکومت میں مشیر خزانہ کی حیثیت سے پلٹ کر آئے اور پھر دسمبر ۲۰۲۰ء میں وزیر خزانہ بھی بنے۔

پاکستان میں ان مناصب پر فائز رہنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ورلڈ بینک کے لیے بھی کام کیا اور ورلڈ بینک کے عہدیدار کی حیثیت سے مختلف اوقات میں متعدد ملکوں میں ذمہ داریاں ادا کیں۔ عبدالحفیظ شیخ کوئی واحد مثال نہیں ہیں پاکستان میں مختلف ادوار میں عالمی اداروں کے وابستگان کی ذمہ دار عہدوں پر تقرری کی ایسی ہی کئی اور مثالیں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ اس پس منظر میں پاکستان کی اقتصادی پالیسیوں میں عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملیوں کے گہرے اثرات نظر آنا کسی بھی طرح غیر متوقع نہیں۔

پروفیسر خورشید احمد کا شمار ان ماہرین میں ہوتا ہے جو ترقی پذیر ملکوں کے لیے عالمی مالیاتی اداروں کی حکمت عملی کو درست نہیں سمجھتے۔ اس تناظر میں بجٹ ۱۱-۲۰۱۰ء پر زیر نظر تقریر میں بھی سالانہ بجٹ کی تفصیلات پر بحث کے ساتھ ساتھ حکمت عملی پر تبصرہ بھی شامل ہے۔

وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر

جناب چیئرمین! میں اپنی اس خوشی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ بہت عرصے کے بعد

ہمیں ایک ایسی تقریر سننے کا موقع ملا جس میں حالات کا ادراک اور احساس موجود ہے اور اگر اس میں پوری صداقت نہیں تھی تو صداقت کی کچھ جھلکیاں بہرحال نظر آتی تھیں۔ وزیر خزانہ نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے چھ نکات دیے ہیں کہ یہ ان کی نگاہ میں بنیادی مسائل ہیں۔ علمی اعتبار سے میں ان کی تقریر کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ماضی کی تقاریر کے مقابلے میں انہوں نے ایک اچھی روایت قائم کیا ہے۔

اس کے ساتھ جناب والا! مجھے یہ بھی کہنے کی اجازت دیں کہ اگرچہ تقریر کا اپنا لوازمہ، تجزیاتی پہلو اور اس کی ادائیگی یہ تینوں اچھی تھیں لیکن جس چیز کی اس میں کمی ہے، اور یہ بڑی سنجیدہ خامی ہے، وہ مسائل کا حل بیان نہ ہونا ہے۔ مسائل سے بجٹ کو جوڑنا کہ کہاں تک یہ بجٹ ان مسائل کے ادراک پر مبنی ہے اور اس ادراک کے ساتھ ساتھ ایک نقشہ کار بھی پیش کرتا ہے، اس معاملے کی مجھے شدت سے کمی محسوس ہوئی ہے۔ اس لیے اجازت دیجیے کہ میں اس مصرعے کا سہارا لوں جس میں کہا گیا ہے کہ ؎

کچھ خواب ہیں، کچھ اصل ہیں، کچھ طرز آداب ہیں

بجٹ کا اصل مقصد آگے راستہ دکھانا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ اس میں نہیں ہے۔

میں یہاں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرواؤں گا کہ کم از کم تین باتیں ایسی کی ہیں جن کی ان جیسے علمی مقام رکھنے والے پیشہ ور معیشت دان سے توقع نہیں تھی۔ پہلی بات یہ کہ انہوں نے بجٹ کے کردار کو کمتر کیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ بجٹ معاشی پالیسی کی ایک خاص جہت کو ظاہر کرتا ہے لیکن دوسری طرف بجٹ ملک کے تمام معاشی حالات اور حتّٰی کہ سیاسی حالات کی روشنی میں کسی بھی حکومت کی ساری معاشی پالیسیوں کا ادراک دیتا ہے۔ دیکھیے! بجٹ کا کام پالیسیوں کے لیے وسائل حاصل کرنا اور فراہم کرنا ہے کیونکہ کوئی کام بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے وسائل موجود نہ ہوں۔ اس لیے بجٹ ایک بنیادی دستاویز اور ایک طرح سے تمام پالیسیوں کا مجموعی خلاصہ ہوتا ہے۔

جناب چیئرمین! دوسری بات اور بھی زیادہ سنجیدہ ہے۔ میں ان جیسے پیشہ ور معیشت دان سے یہ توقع رکھتا تھا کہ جو بات وہ اپنی تقریر میں کہہ رہے ہیں، بجٹ دستاویز اس کی گواہی دے گی لیکن مجھے ان دونوں میں بڑا فرق نظر آرہا ہے اور یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بڑے اچھے انداز میں یہ بات کی کہ حکومت کو سادگی کی ضرورت ہے اور اس کے لیے تنخواہوں کے علاوہ اخراجات کو ہم منجمد کر رہے ہیں لیکن آپ بجٹ دستاویز دیکھیں تو یہ انجماد کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کی بات کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ بجٹ میں تنخواہوں کے علاوہ اخراجات کو اس مقام پر منجمد کر دیا جاتا جو ۱۰-۲۰۰۹ء کا نظر ثانی شدہ تخمینہ ہے لیکن یہاں وہ نظر نہیں آتا، تکنیکی طور پر یہ بہت بڑا اسقم ہے۔

میں ایک اور مثال دوں، انہوں نے اعلان کیا ہے کہ بنیادی تنخواہ میں ہم پچاس فیصد اضافہ کریں گے، میں اس پر رائے الگ ظاہر کروں گا لیکن اس اعلان کا تقاضا یہ تھا کہ بجٹ میں اس کو ظاہر کیا جائے۔ اس لیے کہ کم از کم اس کی بنا پر یہ ساٹھ ستر ارب روپے مرکزی بجٹ میں اور پھر صوبوں میں دکھائی دیتے لیکن بجٹ دستاویز میں ہمیں یہ کہیں نظر نہیں آتے۔ اصل بجٹ دستاویز اور پالیسی کی تقریر جو بجٹ کا بیانیہ ہے ان میں مطابقت نہ ہو تو تکنیکی طور پر یہ ایک بہت بڑا اسقم ہے۔

ایک تیسرا اسقم جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا وہ یہ ہے کہ یہ بجٹ ۱۸ویں ترمیم کے بعد آنے والا پہلا بجٹ ہے۔ ۱۸ویں ترمیم میں جناب چیئرمین! اس قوم نے ایک بہت بڑا اقدام صوبائی خود مختاری کا، دستور کی مشترکہ (Concurrent) فہرست کو ختم کرنے کا اور صوبوں کی طرف وسائل کو منتقل کرنے کا اٹھایا ہے۔ بلاشبہ اس کے لیے ہم نے ایک سال کی مدت رکھی ہے لیکن جناب چیئرمین! اس بجٹ کو اس بات کا عکاس ہونا چاہیے تھا کہ کس طریقے سے اس ترمیم کے نتیجے کے طور پر مرکز کے بجٹ میں تبدیلیاں آنی چاہییں۔ مثال کے طور پر ایسے کم از کم اکیس وزارتی شعبے ہیں جو اب صوبوں کو منتقل ہو گئے ہیں۔ لیکن بجٹ پر نظر ڈالیں تو ان وزارتوں کے بارے میں ماضی کی طرح کا ہی بجٹ دیا گیا ہے۔ ۱۸ویں ترمیم

کے نتیجے کے طور پر ساڑھے پانچ سو میں سے ایک سو پچیس ایسے سرکاری ادارے ہیں جنہیں صوبوں کی طرف منتقل ہونا ہے، ان کا بجٹ صوبوں میں جانا چاہیے اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی منصوبہ اس کے اندر آنا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ تقریباً اڑھائی لاکھ سرکاری ملازمین ایسے ہوں گے جو مرکز میں فالتو ہو جائیں گے اور ان کو صوبوں کی طرف جانا چاہیے لیکن ان پیچیدہ مسائل پر بجٹ خاموش ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بجٹ سازی کوئی اور کر رہا تھا، قانون سازی پارلیمنٹ کر رہی تھی اور وزیر خزانہ نہ معلوم اس وقت کہاں تھے؟ بالآخر بجٹ کا اعلان حسب سابق ان چیزوں کا خیال رکھے بغیر کر دیا گیا۔ اس کے اندر بہت بڑے اور تکنیکی سقم ہیں جن کی شیخ صاحب جیسے پیشہ ور معیشت دان سے میں توقع نہیں کرتا۔

ایڈہاک ازم کا مسئلہ: جناب والا! ماضی کے مسائل کو بیان کرنا اور ماضی کی حکومت کی کارکردگی میں کیڑے نکالنا اپنی جگہ پر سیاسی عمل کا ایک حصہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خود اس زمانے کی معاشی پالیسیوں پر اس ایوان میں تنقید کر رہا تھا جب آج کے حکمران ان کی حمایت کر رہے تھے۔ لیکن اب آپ کو تقریباً اڑھائی سال مل گئے ہیں۔ یہ حکومتی مدت کا درمیانی وقفہ ہے، صرف اڑھائی سال آپ کے پاس بچے ہیں باقی تو گزر گئے۔ چنانچہ معیشت کی آج جو صورتحال ہے اس کی ذمہ داری براہ راست آپ کی حکومت پر ہے، آپ کو اس کا سامنا کرنا چاہیے۔ لیکن مجھے اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ماضی کی کہانیاں ہمیں سنا رہے ہیں جبکہ اڑھائی سال جو آپ کی حکمرانی کا دور ہے اس میں ہم کہاں پہنچے ہیں اس کا ذکر مفقود ہے۔ تھوڑی بہت معیشت دان کی حیثیت سے جو میری نگاہ ہے اس کی بناء پر مجھے سب سے زیادہ پریشانی یہ ہے کہ میں نے اتنی بے جوڑ اور متضاد مقاصد پر مبنی معاشی پالیسی پاکستان کی تاریخ میں نہیں دیکھی ہے۔ کوئی جامع اور مربوط پالیسی موجود نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر وزیر اور ہر شعبہ اپنی بات چلا رہا ہے۔

ایڈہاک ازم ہمیشہ رہا ہے لیکن ایڈہاک ازم کی جتنی متضاد شکلیں آج مجھے نظر آرہی ہیں یہ بڑی پریشان کن ہیں۔ اسی طریقے سے جس تیزی سے یہاں وزارت خزانہ میں تبدیلی

آتی رہی ہے وہ بھی بے حد تشویشناک ہے۔ تبدیلی کے لیے ہم انکار نہیں کرتے لیکن تسلسل بھی بہت ضروری ہے۔ آپ نے سوا دو سال میں چار وزیر خزانہ تبدیل کر دیے ہیں۔ اور ہوتا یہ ہے کہ ہر وزیر کے ساتھ سیکرٹری اور پوری ٹیم بھی بدلتی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے ؟ اس صورتحال میں پالیسی میں تسلسل کیسے آئے گا ؟ جناب والا ! وزیر خزانہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اقتصادی بحالی کر رہے ہیں اور ہم اسے مستحکم کریں گے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی ۔ اس کو مانا نہیں جا سکتا۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں تیزی سے آپ کو یہ بتاؤں کہ اس اقتصادی سروے کی بنیاد پر پاکستان کی معیشت کا کیا آزاد تجزیہ کیا گیا ہے۔

غربت، مہنگائی اور بے روزگاری: جناب چیئر مین ! غربت میں اضافہ ہوا ہے۔ محتاط ترین اندازے کے مطابق ۴۰ فیصد آبادی غربت کی لکیر کے نیچے رہ رہی ہے۔ اگر دو ڈالر آمدنی اس کی بنیاد بنائیں جو یومیہ ۱۶۰ روپے بنتے ہیں تو ۶۷ فیصد آبادی غربت کی شکار ہے۔ یہ نظر آرہا ہے کہ ۲۰ فیصد امیر ترین لوگوں کے پاس ساری دولت ہے اور وہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں جس سے معاشرے کے اندر تصادم، نفرت، تناؤ اور انتہا پسندی پیدا ہو رہی ہے۔ اکثریت نقصان اٹھا رہی ہے۔ ابھی جو سروے پاکستان کے حالات پر ہوا ہے، اس میں فراہمی خوراک میں عدم استحکام ہے۔ اس وقت ہماری ۵۸ء۶ فیصد آبادی غیر یقینی صورت حال کا شکار ہے اور ۶۱ فیصد اضلاع وہ ہیں کہ جہاں خوراک کی غیر یقینی صورت حال کا مسئلہ ہے۔ جس ملک میں یہ صورتحال ہو، حقیقت یہ ہے کہ وہاں کے حکمرانوں اور پارلیمنٹ کے ارکان کی نیند اڑ جانی چاہیے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں لیکن یہاں کسی پر کوئی فرق پڑتا نظر نہیں آتا۔ جناب والا! پاکستان کی ۶۳ سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ ہوا ہے کہ ۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء کے درمیان صرف ایک سال میں ملک میں گندم کا استعمال ۱۰ فیصد کم ہوا ہے یعنی لوگوں کو روٹی دستیاب نہیں یا ان کی اس تک رسائی نہیں۔ اس سروے کے اندر ایک بڑی تعداد وہ ہے کہ جو ایک وقت کی روٹی مشکل سے کھاتے ہیں۔

مہنگائی کی صورت حال یہ ہے کہ ۲۰۰۹ء میں مہنگائی کم ہوئی تھی۔ ہمارے جو بھی اعدادوشمار ہیں ان میں سالانہ ۹ء۸ فیصد مہنگائی تھی لیکن آج یہ مہنگائی ۵ء۱۳ فیصد ہے اگر آپ سود کو لیں تو ۵ء۱۵ فیصد ہے اور حال ہی میں پاکستان پر آئی ایم ایف کی ایک رپورٹ آئی ہے، اس میں انہوں نے کہا ہے کہ اس زمانے میں پاکستان کے شہریوں کی اوسط قوت خرید ۲۳ فیصد کم ہوئی ہے۔ جناب والا! یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے۔

توانائی کے بحران کی کیفیت یہ ہے کہ جو تکلیفیں ہوتی ہیں وہ اپنی جگہ ہیں لیکن پیداوار جس طریقے سے نیچے گئی ہے وہ جی ڈی پی کا ۲ فیصد ہے اور اقتصادی جائزہ نے کہا ہے کہ یہ صرف توانائی کی بناپر ہے۔ ۱۳۳۲ صنعتی یونٹس ان دو سالوں کے اندر بند ہوئے ہیں۔ بے روز گاری کے بارے میں اعتراف کیا گیا ہے کہ تھوڑی سی بڑھی ہے لیکن جناب والا! یہ بہت ہی گمراہ کن بات ہے۔ جو پچاس ملین لوگ برسر روز گار ہیں ان میں ۴۵ء۱۴ ملین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ بلا معاوضہ کام کر رہے ہیں یا یہ روز گار کی تلاش میں ہیں اور یہ کام بھی کر رہے ہیں لیکن ان کو کوئی اجرت نہیں دی جاتی۔ یہ برسر روز گار ہونے کی عجیب وغریب تعریف ہے۔ جناب والا! بے روز گار افراد میں ۳۸ فیصد وہ ہیں جو ۱۰ سے ۲۵ سال عمر کے درمیان ہیں۔ میں سوال کرتا ہوں کہ کیا نوجوانوں میں انتہا پسندی اور عسکریت میں اضافہ کا ایک سبب یہ بے روز گاری نہیں ہے؟ پبلک سیکٹر میں ۲۶۰ ارب روپے کا خسارہ ہے، جو صرف چھ بڑے بڑے اداروں نے کیا ہے۔ یہ سارا کیوں ہوا ہے؟ اس لیے کہ ان اداروں کو پیشہ ورانہ طور پر میرٹ کی بنیاد پر چلانے کی بجائے اپنے پسندیدہ لوگ لگائے گئے ہیں جنہوں نے دو سال کے اندر ان اداروں کو تباہ کر دیا ہے اور اب ان اداروں کی نجکاری کی بات کی جارہی ہے۔

کھلی منڈی اور نجی شعبہ کا کردار: کھلی منڈی اور نجی شعبہ معیشت کا میں خود قائل ہوں لیکن یہ کہنا کہ معیشت سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک فرسودہ خیال ہے، حقیقت نہیں ہے۔ آج دنیا میں اور بالخصوص امریکہ اور یورپ شدید معاشی بحران میں کیوں ہے؟ اس کی

وجہ یہ ہے کہ نجی شعبہ، بینکوں اور سرمایہ کار اداروں نے اتنا استحصال کیا جس کے نتیجے کے طور پر صرف دو سال میں ۹ٹریلین ڈالر سے زیادہ کا نقصان ہوا ہے اور گورنمنٹ کے کردار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب تک وہ تقریباً ۳ٹریلین ڈالر معیشت کو سنبھالنے کے لیے خرچ کر چکے ہیں۔

گورنمنٹ کے کردار کو مثبت انداز میں ہونا چاہیے، یہ ایک تسلیم شدہ روایت ہے۔ مارکیٹ ضرور ہونی چاہیے لیکن مارکیٹ کے ساتھ ساتھ قومی مقاصد اور تزویراتی ضروریات بہت اہم ہیں جن کے لیے حکومت نے مثبت کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارا ماڈل سرکاری و نجی شعبہ کی شراکت کا ہونا چاہیے نہ قومیانے کا اور نہ مکمل منڈی کی معیشت کا جو کسی کے قابو میں نہ آئے۔ یہ آج تک نہیں ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر کام کیا جائے۔

خودانحصاری اور دہشت گردی کی جنگ: جناب والا! وزیر خزانہ نے خودانحصاری کی بات کی ہے لیکن اس بجٹ میں یا اقتصادی جائزے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ ہم کس طرح خودانحصاری کی طرف جائیں گے اور کس طرح موجودہ ذلت سے نکلیں گے؟ معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ ملک اپنی معاشی خودمختاری کے بعد اب، سیاسی خودمختاری بھی کھو رہا ہے۔ میں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بڑا ہی اہم اور فوری مسئلہ ہے۔

دہشت گردی کی جنگ ہمیں اتنی مہنگی پڑ رہی ہے کہ اس کا صحیح حساب کتاب بھی ممکن نہیں۔ امریکہ نے ہمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے لیکن آج حکومت وہی پالیسی، پہلے سے بھی زیادہ برے انداز میں اپنائے ہوئے ہے جو مشرف نے شروع کی تھی۔ سروے میں جو تازہ ترین اعداد و شمار دیے گئے ہیں اس کی رو سے اب تک ۴۳بلین ڈالر معاشی نقصان قرار دیا گیا ہے۔

جناب والا! ہمارے لیے افسوسناک ہے کہ ہم اب بھی کاسہ گدائی لے کر پھر رہے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جہاں آپ سات سو ارب روپے کے خسارے کا بجٹ

پیش کر رہے ہیں وہاں آپ نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ اس کو کیسے پورا کیا جائے گا؟ کہاں سے لائیں گے ؟ ملکی وسائل سے کتنا ہو گا، بیرونی وسائل سے کتنا ہو گا؟ اس بجٹ کے ساتھ یہ بڑے ہی سنجیدہ مسائل ہیں۔

مالیاتی بد نظمی: جناب والا ! میں آپ سے یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں اس موقع پر مالیاتی بد نظمی کا امکان بہت قوی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلے بھی سپلیمنٹری گرانٹس آئیں، وہ مجھے بھی پتا ہے لیکن طے شدہ بجٹ سے ساڑھے تین سو ارب روپے زیادہ خرچ کرنا، یہ آپ ہی کے دور میں ہو رہا ہے۔ بیس فیصد آپ نے زیادہ خرچ کیا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے میں نے پوری فہرست بنائی ہے اس کو پڑھ کر مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں لاکھوں نہیں، اربوں روپے ہم نے اشتہارات کے لیے دیے ہیں جس کا کوئی پہلے سے مد نہیں تھا۔ اس میں ہم نے اعلیٰ اشرافیہ کلچر اور اپنے مکانات کی تعمیر کے لیے اربوں روپے خرچ کیے ہیں۔ اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ پابندی لگادے کہ بجٹ سے کوئی انحراف نہیں ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ متعلقہ وزارت کابینہ کی منظوری سے بجٹ کے اندر رہتے ہوئے کچھ ردو بدل کر دے۔ لیکن بجٹ سے باہر کوئی بھی خرچہ ہونا ہے تو وہ صرف ایمرجنسی کی صورت میں برداشت کیا جا سکتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ایمرجنسی ہو لیکن اگر ہوتی ہے تو اس کا بھی راستہ یہی ہے کہ فوری طور پر پارلیمنٹ کو اعتماد میں لے کر ضمنی بجٹ لایا جائے۔ درمیانی مدت میں نظر ثانی ہو، درمیانی عرصے کی روشنی میں دیکھ لیں کہ آگے کہاں طے شدہ بجٹ سے انحراف ہونا ہے لیکن جب تک پارلیمنٹ منظور نہ کرے کسی بھی وزارت کو ایک پیسہ بھی بجٹ سے زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

جناب والا! میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آئی ایم ایف کے احکامات کے تحت تصوراتی طور پر ہمارا سارا زور اوپری سطح پر استحکام پر ہے۔ میں اس کے خلاف نہیں ہوں لیکن صرف بڑی سطح پر استحکام سے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور اوپری سطح کا استحکام ترقی کی عمومی حکمت عملی کی ضد ہے۔ ہمارے ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم IMF کی ان

اصطلاحات سے نکلیں۔ جب تک ہماری ترقی کی حقیقی شرح نہ بڑھے اس وقت تک آپ نہ بڑے پیمانے پر حقیقی استحکام لا سکتے ہیں اور نہ ہی غربت کو دور یا دولت کی تقسیم کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس لیے میری نگاہ میں جب تک غریبوں کی حامی، ترقی کی بنیاد پر روزگار پیدا کرنے والی حکمت عملی نہیں ہو گی، یہ ممکن نہیں اور اس کے لیے مثالی نمونہ (پیراڈائم) کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ترقیاتی اہداف: میں آپ سے عرض کروں کہ ۴ء۱ فیصد ترقی کی جو ہمیں خوشخبری سنائی گئی ہے یہ کاغذی ہے اور یہ صریحاً دھوکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۴ء۱ فیصد ترقی وضع کرنے کے لیے سب سے پہلے ۲۰۰۸-۲۰۰۷ء کی شرح ترقی کو کم کیا گیا ہے۔ اسے ۴ء۱ سے پہلے ۳ء۷ کہا گیا پھر ۲ء۳ کیا گیا۔ گویا کہ اس میں ۰ء۸ کی کمی کر دی گئی۔ ۲۰۰۹-۲۰۰۸ء کے اعداد و شمار کو بھی تبدیل کیا گیا ان کو ۲ کی بجائے ۱ء۲ پر لے جایا گیا جسے ۳ فیصد ہونا تھا اسے ۴ء۱ فیصد قرار دیا گیا جبکہ حقیقت میں تین فیصد بھی نہیں تھا۔ یہ دیکھیے میرے پاس ساری دستاویزات موجود ہیں۔ پاکستان نے آئی ایم ایف کو سرکاری یادداشتیں دی ہیں، ان میں سے آخری میرے پاس ہے جو ۳ مئی کی ہے۔ ۳ مئی کو وزیر خزانہ حفیظ شیخ صاحب کے دستخط سے جو نوٹ گیا ہے اس میں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ آئی ایم ایف کی رپورٹ کہہ رہی ہے کہ ۲۰۱۰-۲۰۰۹ء میں حقیقی جی ڈی پی میں اضافہ ۳ فیصد ہی ممکن ہے۔ یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا ہے کہ تین فیصد سے بڑھ کر اچانک ۴ء۱ فی صد کی شرح حاصل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں توانائی کا بحران ہوا ہے جس کے نتیجے کے طور پر جی ڈی پی کا ۲ فیصد نقصان بھی ہوا ہے۔ دوسری جانب اسی زمانے میں اندرونی سرمایہ کاری بھی اور براہ راست بیرونی سرمایہ کاری بھی کم ہوئی ہے۔ ان سارے حقائق کے بعد یہ کہنا کہ ہم نے ۴ء۱ فیصد ترقی کی شرح حاصل کر لی ہے، یہ ایک دھوکا ہے۔ جب تک ہم حقائق کا سامنا نہیں کریں گے اور اس رویہ کو تبدیل نہ کریں گے اس دلدل سے نہیں نکل سکتے۔

سماجی شعبہ پر توجہ: جناب والا! تعلیم، صحت، تحقیق اور انسانی وسائل کی ترقی یہ چار بہت اہم

شعبے ہیں۔ ان میں ہمارا ترقیاتی بجٹ کلی طور پر ناکام ہے۔ ہر ایک میں ہم پیچھے جا رہے ہیں۔ جب تک آپ اس کے لیے وسائل فراہم نہیں کریں گے اس وقت تک آپ معاشی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہاں پر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں افراط زر ایک خاص نوعیت کا ہے۔ اس کو ہم مطلوب افراط زر اور لاگت کے سبب افراط زر دونوں کا مجموعہ کہتے ہیں۔ مطلوب افراط زر کی وجہ آپ کا معاشی عدم تفاوت ہے۔ اس کی وجہ سے ۲۰ فیصد طبقہ جس کے پاس دولت ہے، اس کی طلب ایک سبب بنتی ہے۔ دوسری طرف بیرونی ترسیلات ایک بہت بڑی نعمت ہیں جن سے ادائیگیوں کے توازن کو مدد مل رہی ہے لیکن یہ بھی طلب پیدا کرتی ہیں جن کے لیے ہماری پیداوار کافی نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ توانائی کی بنیاد پر پیداواری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ زراعت کی جو چھوٹی فصلیں اور بڑی فصلیں ہیں دونوں میں آپ پیچھے رہ گئے ہیں، ان میں اضافہ منفی رہا ہے اگر زراعت بہتر ہوئی ہے تو اس کی وجہ مویشی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لاگت دھکا اور طلب کا کھچاؤ (Push اور Pull) دونوں افراط زر کی وجوہات میں شامل ہیں۔ اب یہ اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک آپ کی ترقی کی حکمت عملی نہ ہو اور ترقی کی حکمت عملی کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ کاری کی شرح بڑھے، بچتیں بڑھیں اور اس کے لیے شرح سود جس پر آپ کا نظام قرضہ دے رہا ہے وہ سرمایہ کاری کے حق میں ہو۔ جب تک آپ سرمایہ کاری کو سستا نہیں بنائیں گے اور اس کے لیے ترغیبات نہیں دیں گے۔ آپ نے تحقیق و ترقی کی مد ختم کر دی ہے۔ آپ نے زر تلافی بھی ختم کر دی ہے تو ترقی کیسے ہو گی۔ یہ بہت ہی بنیادی چیزیں ہیں جنہیں کرنا ضروری ہے۔

ٹیکسوں کا نظام: جناب والا! ویلیو ایڈڈ ٹیکس (VAT) ایک اسکینڈل ہے۔ جناب چیئرمین! مارچ ۲۰۰۹ء میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اسے یکم جولائی ۲۰۱۰ء سے لے آئیں گے لیکن مارچ ۲۰۰۹ء میں یہ وعدہ کرنے کے بعد آج تک آپ نے اس کے لیے نہ قوم کو تیار کیا نہ ہی ٹیکس جمع کرنے کا نظام اس کے لیے تشکیل دیا، نہ آپ کے صوبے اس کے لیے تیار ہیں۔

ویلیو ایڈڈ ٹیکس ایک مراجعتی ٹیکس ہے۔ آپ کے ہاں اس وقت بالواسطہ ٹیکس ۶۰ فیصد سے زیادہ ہیں، بقیہ براہ راست ٹیکسوں کو بھی آپ نے ودہولڈنگ ٹیکس کے نام پر آدھا بالواسطہ بنا دیا ہے۔ جب تک آپ اس کو بدلیں گے نہیں یہ نظام ٹھیک نہیں ہو گا۔

اسی طرح آپ نے اس بجٹ میں ایک فیصد سیلز ٹیکس بڑھا دیا ہے۔ پچھلے سال بھی ایک فیصد بڑھایا تھا۔ گویا آپ کے آنے کے بعد جی ایس ٹی ۲ فیصد بڑھا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ۸۰ فیصد آبادی جو عام آدمی پر مشتمل ہے اور جن کو دو وقت کی روٹی اچھی طرح میسر نہیں ہے، وہ اس کو ادا کر رہی۔ دوسری جانب امراء کا حال یہ ہے، کہ سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ صرف درآمدات کے میدان میں انڈر انوائسنگ اور رپورٹ نہ ہونے کی بناء پر جو ٹیکس اور ڈیوٹی چوری ہو رہی ہے وہ ۱۰۰ سے ۳۰۰ بلین روپے سالانہ ہے۔ اس کے ساتھ سارے اندازے یہ ہیں کہ ۲۰۰ سے ۲۵۰ ارب روپے صرف ایف بی آر کی کرپشن ہے۔ جو ٹیکس چوری ملک میں ہو رہی ہے، اس کے بارے میں صحیح اندازہ یہ ہے کہ ۶۰۰ سے ۷۰۰ بلین روپے ٹیکس چوری ہے۔ یعنی آپ باہر سے قرضے لانے کی بجائے اگر کرپشن کو قابو کریں اور ان وسائل کو ٹھیک ٹھیک متحرک کریں تو آپ کے مسائل ہو جائیں گے۔ آپ کو یاد دلاؤں گا کہ اس سے قبل ایک بڑا اہم پہلو یہ زیر بحث آیا تھا کہ ایک بلا تخصیص آزادانہ شفاف عدالتی تحقیقات ہونی چاہیے۔ اڑھائی سال ہو گئے ہیں لیکن اس سلسلے میں آپ نے وہ قانون پاس نہیں کیا۔ جب بھی کمیٹیوں میں وہ قانون جاتا ہے، مفاد پرست عناصر اپنے اثر و رسوخ سے اس کو رکوا دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کرپشن کو روکنا نہیں چاہ رہے ہیں۔ عالمی بینک کی رپورٹ یہ کہتی ہے کہ پاکستان میں پچھلے دس سالوں میں ۴۰۰ فیصد کرپشن بڑھی ہے اور ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ یہ ہے کہ صرف پچھلے ایک سال میں ۱۰۰ فیصد بڑھی ہے۔

آخر میں جناب والا! میں یہ بات کہوں گا کہ جن مقاصد کو وزیر خزانہ نے اپنی تقریر کے آغاز میں بیان کیا ہے، یعنی خود انحصاری، افراط زر پر قابو پانا اور ترقی کی شرح کو بڑھانا یہ تمام مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن جب تک دعوے یا جو خواب انہوں نے دکھائے

ہیں، ہمارے منصوبوں کا حصہ نہ ہوں اور ہمارے وسائل کا استعمال اور ہمارا بجٹ جب تک اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوبارہ نہیں ڈھالا جائے گا ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بجٹ اس پہلو سے بہت ہی ناکام ہے۔ تکنیکی طور پر بہت ہی خام ہے جو دعوے آپ نے کیے ہیں اور اہداف سامنے رکھے ہیں وہ اس میں ظاہر نہیں ہوتے ہیں اس لیے اس پر بھرپور نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم موجودہ حالات، سیاسی اور معاشی دونوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ (۹جون ۲۰۱۰ء)

سینیٹ کی خصوصی کمیٹی کی سفارشات

جناب والا! وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں کابینہ کے جن فیصلوں کا اعلان کیا، بجٹ میں ان کی عکاسی نہیں ہو رہی۔ مثال کے طور پر اعلان ہوتا ہے کہ تنخواہوں کے علاوہ تمام اخراجات کو منجمد کیا جارہا ہے لیکن بجٹ میں وہ منجمد نہیں ہیں۔ اسی طریقے سے کوئی جواز نہیں ہے کہ ۱۸ویں ترمیم کی روشنی میں جو موضوعات صوبوں کو منتقل ہو چکے ہیں انہیں آئندہ فیڈرل گورنمنٹ کے مجموعی مدات کی آمدنی میں ظاہر کیا جائے۔ لیکن ظاہر کیا گیا ہے۔

سینیٹ کی کمیٹی نے ان تمام خامیوں کی طرف متوجہ کیا ہے اور میں عرض کروں گا کہ ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے قومی اسمبلی کو ترامیم کے بغیر بجٹ منظور نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بہت بڑی بے قاعدگی ہوگی کہ ایک طرف آپ ایک پالیسی فیصلہ لیتے ہیں، سینیٹ اس کی روشنی میں آپ کو سفارش کرتی ہے اور اس کے باوجود بھی آپ بجٹ کو خام شکل میں جو کہ دستور یا آپ کی پالیسی سے متصادم ہے، پاس کر لیں۔ بجٹ پر مکمل طور پر نظر ثانی کریں، اسے خام شکل میں نہیں بلکہ اپنی مناسب اور صحیح شکل میں ترامیم کے بعد پاس ہونا چاہیے۔

جناب والا! ضمنی مطالبات زر کا جو قبیح مذاق ہم پر مسلط ہو گیا ہے اس پر سینیٹ نے اس سے پہلے بھی متوجہ کیا ہے اور اس مرتبہ بھی بہت ہی واضح سفارشات دی ہیں۔ اسے

وزارت خزانہ، ایف بی آر اور وزارت قانون نے کمیٹی کے اجلاس میں منظور بھی کیا ہے اور یوں یہ متفق علیہ ہے اور اس میں اپوزیشن اور حکومت کے نمائندوں کا کوئی فرق نہیں ہے، اسے بھی اب ختم ہونا چاہیے۔ اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ تین ساڑھے تین سو ارب روپے کے ضمنی مطالبات زر پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر آپ کر لیں اور بعد میں دستاویزات پیش کر دیں۔ اس لیے سینیٹ نے یہ تجویز کیا ہے کہ بجٹ کے حوالہ سے سہ ماہی اور ششماہی نظر ثانی پارلیمنٹ میں آئے اور اگر آپ کو کسی شعبے میں مزید وسائل ضرورت ہے تو اسے پارلیمنٹ کی اجازت سے آگے بڑھائیں۔ جہاں تک ایک ڈویژن کے اخراجات کی اندرونی مدات میں ردو بدل کا تعلق ہے تو وہ کابینہ کی منظوری سے ہو سکتا ہے لیکن نئے اخراجات پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر صحیح نہیں ہیں۔ یہ بہت ہی بنیادی چیز ہے۔

جناب چیئر مین! سیلز ٹیکس میں جو ایک فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے اس پر کمیٹی نے بہت غور کیا ہے اور میں حکومتی پارٹیوں کے نمائندوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپوزیشن کی تجویز پر خاصی بحث کے بعد اتفاق کیا کہ تین مہینے کے لیے ایک فیصد اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے ہم سفارش کر رہے ہیں کہ سیلز ٹیکس میں جو ایک فیصد اضافہ کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

تنخواہوں میں اضافہ کے بارے میں ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ضروری ہے۔ لیکن ہماری نگاہ میں یہ بات انصاف کے منافی ہے کہ گریڈ ایک تا ۱۶ کے ملازمین اور ۱۷ سے ۲۲ کے ملازمین کو مساوی اضافہ دیا جائے۔ ہماری نگاہ میں ضروری ہے کہ جو کم تنخواہ والے ہیں ان کو زیادہ اضافہ ملے۔ اسی طرح پنشن کے معاملے میں ہم نے یہ بات کی ہے کہ اضافہ کی مقدار اور زیادہ ہونی چاہیے۔ (۱۶جون ۲۰۱۰ء)

حصہ سوم

پارلیمنٹ کے اہم ترین کاموں میں سے ایک سالانہ بجٹ کی منظوری ہوتی ہے۔ بجٹ کی یہ دستاویز تمام حکومتی ذرائع آمدنی اور اخراجات کا احاطہ کرتی ہے۔ یوں پارلیمنٹ میں بحث کے دوران معیشت سے متعلق زندگی کے تمام ہی شعبوں پر اراکین اظہارِ خیال کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ یہی صورت ایسے مواقع پر ہوتی ہے جب کوئی خصوصی اقتصادی پیکج پارلیمنٹ کے سامنے آئے۔ گزشتہ دو حصوں میں شامل تقاریر بیشتر صورتوں میں ایسے ہی مواقع کی ہیں۔ کتاب کے اس حصہ میں وہ مضامین شامل ہیں جو روزمرہ انسانی ضروریات اور سہولتوں کی فراہمی سے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں حکومتی پالیسیوں میں کیا نقائص ہیں اور انہیں کس طرح دور کیا جانا چاہیے ان تقاریر کا مرکزی عنوان رہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ محض وقتی تجاویز کے ساتھ ساتھ ان میں طویل المیعاد منصوبہ بندی کے حوالہ سے بھی اشارے موجود ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون قیمتوں میں اضافہ کے رجحان سے عمومی طور پر بحث کرتا ہے۔ مہنگائی کا مسئلہ کسی ایک حکومت سے متعلق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہنگائی کی بناء پر بھوک، افلاس، بے روزگاری میں اضافے کے سبب ملک میں خودکشی کے واقعات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس تناظر میں روزمرہ استعمال کی اشیاء بالخصوص اشیائے خوراک، صنعتوں کے پہیے کو رواں رکھنے کے بنیادی عوامل ایندھن، تیل کی قیمتوں میں اضافے، عام آدمی کی قوت خرید میں کمی اور افراطِ زر میں بے پناہ اضافے کے اسباب کی نشاندہی کے ساتھ دیگر ممالک کی مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ ان مسائل کو کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا مضمون تیل کی قیمتوں سے متعلق ہے جو طویل عرصے سے پاکستانی معیشت کا اہم ترین مسئلہ رہا ہے، کسی زمانہ میں یہ اضافہ سال میں ایک مرتبہ بجٹ کے ساتھ ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ کام آزاد ریگولیٹری ادارے کے ہاتھ آگیا ہے جو تیل کی عالمی منڈی میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کو جواز بنا کر کچھ عرصہ بعد ملکی سطح پر تیل کی قیمتوں پر نظرِ ثانی کرتا ہے۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ تیل کی قیمتوں کے تعین کا طریقہ کار کیا ہے؟ کثیر القومی ادارے جن کے مفادات تیل کی صنعت سے وابستہ ہیں ان کا تیل کی قیمتوں کے تعین میں کیا کردار ہے؟ ایندھن اور پٹرولیم کی قیمتوں میں اضافے سے

ملکی معیشت کو کس طرح نقصان پہنچتا ہے؟ اور استحصالی طبقات اس سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں؟ دنیا کے مختلف ممالک نے اس قسم کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا ہے۔

مذکورہ بالا تسلسل میں تیسرا مضمون بجلی کی قیمتوں میں اضافہ سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں بجلی کی تقسیم، قیمتوں میں اضافے، لوڈشیڈنگ اور توانائی کے متبادل ذرائع کے حوالہ سے عنوانات زیر بحث آئے ہیں۔ ان وجوہات اور مفادات سے وابستہ طبقات کی نشاندہی کی گئی ہے جو ان مسائل کو حل کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور جن کی بناء پر توانائی کی مناسب قومی پالیسی نہیں بن پا رہی ہے۔ چنانچہ ایک مناسب پالیسی کے لیے تجاویز بھی اس مضمون کا حصہ ہیں۔

چوتھا مضمون خوراک وزراعت کے معاملات سے بحث کرتا ہے۔ خوراک وزراعت کے مسائل کا عوام سے براہ راست تعلق ہے۔ بنیادی ضرورت کی اشیاء کی بلاتعطل فراہمی ہو یا ان کی قیمتیں، انسان کی زندگی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ ان دونوں امور یعنی اشیاء کی فراہمی اور قیمتوں کے متوازن نظام کا تعلق حکومتوں کی بروقت اور بہتر منصوبہ بندی اور اس پر موثر اور دیانتدارانہ عمل درآمد کی حکمت عملی پر منحصر ہے۔ اسی تناظر میں یہ ناقص زرعی ادویات، گندم اور چینی کی رسد اور ان کی قیمتوں میں اضافہ، نیز کھاد کی قلت اور پانی کی فراہمی جیسے مسائل سے بحث کرتا ہے جبکہ پانچواں مضمون پاکستان میں ادویات کی قلت، ان کے معیار اور ان کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے ساتھ ساتھ طب کی ناکافی سہولیات اور اس شعبہ میں موجود کرپشن کے حوالہ سے متعلق ہے۔

چھٹا مضمون عوامی مسائل، ٹرانسپورٹ، رہائش، کچی آبادیوں کی ریگولرائزیشن، پٹرول کی بڑھتی قیمتوں اور دیہی، شہری ہجرت جیسے مسائل سے متعلق ہے۔ مضمون میں متوجہ کیا گیا ہے کہ رہائش کے لیے مکان انسان کا بنیادی حق ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ ہم اجتماعی ترقی کی پالیسی اپنا کر ملک کے تمام علاقوں کے ٹرانسپورٹ، ہاؤسنگ، روزگار، سڑکوں اور شاہراؤں کی تعمیر، کچی آبادیوں کو سہولیات اور پٹرول اور ایندھن کی بڑھتی قیمتوں جیسے مسائل پر کس طرح کنٹرول کر سکتے ہیں۔

قیمتوں میں اضافہ کا رجحان: اسباب اور لائحہ عمل

جناب چیئر مین! پارلیمنٹ کا ایک اہم کام حکومت کی پالیسیوں کی نگرانی، احتساب اور عوام کے مسائل اور مشکلات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ پالیسیاں تبدیل کی جا سکیں۔ آج کی اس تحریک میں ہمارا مقصد حقائق کو جاننا اور پالیسی کے ان پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا ہے جن کی کمزوری کے باعث عوام کے لیے مسلسل مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ مسئلہ محض حزب اختلاف کے ارکان کا نہیں بلکہ یہ پورے ایوان کا اور پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ آیئے ہم سب ملک کے عوام کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے اپنا اثر استعمال کریں۔ غربت اور دولت کی جو عدم مساوات پیدا ہو رہی ہے اس کی اصلاح پر توجہ دیں۔ اور اشیائے ضرورت کی فراہمی کو دونوں اعتبار سے یعنی ان کی سپلائی اور فراہمی کو اس قیمت پر جو عوام کی دسترس میں ہو، یقینی بنانے کی کوشش کریں۔ میری نگاہ میں اچھی حکمرانی کے یہ بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔

جناب والا! حقائق کے اعتبار سے پوزیشن یہ ہے کہ اس ایوان میں پچھلے سیشن میں چینی اور پٹرول کی قیمت کے بارے میں مختلف سینیٹرز نے مسئلے کو اٹھایا تھا۔ اس موقع پر ہم سے وعدہ کیا گیا کہ وزیر اعظم صاحب ایوان میں تشریف لائیں گے اور شوگر پالیسی کے بارے میں وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ سینیٹرز کے سوالات کا جواب دیں گے۔ لیکن آج تک ہم اس حکومتی وعدے کے ایفاء سے محروم ہیں۔ میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی روایت ہم قائم نہیں کر رہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہمارے ملک میں ہمیں نہ کل وقتی صدر میسر ہے اور نہ ہی کل وقتی چیف آف آرمی اسٹاف، اسی طرح کل وقتی وزیر اعظم بھی میسر نہیں ہے جبکہ یہ تمام وہ ذمہ داریاں ہیں جو کل وقتی توجہ کا تقاضا کرتی ہیں۔ در حقیقت

کل وقت اور پوری توجہ دیئے بغیر ان ذمہ داریوں کا حق ادا کیا ہی نہیں جا سکتا اس کے باوجود میں پہلی بات یہ کہوں گا کہ وزیر اعظم صاحب کو اپنی اولین فرصت میں، اہمیت دے کر اور اپنی مصروفیات پر نظر ثانی کر کے اس ایوان میں آنا چاہیے اور مہنگائی کے مسئلے پر حکومت کی پالیسی کے بارے میں سینیٹ میں سوالات کے جوابات دینے چاہییں۔

قیمتوں میں اضافے کا رجحان

جناب والا! قیمتوں میں اضافے کا رجحان تشویشناک ہے۔ جو تازہ ترین اعداد و شمار آج ہی آئے ہیں ان کی روشنی میں اگر فروری کی بنیاد پر سالانہ جائزہ لیا جائے تو تھوک (Wholesale) کی قیمتوں کا انڈیکس ۹ء۹۴ فیصد آگے بڑھا ہے۔ یہ پچھلے سال کے اضافے سے بھی زیادہ ہے۔

چینی کی قیمتیں اور فراہمی: ان اشیائے خوراک میں شکر اوسطاً ے فیصد ہے جو ایک بڑا اہم آئٹم اور ہر شخص کی ضرورت ہے، ایک سال میں اس میں پچاس فیصدی سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ پہلے ۱۷ روپے کلو تھی پھر ۲۱ روپے اور اس کے بعد ۲۷ روپے ہو گئی۔ ۲۷ روپے سے ایک دم چھلانگ لگا کر یہ ۴۰ روپے ہوئی۔ آج کے ڈان میں خبر شائع ہوئی ہے کہ کراچی میں چینی ۴۵ سے ۴۷ روپے فی کلو بیچی جا رہی ہے[1]۔

جناب والا! یہ صورت حال اس کے باوجود ہے کہ عوام مسلسل شور مچا رہے ہیں اور احتجاج کر رہے ہیں۔ اخبارات کے ادارتی کالم اور عام کالم نگاروں کی رائے دیکھ لیجیے اور پھر اسمبلی اور سینیٹ کی کارروائیوں پر نظر ڈال لیجیے جن میں خاص طور پر پچھلے اجلاس میں اس مسئلے کو اٹھایا گیا۔ ہر جگہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ شکر کے سلسلے میں آپ کی پالیسی ہر سطح پر غلط ہے

---

[1] چینی کی قیمتیں ایسی ہی صورت حال سے اس سال [۲۰۲۰-۲۱ء] میں بھی گزر رہی ہیں۔ سال ۲۰۱۹ء سے لے کر اب تک [دسمبر ۲۰۲۰ء] تقریباً ۶۰ روپے فی کلو [۵۵ روپے سے ۱۱۰ روپے] کا اضافہ ہوا ہے۔

اور اس کی وجہ سے مہنگائی ہوئی ہے۔ عام فہم بات ہے کہ چینی کی قیمت کے معاملے میں سب سے پہلا مرحلہ گنا ہے۔ اگر گنے کے کاشتکار کو اس کی صحیح قیمت نہیں ملے گی تو چینی کے لیے گنا جو بنیادی وسیلہ ہے، وہ ضرورت کے مطابق مارکیٹ میں نہیں آئے گا۔

آپ نے گنے کے کاشتکار کو مناسب قیمت دلانے کے لیے کوئی پالیسی نہیں دی[1]۔ نتیجہ یہ ہے کہ گنے کی پیداوار کم ہوئی اور کسان نے متبادل فصلیں اگائیں۔ ساتھ ہی کچھ مقامات پر گنے سے جو گڑ بنتا ہے وہ اتنا نفع آور تھا کہ گنے کا رخ اضافی طور پر اس جانب ہو گیا اور وہ گنا چینی کے لیے استعمال نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد جتنا بھی گنا مارکیٹ میں آتا ہے تو مل مالکان کم قیمت پر خریدنے کے لیے اس کو وقت پر نہیں خریدتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر گنے کی شکر بننے کی جو صلاحیت ہے وہ بھی کمزور پڑتی ہے۔

تیسرا مرحلہ پھر یہ ہے کہ مل مالکان کے گٹھ جوڑ (Cartel) بن گئے ہیں۔ اس ایوان میں کھل کر یہ بات کہی گئی کہ وہ سیاسی عناصر جو آج حکومت میں اہم مقامات پر ہیں، ان کے اس شعبہ سے مفادات وابستہ ہیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ چینی جو ملوں کے پاس موجود ہے وہ بھی مارکیٹ میں نہ آئے اور اس طرح مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمت بڑھوائی جائے۔ اس سلسلے میں اخبارات میں شائع شدہ اندازے یہ ہیں کہ ملک میں چار سے آٹھ لاکھ ٹن چینی کا ذخیرہ موجود ہے۔

اگلا مرحلہ پھر تھوک پر چون کاروباریوں کا ہے۔ آپ دیکھیے کہ ان چاروں سطحوں پر چینی خریدی جا رہی ہے۔ یہ کہا گیا کہ ہم بیرونی ممالک سے چینی کافی مقدار میں منگوائیں گے اور پچاس ہزار ٹن ہم نے منگوا بھی لی ہے اور اب قیمتیں گرنے والی ہیں۔ لیکن قیمتیں گرنے کی بجائے اس کے الٹ ہوا۔ جس وقت یہ فیصلہ ہوا اس وقت قیمت اڑتیس روپے فی کلو تھی

---

[1] اس حوالہ سے کوئی جامع پالیسی اب (۲۰۲۰ء) تک بھی موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد چالیس ہو گئی اور آج ۴۵ سے ۷۴ روپے ہے۔[1]

اس کے بعد جناب والا! کابینہ جاگی اور اس نے کئی مہینے کی غفلت کے بعد اس مسئلے پر غور کیا۔ غور کے نتیجہ میں یہ بات فیصلے کے طور آئی کہ کابینہ اس مسئلے پر تحقیق کرے گی اور ان لوگوں کے خلاف اقدام کرے گی جنہوں نے چینی کا ذخیرہ کیا ہے اور قیمتوں کو بڑھایا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نیب کو کیس بھیجا گیا اور اس کے بعد اسے واپس لے لیا گیا۔ جناب والا! یہ ایک ٹیسٹ کیس ہے چینی کا جس میں پالیسی کی خرابی، اچھی حکمرانی کے فقدان، حکومت کا بروقت فیصلہ نہ کرنا، عوامی دباؤ پر کسی چیز کا آغاز کرنے اور پھر مفاد پرستوں کے آگے سر جھکا کر معاملے کو ختم کرنے جیسی تمام خرابیوں کی جھلکیاں اس میں بالکل واضح ہو کر نظر آجاتی ہیں۔ اس دوران جناب والا! یہ بھی آپ سے عرض کر دوں کہ ٹریڈنگ کارپوریشن کے پاس بھی چینی کا اپنا اسٹاک ۴لاکھ ٹن موجود ہے۔ وعدہ کیا گیا کہ ہم یوٹیلٹی سٹورز کے ذریعے اس کی تقسیم کا کام کریں گے جن کی تعداد ملکی آبادی کے لیے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔

تیل کی قیمتیں: تیل کو لیجیے۔ تیل کی فیکٹری پر قیمت ۲۱٫۵۰ روپے فی لیٹر ہے۔ ٹیکس اور نقل وحمل کے سلسلے میں غلط قسم کے بہت سے اعداد و شمار دیے جاتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آج یہ تیل ۵۶ اور ۵۷ روپے فی لیٹر مل رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی قیمتیں اس کا سبب ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ چینی کے معاملے میں بین الاقوامی تجارتی معاملات پاکستان کے لیے کیوں حوالہ نہیں ہیں۔ درحقیقت بین الاقوامی قیمتیں ہمارے لیے غیر متعلقہ ہیں اور اگر بین الاقوامی قیمتوں کی آپ بات کرتے ہیں تو پھر تو آپ یہ بھی سوچیے کہ بین الاقوامی قوت خرید اور اجرت کا معیار کیا ہے؟ رہا معاملہ تیل کا تو میں بین الاقوامی مارکیٹ میں موجودہ قیمت

---

[1] سال ۲۰-۲۰۱۹ء میں تقریباً ۶٫۶ کروڑ ٹن گنا پیدا کیا گیا، جبکہ کل پیداوار کا ۷۲ فیصد حصہ شوگر ملیں استعمال کرتی ہیں۔ اور اس سے تقریباً ۴۸ لاکھ ٹن [۲۰-۲۰۱۹ء] چینی پیدا کی گئی۔ چینی کی کھپت کے اعداد و شمار کے مطابق سال ۲۰-۲۰۱۹ء میں پاکستان میں ۵۲ لاکھ میٹرک ٹن سے کچھ زائد چینی استعمال کی گئی جو ۲۵ کلو فی کس سالانہ بنتی ہے۔

کی بنیاد پر آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ ریفائنری کے مرحلہ پر قیمت ۲۱ء۷ روپے فی لیٹر ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ حکومت آج تک اس معاملے میں صحیح اقدام نہیں کر سکی؟ میں یہ بھی آپ سے کہہ دوں کہ ۱۹۹۹ء سے اس وقت تک ۱۱۹ بار قیمتیں بڑھائی گئیں اور ہمارے چیخنے کے باوجود ان ۶ سالوں میں یہ کام ان ہی لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے جو اس سارے عمل یا بے عملی کا نفع کما رہے ہیں۔ چنانچہ یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ تیل کمپنیوں کا منافع جو اس سے پہلے کروڑوں میں تھا اب وہ اربوں روپے میں ہے۔

تیل کی قیمتوں کے تعین کا یہ معاملہ اب اوگرا کو دیا گیا ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی رپورٹ بھی نہیں آئی ہے۔ ہمارے مطالبے کے بعد حتّٰی کہ سینیٹ کی کمیٹی نے بھی یہ مسئلہ اٹھایا، اس کے بعد کمیٹی کی سفارشات کو بھی آئے ہوئے غالباً ۱۲ سے ۱۴ مہینے ہو چکے ہیں جس میں یہ ساری باتیں ہم نے کہی ہیں لیکن یہ سب بے نتیجہ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔ یہ حکومت کی پالیسی کی ناکامی اور اس کی نااہلی ہے اور یہ عوام کے مسائل سے بے توجہی اور غفلت ہے۔

حقیقی اجرت میں کمی: جناب والا! ساتھ میں ایک اور بنیادی بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ ملک میں حقیقی اجرت اور تنخواہ کا موازنہ کریں تو بڑی ہولناک صورت حال سامنے آتی ہے۔ تنخواہ کے معنی یہ ہیں کہ کرنسی کی شکل میں کتنی رقم کسی فرد کو دی جا رہی ہے۔ حقیقی اجرت کے معنی یہ ہیں کہ اس رقم کے حصول کے نتیجہ میں اصل قوت خرید کیا ہے جو قیمتوں کے رجحان کو سامنے رکھتے ہوئے نکالی جاتی ہے۔ میرے پاس پچھلا پورا سروے موجود ہے جس کے مطابق حقیقی اجرتوں میں مستقل کمی ہو رہی ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم ترقی کا جو گراف دیکھ رہے ہیں وہ محض نمائشی ہے۔ ہر سال عام آدمی کی قوت خرید کم ہو رہی ہے اور پھر اگر آپ سروے کی بنیاد پر اس کا مزید تجزیہ کریں تو اس میں غریبوں پر اس کا اثر جتنا زیادہ ہے امیروں پر اتنا ہی کم اثر ہے۔ نتیجتاً غریب کی سالانہ اوسطاً حقیقی قوت خرید ۵ سے ۶ فیصد کم ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ بے چین ہیں۔

مسلمان معاشرے میں کبھی خودکشی کا تصور عام نہیں تھا، مغرب اور سیکولر معاشروں کے زیر اثر خودکشی کے کچھ معاملات ہوتے تھے لیکن وہ بھی کبھی کبھار ہوا کرتے تھے۔ جبکہ آج کی افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ آج یہاں فاقے سے مجبور ہو کر خودکشی ہو رہی ہے، جرائم بھی اس بناء پر بڑھ رہے ہیں۔ در حقیقت سماجی انتشار کی اخلاقی وجوہ کے ساتھ ساتھ حقیقی معاشی اسباب بھی ہیں۔ جب تک ہم ان حقیقی معاشی اسباب کی اصلاح نہیں کرتے، بہتری کی توقع نہیں رکھ سکتے۔

جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ساختی اصلاح (Structural reforms) کے نام پر محض ترقی اور بجٹ خسارہ کو قابو کرنے کے ہدف کو سامنے رکھ کر ہم جن پالیسیوں پر عمل کر رہے ہیں اور جن پر پچھلے چھ سال میں آنکھیں بند کر کے اور نتائج سے صرف نظر کر کے عمل کیا گیا ہے، اس نے عام آدمی کے لیے زندگی گزارنا مشکل بنا دیا ہے۔ آپ جب تک پالیسی کے اہداف کو حقیقی طور پر نہیں بدلیں گے، اس وقت تک تبدیلی نہیں آسکتی۔

افراط زر کا مقابلہ کیسے؟

جناب والا! آپ کو معلوم ہے کہ افراط زر کو کنٹرول کرنے کے لیے دو راستے ہیں، ایک طریقہ رسد اور دوسرا طلب کی جانب ہوتا ہے۔ رسد کی جانب سے ہمیں کوشش کرنی ہوتی ہے کہ لوگوں کی ضرورت کی جو اشیاء ہیں، ان کی فراہمی میں اضافہ ہو۔ فراہمی میں اضافہ دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے ایک یہ کہ آپ کاشتکار اور صنعت کار کو معاشی ترغیبات دیں تاکہ وہ معاشی محرک کے تحت سوسائٹی میں اس تعداد اور مقدار میں چیزیں لے آئے جو سوسائٹی کی ضرورت ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ پالیسی کے تحت زر تلافی دیں یا کوئی اور طریقے اختیار کر کے پیداواری لاگت کم از کم رکھیں۔ جو حقیقی مطلوبہ اشیاء ہیں، خواہ ان کا تعلق زراعت سے ہو یا صنعت سے ہو یا چھوٹی صنعت سے، ان کے لیے آسان شرائط پر قرضوں کی سہولت دیں۔ یوں مطلوبہ اشیاء کو آپ جتنا سستا بنائیں گے، اتنی ہی ان کی فراہمی

بڑھے گی۔ بد قسمتی سے ملک میں مطلوبہ اشیاء کی رسد کو متاثر کرنے کی پالیسی، کچھ غفلت، کچھ مفاد پرستی اور کچھ بیرونی اثرات کی بناء پر اس طرح اختیار نہیں کی جارہی۔

زر تلافی: میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا کے جو ممالک ہم پر دباؤ ڈال کر، ہاتھ مروڑ کر اور پیسہ روک کر ہمارے یہاں اہم پیداواری شعبوں میں زر تلافی ختم کروارہے ہیں، ان کی اپنی پوری معیشت زر تلافی کی بنا پر پل رہی ہے۔ امریکہ میں زراعت کے لیے زر تلافی اربوں ڈالر میں ہے، یورپی یونین کی زرعی پالیسی زر تلافی کی بنیاد پر ہے۔ ساری مغربی دنیا ملا کر جس چیز کو ترقی پذیر ملکوں کی امداد کے نام پر دیتی ہے، وہ ۶۰ بلین ڈالر سالانہ ہے اور جو رقم وہ اپنے ملکوں میں زر تلافی کے نام سے اپنی زراعت کو دے رہے ہیں، وہ ۳۶۰ بلین ڈالر سالانہ ہے[1]۔ اگر میں اس کا دوسرے پہلو سے تجزیہ پیش کروں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج دنیا میں آبادی کا ۶۰ فیصدی ۲ ڈالر یومیہ سے کم پر زندگی گزار رہا ہے۔ اور دوسری جانب یورپ میں دودھ کی صنعت کو زندہ رکھنے کے لیے ہر گائے پر ۲ ڈالر فی دن زر تلافی دی جارہی ہے۔ جاپان میں یہ اور بھی زیادہ یعنی ۷ء۵ ڈالر فی دن زر تلافی گائے پر دی جارہی ہے۔ اس طرح وہ اپنا نظام تو چلا رہے ہیں اور ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے زرعی آلات سستے نہ ہوں۔ نتیجتاً جو رسد کے عوامل ہیں وہ افراط زر پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

میں یہ بھی کہوں کہ پیداواری عمل میں بجلی اور تیل یہ بڑے اہم خرچ ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں آندھرا پردیش میں ابھی کانگریس نے جو انتخاب جیتا ہے اس انتخابی مہم میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم زراعت کو بجلی مفت دیں گے تاکہ زرعی پیداوار بڑھے۔ انڈیا میں یہ پالیسی اور بھی مختلف طریقوں سے استعمال ہو رہی ہے اور وہاں پنجاب کی زرعی پیداوار اگر اچھی ہے تو اس کی بڑی وجہ زراعت میں استعمال ہونے والی اشیاء کی قیمت کو

[1] سال ۲۰۱۹ء کے اعداد و شمار کے مطابق چین نے ۱۸۵ ارب ڈالر کی زر تلافی اپنے زراعت کے شعبہ کو دی، جبکہ یورپی یونین نے ۱۰۱ ارب ڈالر، امریکہ نے ۱۴۹ ارب ڈالر، جاپان نے ۳۷ء۶ ارب ڈالر اور حتیٰ کہ انڈونیشیا نے بھی ۲۹ء۴ ارب ڈالر زر تلافی زراعت کے شعبہ کو دی۔

کم رکھنا ہے۔ وہاں کے وزیر اعلیٰ نے حلف لینے کے بعد پہلا اعلان یہ کیا کہ زراعت کے لیے بجلی مفت کر دی گئی، ہماری طرح محض وعدہ نہیں ہوا اس کا فطری طور پر مثبت اثر پیداوار پر پڑا۔

اجرتی آمدن پالیسی: ہمارے ہاں طلب میں بھی پوزیشن یہ ہے کہ اجرتی آمدنی پالیسی موجود نہیں ہے۔ جس ملک میں ایک بہتر آمدنی اور اجرتی پالیسی نہ ہو، وہاں پر معاشی انصاف اور عام انسانوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اسے کبھی بھی ایک غریب پرور پالیسی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ آمدنی پالیسی کوئی آزاد منڈی کے خلاف نہیں ہے، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ پچھلے سوا سو سال میں فلاحی معیشت کے تحت جتنی پالیسیاں بنی اور بن رہی ہیں، منصفانہ آمدنی اور اجرتی پالیسی اس کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی کوئی علامت نہیں ہے۔ ایک ٹوٹی پھوٹی قرضہ پالیسی ہے اور ہمارے خرچوں کی جو ترتیب ہے وہ مسخ شدہ ہے، آپ یہ دیکھے کہ دو سال پہلے کے مقابلہ میں قرضوں کا اجراء کئی گنا مہنگا ہو گیا اور اس کے نتیجے کے طور پر ایک خاص قسم کی فضول اشیائے صرف پیدا کی جارہی ہیں۔ عام کاشتکار کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ آسان شرائط پر قرضہ لے کر پیداوار کو بڑھا سکے۔ تو جناب والا! میں سمجھتا ہوں کہ ہماری پالیسی دونوں اعتبار سے غلط ہے۔ حالانکہ ہم چاہیں تو سب کچھ ممکن ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم قیمتوں کو جائز حدود کے اندر نہیں لاسکتے۔ درست اور بروقت اقدامات سے، انہیں یقینی طور پر جائز حدود میں لایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ بات غلط ہے کہ ہم آمدنی کی تقسیم کو صحیح رخ پر ڈال کر لوگوں کی قوت خرید کو نہیں بڑھا سکتے، اس کو بڑھایا جاسکتا ہے لیکن ہم اس طرف کوئی کوشش نہیں کر رہے۔

سماجی بہبود/زکوٰۃ: میں ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا سماجی بہبود کا پورا وفاقی بجٹ اس وقت ۲۰۲۲ء ۲ بلین روپے سالانہ ہے، اس کے برعکس اگر آپ دیکھیں کہ سماجی بہبود کے لیے خود عوام کیا کر رہے ہیں تو وہ اس سے بہت زیادہ۔ اب تک عالمی بینک کی ایک ہی رپورٹ اس حوالہ سے آئی ہے۔ اس رپورٹ نے یہ بات کہی ہے کہ پاکستان میں نجی شعبہ میں غریبوں کی

مدد کے لیے زکوٰۃ، صدقات اور مذہبی بنیادوں پر ستر ارب روپے سالانہ دیے جارہے ہیں آپ کے وفاقی بجٹ سے چار گنا زیادہ رقم۔ یعنی ہمارے معاشرے میں جان ہے لیکن ہماری پالیسی اور ہماری حکومت میں جان نہیں ہے۔ نہ تصور درست ہے اور نہ ہی پالیسی کی سمت ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر جو وسائل حاصل ہیں وہ بھی صحیح استعمال نہیں ہوتے اور جو وسائل پیدا کیے جاسکتے ہیں، وہ پیدا نہیں کیے جاتے۔

میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ کو جو لازمی زکوٰۃ دی جاتی ہے، وہ چار پانچ بلین سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ اس قدر کم اس لیے ہے کہ عوام کو حکومت پر اعتماد نہیں ہے۔ جبکہ آپ یہ دیکھیے کہ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں زلزلہ آیا تو لوگوں نے کس طرح آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت کی۔ صدارتی فنڈ میں پورے ملک سے سارے وسائل استعمال کر کے اور ساری ترغیبات کے ساتھ جتنی رقوم موصول ہوئیں اس کے مقابلہ میں نجی شعبہ کی تنظیموں نے جو خرچ کیا ہے وہ کم از کم پانچ چھ گنا زیادہ ہے، اس لیے کہ لوگ ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسی تنظیمیں بھی ہیں جن کو لوگوں نے ایک ایک دن میں کروڑوں روپے امدادی کاموں کے لیے دیے ہیں۔ یہ حقائق اس قوم کے اندر جذبہ اور اعتماد کی علامت ہیں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ بنیادی وجہ ہماری پالیسیوں کا غلط ہونا، بری حکمرانی اور کرپشن ہے اور دوسری جانب حکومت کی عدم موجودگی اور پھر رسد و طلب کی تکنیکی تفصیلات پر عمل نہ ہونا ہے۔ تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر افراط زر کو قابو کرنے، پیداوار کو بڑھانے اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کی قوت خرید میں ایک ایسا اضافہ کرنا ہے جس کے ذریعے لوگ اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

درست لائحہ عمل

افسوسناک بات یہ ہے کہ ملک کی معاشی تاریخ میں افراط زر اور مہنگائی کا مسئلہ ماضی کے ہر دور سے کہیں زیادہ گھمبیر، پریشان کن اور تباہ کن ہو گیا ہے۔ یہ ایک آتش فشاں ہے

جس پر حکومت بیٹھی ہوئی ہے اور سمجھ رہی ہے کہ سب اچھا ہے۔ سب اچھا نہیں ہے، اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے، مل کر بیٹھیے اور مسائل حل کیجیے۔ اس ایوان میں مجھے معلوم ہے کہ افراط زر کے بارے میں ایک بار نہیں، کئی بار ہم نے گفتگو کی اور رپورٹس بنائی ہیں۔ لیکن ان سب کا حشر کیا ہوتا ہے، بد قسمتی سے کوئی ان رپورٹوں کو کھول کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا البتہ واشنگٹن سے جو نسخہ آجاتا ہے، اس پر آنکھ بند کر کے عمل شروع کر دیا جاتا ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ واشنگٹن کے اس نسخے کے خلاف آج ساری دنیا احتجاج کر رہی ہے۔ لاطینی امریکہ، ارجنٹائن، نکارا گوا میں دیکھیے کیا ہو رہا ہے؟ جب بھی ڈبلیو ٹی او (WTO) یا جی ایٹ (G-8) کا کوئی اجلاس ہوتا ہے اس پر عوامی رد عمل کی بنیادی ہی یہ ہے کہ یہ ساری معاشی پالیسیاں چند مفاد پرستوں کو مزید طاقتور کرنے کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔ کثیر القومی اصطلاح کے اندر، بیرونی حکومتیں اور خود ہمارے مفاد پرستوں کے اتحاد کام کر رہے ہیں۔ جب تک آپ پالیسی کا رخ نہیں بدلیں گے کہ محض پیداوار نہیں بلکہ منصفانہ تقسیم کی کیا پوزیشن ہے، اہم اشیائے ضرورت کی فراہمی اور عام آدمی کی اس تک رسائی کی کیا صورت حال ہے حالات بہتر بنانا ممکن نہیں ہے۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اور اسلام ضمانت دیتا ہے کہ معاشرے کے ہر شہری کی بنیادی ضرورت پوری ہونا اس کا حق ہے۔ اور بنیادی ضروریات بھی صرف روٹی کپڑا اور مکان تک محدود نہیں بلکہ ٹرانسپورٹ، تعلیم اور اس کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کے لیے بجٹ، یہ ان بنیادی ضروریات کا ایک وسیع تصور ہے۔ لیکن آج ہم اس کو بھولے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے اس کے نتیجہ میں امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جارہا ہے۔ ان کے درمیان خلیج ہی نہیں بڑھ رہی بلکہ نفرت پیدا ہو رہی ہے جو کسی وقت بھی تصادم کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

خدا کے لیے آنکھیں کھولیے، پالیسی کا رخ بدلیے، ترجیحات تبدیل کیجیے اور وہ پالیسی اختیار کیجیے جس کے نتیجے کے طور پر ملک میں حقیقی خوشحالی آسکے۔ خوشحالی محض خوشحالی بینک

قائم کرنے سے اور خوشحالی پروگرام بنانے سے نہیں آتی۔ خوشحالی اسی وقت آتی ہے جبکہ پالیسی کا رخ صحیح ہو اور اس کے نتائج عام لوگوں تک پہنچیں۔ زرمبادلہ کے ایسے ذخائر سے کیا حاصل کہ جنہیں نہ کوئی کھا سکے اور جن سے نہ کسی کی بھوک مٹ سکے اور پیاس بجھ سکے اور نہ کسی کو گھر مل سکے۔

اس وقت ہاؤسنگ کی صورتحال یہ ہے کہ ساٹھ فیصد آبادی ہاؤسنگ سے محروم ہے اور اس تعداد کے اندر ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہم بڑے خطرناک رخ پر جا رہے ہیں۔ خوش فہمی کو ختم کیجیے، سب اچھا کی رٹ لگانا بند کیجیے اور حقائق کو دیکھیے۔ پالیسی کو تبدیل کیجیے ہمارے پاس انسانی اور مادی وسائل ہیں لیکن ان وسائل کا صحیح استعمال نہیں ہو رہا۔ جب آپ ان کو صحیح استعمال کریں گے تو حالات بدلیں گے اور اس کے بعد پھر اللہ کی مدد بھی آئے گی۔ جیسا کہ قرآن میں وعدہ ہے کہ اگر تم ہمارے راستے میں آگے بڑھو گے تو زمین اپنی نعمتیں اگلے گی اور آسمان سے رحمت کی بارش آئے گی لیکن جب تک ہم اللہ کے وفادار نہیں ہیں، اپنے عوام کے وفادار نہیں اور صحیح راستہ اختیار نہیں کرتے تو ہم اس دلدل سے نہیں نکل سکتے۔

(۱۶ مارچ ۲۰۰۶ء)

تیل کی قیمتیں اور فراہمی کے مسائل

تیل کی قیمتوں کا مسئلہ اس حیثیت سے ایک بڑا ہی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے کہ یہ زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے۔ حرارتی توانائی کی وجہ سے تیل کی بنیاد پر جو بجلی بن رہی ہے اس کی صنعت ہو یا پورے ملک میں اشیاء کی نقل و حرکت پر لاگت، غرض جس پہلو سے بھی آپ غور کریں گے، آپ دیکھیں گے کہ تیل اور اس کے جو متعلقات ہیں ان کی قیمتوں کا مسئلہ زندگی کے ہر شعبہ پر اثرانداز ہوتا ہے۔

دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ تیل کی پالیسی ہماری توانائی پالیسی کا ایک اہم حصہ ہے اور وہ ملک جو توانائی میں خود انحصاری حاصل نہیں کر پاتا وہ سلامتی کے اعتبار سے بھی اور اقتصادی لاگت کے اعتبار سے بھی بڑے خسارے میں رہتا ہے۔ ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ تیل کے جو وسائل ہیں ان کو استعمال کیا جا سکے، ترقی دی جائے لیکن ساری کوششوں کے باوجود اپنی ضروریات کا محض ۱۰ فیصد سے ۲۰ فیصد مقامی ذرائع[1] سے حاصل کرنے تک آئے اور پھر پیچھے چلے گئے ہیں۔ جبکہ سارے ارضیاتی مطالعے یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے پاس قدرتی طور پر تیل کے وسائل ہیں۔، ان وسائل کو تلاش کرنا، ترقی دینا، خام تیل کو صاف کرنا اور ان کے لیے ایک طویل مدت پالیسی بنانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس پورے مسئلے کا یہ ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو ہماری یہ خوش نصیبی ہے کہ تیل کی درآمد کے معاملہ میں ہمیں کچھ سہولت سعودی عرب اور کویت سے حاصل ہے۔ تازہ ترین صورت حال تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن ایک زمانے میں ہمارا معاہدہ تھا جس کی بناء پر ہم مارکیٹ کے تناؤ سے کسی

---

[1] یہ شرح اس وقت [۲۰-۲۰۱۹ء] تقریباً ۱۵ فیصد ہے۔

سے کسی نہ کسی حد تک بچنے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ اور یہ ایک غیر معمولی فائدہ مند چیز تھی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ دنیا میں تیل کی قیمتوں میں بلاشبہ نشیب و فراز ہو رہے ہیں اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ مارکیٹ کی قوتوں کے اعتبار سے ان کا اثر پاکستان پر بھی نہ پڑے۔ لیکن ملکی استحکام کی پالیسی کے تحت تیل کی قیمتوں میں روزانہ کی بنیاد پر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کے منفی اثرات سے عوام کو بچانے کے لیے ایک پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ اس کام کے لیے ٹیکس کا جو نظام ہے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ ٹیکس نظام کو صرف آمدنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ٹیکس کا جو عنصر ہے اسے ہم نے اس حیثیت سے استعمال نہیں کیا کہ اس کے ذریعہ قیمتیں ایک سطح پر مستحکم ہو سکتی ہوں اور جو تسلسل صارف کے لیے اور انڈسٹری اور بجلی کی پیداوار کے لیے ضروری ہے وہ اس کے ذریعہ ہم حاصل کریں۔

اس کے بعد اس پورے معاملہ سے جڑا مسئلہ کثیر القومی اداروں کا ہے۔ کثیر القومی اداروں کا ہمارے ملک میں بھی اور ساری دنیا میں بڑا کردار ہے۔ تاہم ہمارے اور ہماری ہی طرح کے دیگر ممالک میں یہ کردار بہت زیادہ شفاف نہیں ہے۔ تیل کی تلاش اور ترقی سے لے کر قیمتوں کے تعین کے اندر ہر جگہ انہوں نے ایسے رویے اختیار کیے ہیں جس سے وہ محض نفع کمانے والی قوت بن گئے ہیں۔ جن ممالک میں وہ کام کر رہے ہیں ان کی معیشت کے استحکام اور ترقی یا وہاں کے عام انسانوں کے لیے سہولتیں فراہم کرنے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ معاملہ محض تیل کی صنعت تک محدود نہیں ہے۔ کثیر القومی اداروں نے تیل کے علاوہ جس شعبہ میں سب سے زیادہ استحصال کر رکھا ہے وہ فارمیسی کی صنعت میں ہے تاہم وہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ کثیر القومی اداروں سے کاروبار کرنے کے لیے ان سارے عوامل کو سامنے رکھ کر ایک جامع پالیسی بنانے اور نگرانی کا نظام بنانے میں کمزوری ہے۔ تیل کی قیمتوں کو مقرر کرنے کے سلسلے میں جو ادارے بھی بنے ہیں، اگر ان کا آپ تجزیہ کریں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ دنیا میں جہاں جہاں

مجلس منتظمہ (Regulatory body) بنتی ہے اس میں تمام اسٹیک ہولڈرز کی نمائندگی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مجلس منتظمہ کے اندر کاروبار سے متعلق ادارے، حکومت اور صارف ان تینوں کا اپنا اپنا کردار ہوتا ہے۔ اس نظام کا خاص طور پر برطانیہ میں نجکاری کے ساتھ استعمال کیا گیا اور میری نگاہ میں دنیا میں سب سے اچھا باضابطہ نظام اس وقت برطانیہ میں چل رہا ہے۔ وہ صارفین کے حقوق کی حفاظت کے ساتھ ہی قوم اور ملک کی معیشت کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ ہمارے ہاں جو نظام ہے، اگر اس کا تجزیہ کریں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ وہ ابتدائی طور پر کثیر القومی اداروں اور ان ہی کے ساتھ کام کرنے والوں کے مفادات کو تحفظ دے رہا ہے لیکن صارفین کو کوئی تحفظ نہیں دیتا۔ یہ اس میں بہت بڑی خامی ہے۔ پھر جناب والا! پاکستان اسٹیٹ آئل کا بھی پالیسی کی تشکیل میں ایک کردار ہے۔ میری نگاہ میں پاکستان اسٹیٹ آئل ہمارا ایک انتہائی اہمیت کا حامل ادارہ ہے۔

ان ساری وجوہات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ایک جامع اور ہمہ گیر تیل کی پالیسی[1] کی ضرورت ہے۔ اس تیل کی پالیسی کی پشت پر تیل کے لیے ڈھانچے کی ضرورت ہے اور اس ڈھانچے میں، میری نگاہ میں کثیر القومی اداروں اور پاکستان اسٹیٹ آئل کا ایک ہم آہنگ کردار ہے جو ہمارے وسائل کے تخمینہ، ان کی تلاش اور ان کی ترقی تمام چیزوں پر محیط ہو۔ تیل کی قیمتیں محض برف کے تودے کی سطح (Tip of the iceberg) کی طرح ہیں۔ پورے برفانی تودے کو دیکھے بغیر آپ اس کے بارے میں صحیح پالیسی نہیں بنا سکتے ہیں۔

اس لیے میں یہ بات تجویز کرنا چاہتا ہوں کہ عمومی بحث کے بعد اس مسئلے کے گہرے مطالعے کے لیے ایک خصوصی کمیٹی بنائی جائے یا توانائی کی قائمہ کمیٹی کو اس کا جائزہ تفویض کیا جائے۔ وہاں پر ہمارے سامنے ساری دستاویزات لائی جائیں اور میں بھی دستاویزات پیش

---

[1] اس وقت Petroleum Exploration & Production Policy 2012، ۲۰۲۰ء سے کچھ ترمیمات کے ساتھ رائج ہے۔ لیکن یہ پالیسی بھی ان مسائل کا حل پیش نہیں کرتی جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ اس لیے ایک جامع تیل کی پالیسی کی ضرورت اب بھی موجود ہے۔

کروں گا۔ میرے پاس اس سلسلے میں ضروری دستاویزات موجود ہیں جن سے کثیر القومی اداروں کا کردار، پاکستان اسٹیٹ آئل کے معاملات، اس ادارہ میں موجود کرپشن اور یہاں آنے والی تبدیلیاں واضح ہوں گی۔ اس طریقے سے گویا کہ یہ ساری چیزیں سامنے رکھ کر معاملات کو دیکھا جائے ور ایک تیل پالیسی تشکیل دی جائے۔ اس کی روشنی میں تیل کے شعبہ کے لیے ڈھانچہ ہو اور پھر وزارت خزانہ کے تعاون سے تیل کے جو ٹیکس ہیں، ان پر غور کیا جائے۔ یہ جو محض پندرہ دن کے بعد قیمتوں تبدیلی کر دی جاتی ہے اس کی حیثیت ایک ایڈہاک نظام کی سی ہے۔ اس میں بھی عمومی رجحان قیمتیں بڑھنے کا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دو تین بار قیمتیں کم بھی کی گئی ہیں لیکن اگر آپ مجموعی رجحان دیکھیں تو پچھلے تین سال کے اندر چالیس فیصد اضافہ ہوا ہے جو عالمی سطح پر تیل کی قیمتوں سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ تیل کی عالمی قیمتیں ہم کنٹرول نہیں کر سکتے اس لیے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے لیکن ان عالمی قیمتوں کو سامنے رکھ کر ایک استحکام اور تسلسل کے ساتھ ملک کے لیے توانائی اور تیل کی پالیسی ہمارا ناگزیر ایجنڈا ہونا چاہیے تاکہ ہم اس کے جھٹکوں کو برداشت کر سکیں اور ہر پندرہ دن کے بعد صارفین اور صنعت کو ایک نئی مصیبت سے دوچار نہ کریں۔

جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ماضی میں تیل کی قیمتوں کو بجٹ کے موقع پر لیا جاتا تھا لیکن جب سے نجکاری کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اس کو پندرہ دن کے بعد نظر ثانی کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے دلیل یہی دی گئی تھی کہ اس طریقے سے ہم زیادہ آسانی کے ساتھ قیمتوں کے عالمی رجحانات کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن میری نگاہ میں یہ پالیسی کامیاب نہیں رہی ہے۔ اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ اس بحث کے اختتام پر اس گفتگو کی روشنی میں اگر وزیر صاحب خصوصی کمیٹی یا توانائی کمیٹی کے سامنے پورے حقائق لائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ وہاں ہم بھی اپنی بات پیش کریں گے اور اس کے بعد یہ کمیٹی تیل کی قیمتوں اور تیل کے ڈھانچے ان دونوں کے بارے میں اپنی سفارشات دے۔

(۱۸؍ فروری ۲۰۰۴ء)

پٹرول کی قیمت میں ناروا اضافہ

جناب چیئر مین! قرآن پاک کی جو آیات ہمارے سامنے ہیں ان میں ایک بڑا بنیادی اصول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ اس اصول کے مطابق حکمت الٰہی یہ ہے کہ انسانوں کو دشواری کی بجائے سہولت دیں۔ بلاشبہ زندگی دشواری اور سہولت دونوں سے عبارت ہے لیکن اسلام کا مزاج یہ کہتا ہے کہ دشواری کو سہولت اور آسانی سے بدلا جائے تاکہ لوگوں کے لیے زندگی گزارنا آسان ہو اور وہ دنیا میں اخلاقی اور ہر اعتبار سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس پسِ منظر میں رمضان کے آنے سے پہلے پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کا جو ایک بم اس قوم پر پھینکا گیا۔ یہ تنگی، دشواری اور مشکلات کی طرف قوم کو لے جانے کا راستہ ہے۔ سہولت، آسانی اور فراوانی کی طرف لے جانے کا طریقہ نہیں ہے۔ پچھلے چھ سال میں ۱۹۹۹ء سے لے کر آج تک پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں ڈیڑھ سو فیصدی سے زیادہ بڑھ چکی ہیں۔ اسی کے ساتھ عام افراط زر کی شرح بھی قابل توجہ ہے۔ دوسری جانب اسے اس طرح دیکھنا چاہیے کہ لوگوں کی آمدنی کا کیا تناسب رہا اور اس کے مقابلے میں قیمتیں کس طرح بڑھیں۔ پٹرول اور ڈیزل کی قیمت، محض چند اشیاء کی قیمت نہیں بلکہ اس میں تبدیلی سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ اس میں ہر درجے کے ٹرانسپورٹ اور کم و بیش تمام ہی اشیاء کی پیداواری لاگت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً پٹرول اور ڈیزل کی قیمت بڑھا کر آپ پورے ملک میں ہر چیز کی قیمت بڑھا دیتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس نے لوگوں کا زندگی گزارنا دوبھر کر دیا ہے۔

جناب چیئر مین! میں بڑے دکھ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اس ملک میں لوگوں کی مشکلات اور ان کے جذبات اور ضروریات کے بارے میں شدید بے حسی پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خصوصاً معاشی وجوہ کی بناء پر خودکشی کے واقعات ہوئے ہوں۔ درحقیقت ان دنوں آنے والی خبروں کے مطابق محض جذبات کی بناء پر نہیں، بے روزگاری کی بناء پر اور فاقے کی بناء پر ہر سال ہزاروں افراد خودکشی کر رہے ہیں۔ میری نگاہ میں ان کی ذمہ داری اس معاشرے اور اس حکومت کے اوپر ہے۔ اس لیے کہ اسلام کا یہ

بھی ایک اصول ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص غیر طبعی حالات میں مر جاتا ہے تو اس کی دیت اس پوری بستی کے اوپر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے لیے پورا معاشرہ ذمہ دار ہے۔

جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کا جو وقت ہے یہ بھی ہر حیثیت سے بہت ہی افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ جنوری سے اس وقت تک کوئی مہینہ ایسا نہیں کہ اس میں پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں اضافہ نہ کیا گیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی قیمتیں بڑھ رہی ہیں لیکن جناب والا! یہ درست نہیں۔ بین الاقوامی قیمتوں میں بلاشبہ اتار چڑھاؤ ہے اور خاص طور سے پچھلے تین چار ہفتوں کا اگر آپ جائزہ لیں تو یہ صحیح ہے کہ امریکہ میں کترینہ طوفان کی وجہ سے قیمتیں ایک دم ۶۸/۷۰ ڈالر فی بیرل تک بھی پہنچ گئی تھیں لیکن اس کے فوراً بعد واپس آئی ہیں۔ اس وقت جبکہ یہ قیمت یہاں بڑھائی گئی ہے بین الاقوامی مارکیٹ کے اندر قیمتیں ۶۸ ڈالر سے کم ہو کر ۶۲ پر آگئی ہیں۔ اگر آپ آگے کی قیمتیں دیکھیں تو اسی ہفتے جو اگلی قیمتیں آئی ہیں وہ ۵۲ سے لے ۵۸ ڈالر فی بیرل تک ہیں۔ اگر آپ مڈل ایسٹ کی قیمتیں دیکھیں جن کا ہمارے ساتھ براہ راست تعلق ہے، تو وہاں کی قیمتیں لندن اور امریکہ میں رائج قیمتوں سے بالعموم آٹھ، دس ڈالر کم ہوتی ہیں۔ یہ بات کہنا صحیح نہیں کہ بین الاقوامی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔

جناب والا! جتنا بھی تحقیقی مطالعہ ہو، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر آپ ۶۰، ۶۲ ڈالر فی بیرل قیمت بھی رکھیں اور لاگت کے اعتبار سے ٹیکس اگر آپ نکال دیں تو پٹرول ۳۲ سے ۳۶ روپے فی لیٹر ہونا چاہیے۔ یہ اس وقت ۵۶ روپے ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہم نے ٹیکسوں کی بھرمار کی ہوئی ہے جس میں ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس بھی شامل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سیلز ٹیکس لگانے کی وجہ کیا ہے؟ ظاہر ہے اس کی وجہ آئی ایم ایف کی شرائط ہیں۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی حاکمیت کو سرینڈر کر دیا ہے اور خود کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

اس پر بھی غور کیجیے کہ اس زمانے میں تیل کمپنیوں نے کتنا نفع کمایا ہے ۶۰ سے ۷۶ فیصد تک اوسطاً منافع انہوں نے کمایا ہے ان کے حصص کو آپ دیکھیں۔ ان میں

۷۰ فیصد تک اضافے ہوئے ہیں یوں ایک طرف حکومت اور دوسری طرف ملٹی نیشنل لوٹ رہے ہیں اور عوام نقصان اٹھا رہے ہیں۔ اس بات کو ہم نے یہاں سینیٹ میں بھی اٹھایا ہے اور کمیٹی میں بھی اٹھایا لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ بلکہ مجھے اخبار میں یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ وزیر اعظم صاحب نے جو کہ بڑے باخبر لوگوں میں سے ہیں، انہوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انہیں گویا اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ پٹرول کی قیمتیں جو کمیٹی مقرر کرتی ہے وہ ملٹی نیشنل اور پیٹرول کی کمپنیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ اس میں حکومت کا نمائندہ ہے اور نہ ہی صارف کا نمائندہ ہے۔ جو ادارہ اس کام کے لیے بنایا گیا تھا وہ آج تک معطل ہے۔

جناب والا! پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ قوم اور ملک کے ساتھ ایک ظلم ہے۔ رمضان کے آنے سے پہلے یہ اقدام ایک بہت بڑا اخلاقی اور معاشی ظلم ہے۔ ہم اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ میں ضروری سمجھتا تھا کہ آج پوائنٹ آف آرڈر کے اوپر اپوزیشن کی طرف سے حکومت کے اس اقدام پر مؤثر احتجاج ہو۔ میں آپ سے بھی درخواست کروں گا کہ اس پر غور کیا جائے کہ یہ کسی ایک پارٹی کا مسئلہ نہیں یہ قوم کا مسئلہ ہے، سینیٹ اس کے اوپر واضح مؤقف لے اور اس بات کی کوشش کرے کہ یہ یک طرفہ اضافہ ختم کیا جائے۔ صارفین کے نمائندوں اور پارلیمنٹ کے نمائندوں کو اس کمیٹی میں لایا جائے تاکہ مناسب احتساب ہو سکے حکومت کا بھی اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا بھی اور پٹرول کی قیمتیں نیچے لے جائی جا سکیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کراچی میں ہڑتال ہوئی ہے اور اگر یہی شکل باقی رہتی ہے تو رمضان کے بعد ملک گیر ہڑتال ہو گی۔

خدا کے لیے ملک کو اس تباہی سے بچایئے اور اس غلط راستے پر چلنے سے اجتناب کیجیے۔ (۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

پٹرول کی قیمت کے تعین کا طریقہ کار

دنیا بھر میں تیل اور گیس کی جو قیمتیں ہیں انہیں مقرر کرنے کے لیے ایک سائنسی نظام اختیار کیا جاتا ہے اور وہ شفاف ہوتا ہے۔ اس پر پارلیمنٹ میں بحث ہوتی ہے، الگ گفتگو ہوتی ہے اور بالعموم اس پر کہیں انحراف نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ اس کو آزادانہ نہیں کیا گیا تھا پھر جب ہم نے مطالبہ کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ خاص طور پر ۲۰۰۲ء سے جب سے کہ اس کو باقاعدہ کیا گیا ہے، جو چیز اس میں رکھی گئی ہے۔ پٹرولیم ترقیاتی فنڈ، ایکسائز اور کسٹم ڈیوٹی، ایکس ریفائنری قیمت، اندرون ملک کرایہ، ڈیلر کمیشن، تقسیم کاری کا خرچہ، جنرل سیلز ٹیکس، متوازی قابل ادا واجبات، مارکیٹ کی قیمت۔ یہ ۹ آئٹم ہیں جن سے وہ کہتے ہیں کہ اس کی قیمت بڑھتی ہے۔ جب ہم نے اسے چیلنج کیا کہ بین الاقوامی قیمتوں کا آپ ہمیشہ سہارا لیتے ہیں کہ چونکہ بین الاقوامی منڈی میں قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس لیے ہم بڑھا رہے ہیں تو پہلی بات یہ ہے کہ اس کے اندر تقریباً ۴۵ فیصد ٹیکس ہیں، خواہ وہ ایکسائز کے نام سے ہوں۔ وہ ترقیاتی فنڈ کے نام سے ہوں یا جنرل سیلز ٹیکس کے نام سے ہوں۔ ہم سے کہا گیا کہ یہ بین الاقوامی قیمت خاص طور سے خلیج کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ ہم اس کا موازنہ کرتے ہیں لیکن جب اس کی گہرائی میں گئے تو معلوم ہوا کہ بین الاقوامی قیمت اور جو ہمارے ہاں قیمت مقرر کی جارہی ہے ان میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بڑا ہی سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس میں قیمتوں کے پورے ڈھانچہ اور اس کے سارے عناصر کے اندر شفافیت نہیں ہے، بلکہ استحصالی عناصر شامل ہیں۔

اگر آپ دیکھیں تو آپ کو ابھی اسٹیٹ بینک کی رپورٹ ملی ہے، میں چاہوں گا کہ اس میں صفحہ ۶۵ کے اوپر جو متضاد طور پر نمائندگی ہے، آپ اسے دیکھیں۔ اس میں صاف نظر آرہا ہے کہ بین الاقوامی قیمتیں نیچے جارہی ہیں اور پاکستان میں قیمت اوپر جارہی ہے۔ تو یہ قوم کے ساتھ دھوکہ بھی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ اس ایوان کو صحیح معلومات نہ دینے کا جرم بھی اس کے اندر شامل ہے۔

پٹرول سے حاصل آمدنی کا استعمال

جناب والا! میں گزشتہ سالوں کا اقتصادی جائزہ دیکھ رہا ہوں، ان میں ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء سے لے کر ۲۰۰۳-۲۰۰۴ء تک جو رواں برس کے اعداد و شمار ہیں۔ ۲ء۱۷۲ بلین روپے صرف پٹرولیم سرچارج کی مد میں دیا گیا ہے اور پٹرولیم سرچارج کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ عام اخراجات کے لیے نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ اس کے ذریعے سے پٹرولیم کی تلاش، ترقی اور ضروری ڈھانچے کی تعمیر ہو۔ ہم اس وقت اپنی ضرورت کا صرف ۱۵ فیصد پورا کر رہے ہیں جب کہ آج سے ۱۵ سال پہلے ہم اپنی ضرورت کا ۳۳ فیصد پورا کر رہے تھے۔ یہ ترقی معکوس ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی، تلاش اور ڈھانچے کی تعمیر پر وسائل استعمال نہیں کیے گئے۔

سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس پورے نظام کے اندر قیمتیں مقرر کرنے کا اختیار ان لوگوں کو دے دیا گیا ہے جن کے مفادات وابستہ ہیں وہ کمپنیاں جو پٹرولیم پیدا کر رہی ہیں۔ دنیا میں یہ کہیں نہیں ہوتا کہ وہ ادارے جو فائدہ اٹھانے والے ہیں وہ قیمتیں مقرر کریں گے۔ ضروری ہوتا ہے کہ صارف اور آزاد ماہرین شامل کیے جائیں۔ میرے علم کی حد تک دنیا میں قیمتوں کے تعین کا کہیں کوئی ایسا ادارہ نہیں کہ جس میں پارلیمنٹ اور صارفین کے نمائندے اور آزاد ماہرین موجود نہ ہوں۔ لیکن یہاں ایک سرکاری ملازم اور اس کے بعد سارے کمپنیوں کے سربراہان یہ دراصل ایک گٹھ جوڑ (کارٹیل) ہے، ایک قسم کی اجارہ داری ہے جو قیمت کے آلے کو استحصال کرنے اور اپنا منافع کمانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

قیمتوں میں اضافے کا فائدہ استحصالی طبقے کو مل رہا ہے

جناب! اس وقت تک جو میں تحقیق کر سکا ہوں اور اس سے میرے سامنے جو بات آئی کہ اس زمانے میں دنیا بھر میں بھی اور ہمارے ملک میں بھی تیل کمپنیوں نے جو منافع کمایا ہے وہ ان کی سرمایہ کاری پر ۴۸ سے ۶۰ فیصد تک بن جاتا ہے۔ اسی طرح ریفائنریز نے نفع

کمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ منافع کس کی قیمت پر لگا رہے ہیں؟ یہ نفع کما رہے ہیں صارفین کی قیمت پر، یہ نفع کما رہے ہیں پیداواری اداروں کی قیمت کے اوپر، یہ نفع کما رہے ہیں ہمارے ٹرانسپورٹرز کی قیمت کے اوپر۔ لیکن حکومت اس معاملے میں آنکھیں بند کیے ہوئے ہے اور ہر پندرہ دنوں کے بعد ایک تلوار ہے جو لٹکائی جاتی ہے اور جب ان کا دل چاہتا ہے وہ استعمال کرتے ہیں۔ درحقیقت عوام کے مفاد میں اس پورے نظام کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱۴فروری ۲۰۰۵ء)

پٹرول ڈیزل پر کاربن سرچارج

میرا یہ خیال ہے کہ اس ایوان کے بیشتر ارکان نے سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ پٹرولیم مصنوعات خصوصیت سے ڈیزل اور مٹی کے تیل پر کاربن سرچارج کے نام سے ٹیکس لگانا مختلف پہلوؤں سے قابل اعتراض ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے تحقیقات کی بنیاد پر جو کہا تھا کہ بین الاقوامی قیمتوں کے گر جانے کے بعد آپ کو عوام کو چھوٹ دینا چاہیے تھی یہ اس فیصلہ کی روح کے خلاف ہے۔ آپ نے عوام کو چھوٹ منتقل کرنے کی بجائے انھیں تقریباً ۱۲۸ بلین روپے کی چھوٹ سے محروم کیا ہے۔ آپ راستہ بدلنے کے لیے بظاہر ایک نیا راستہ اختیار کرنا چاہ رہے ہیں لیکن دراصل ایک نیا ٹیکس لگا کر رقم کو اپنی آمدنی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، یہ اقدام عوام کے خلاف اور سپریم کورٹ کے فیصلے کی روح اور اس کی ہدایت کے خلاف ہے۔

جناب والا! دوسری بات یہ ہے کہ جس طریقے سے یہ کام کیا گیا ہے وہ بھی قابل اعتراض ہے۔ میں طارق عظیم صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا کہ کیونکہ ٹیکس کی رقم منافع مقسومہ میں رکھی جاتی ہے اور اس میں صوبوں کا حصہ ہوتا ہے اس لیے اسے سرچارج کی حیثیت دی گئی ہے۔ درحقیقت اس طرح اس کو ایک سرچارج بنا کر آپ نے صوبوں کو بھی اپنے حق سے محروم کیا ہے۔ ہماری خواہش

تو یہ تھی کہ آپ یہ بالکل نہ لگاتے اور اصل میں میری اور ساتھیوں کی تجویز یہی تھی کہ آپ اس کو نہ لگائیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر قیمتیں گرنے کے جو فوائد ہیں، وہ عوام کو منتقل کریں۔

بلاشبہ آپ جو ٹیکس لگارہے ہیں، اس کا اصل کام محض آمدنی میں اضافہ نہیں ہے بلکہ معاشیات کی اصطلاح میں اسے حفاظتی والو (Safety valve) کہا جاتا ہے کہ جب بین الاقوامی قیمتیں کم ہو جائیں تو اُس وقت آپ کے پاس جو اضافی پیسہ آرہا ہے وہ بعد میں قیمتوں کو مستحکم رکھنے کے لیے استعمال ہو جب بین الاقوامی قیمتیں بڑھ جائیں۔ یوں یہ ایک قسم کا قیمتوں میں استحکام کا فنڈ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم نے اس کو کلی طور پر تبدیل کر کے آمدنی میں اضافے کا ایک ٹیکس بنا دیا ہے۔ ہم اس تصور کے خلاف ہیں لیکن اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ بجٹ سے متعلق حکومت کی کچھ مجبوریاں ہیں اور حکومت کے ذرائع وسائل محدود ہیں، ہم یہ تجویز کر رہے ہیں کہ اس کی مجوزہ شرح کو اس وقت کم از کم ۵۰ فیصد سے کم کیا جائے تا کہ عوام کو کچھ نہ کچھ چھوٹ ملے۔

(۲۰جون۲۰۰۹ء)

بجلی کی پیداوار، قیمتوں کا تعین اور تقسیم کا نظام

جناب چیئرمین! بجلی کا مسئلہ کئی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ سب سے پہلی چیز عوام کی ضرورت اور سہولت ہے۔ لوگوں کو روشنی کی فراہمی اور گرمی کے موسم میں جو کم از کم پنکھا ان کو درکار ہے اس کا اس سے براہ راست تعلق ہے۔ دوسری بات جناب والا! صنعت، زراعت اور تجارت سے اس کا براہ راست تعلق ہے اور یوں مجموعی طور پر پیداواری خرچ اور لاگت کا اس پر انحصار ہے۔ اس طرح بجلی کی قیمت میں اضافے کے اثرات ملک بھر میں پیداواری اور تجارتی سرگرمیوں اور ان کی قیمتوں پر پڑتے ہیں۔ یہ چیز آگے بڑھ کر ہماری مصنوعات کی بین الاقوامی مسابقت متاثر کرتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے اگر آپ دیکھیں تو بجلی کی قیمت کا بڑھنا ایک بڑا ہی گھمبیر قومی مسئلہ ہے۔ دراصل بجلی عام ضروریات میں سرفہرست آتی ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے سستے دام پر فراہم کیا جائے۔

یہ دلیل مضحکہ خیز ہے کہ ہمیں پیداواری لاگت پوری کرنی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بجلی کی پیداواری لاگت کیا ہے؟ جناب والا! ہمارے ملک میں پن بجلی کی جو بھی لاگت ہے اور اس کی بنیاد پر میگا پراجیکٹس اور چھوٹے منصوبے بھی ہیں دونوں کے بارے میں صحیح پالیسی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بجلی کم قیمت پر فراہم نہ کی جاسکتی ہو۔ لیکن چونکہ آپ نے اس کے ساتھ تھرمل اور پھر کوئلے اور ڈیزل سے بننے والی بجلی کو بھی شامل کیا ہے اور دوسری جانب آپ تیل کی مصنوعات کی قیمت بڑھاتے چلے جارہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بجلی کی لاگت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے لاگت کے معاملہ کو زیادہ گہرائی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے بجلی کے پورے نظام کے لیے جو سفید ہاتھی (واپڈا)

بنایا ہوا ہے اس کی کارکردگی نہایت ناقص ہے۔ آپ تجزیہ کیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ پیداواری لاگت جس بناء پر زیادہ ہے اس میں بجلی کی ترسیل کے دوران ہونے کے نقصانات کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ ادارہ میں بدانتظامی، غیر ضروری خرچ اور کرپشن ہے۔ بجلی بلوں کے نادہندگان بھی لاگت کو بڑھانے میں اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں۔ اور ان نادہندگان کے اندر خود حکومت اور سرکاری ایجنسیاں ایک بہت بڑی پارٹی ہیں۔ ان سب نااہلیوں کی سزا آپ صارفین، انڈسٹری اور زراعت کو دے رہے ہیں۔ اس کے بعد بار بار آپ یہ کہتے ہی کہ واپڈا کہتا ہے کہ ۳۰ فیصد بڑھاؤ اور ہم آپ پر بڑا اکرم کر رہے ہیں کہ ۱۰ فیصد بڑھا رہے ہیں۔

جناب والا! یہ افسوسناک دلیل ہے اس کو ہم قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ جب تک آپ اس معاملے میں اپنی پالیسی اور اپنی ترجیحات کو بالکل تبدیل نہیں کرتے بجلی کی پیداواری لاگت کم نہ ہوگی۔ مثال کے طور پر آپ نے تقسیم کار ایجنسیوں کو بڑھا کر لاگت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اگر کارکردگی کا موازنہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ نہ فعالیت حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی پیداواری لاگت کم ہوئی ہے لیکن منافع بڑھ گیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر آپ یہ دیکھیے کہ ان تمام ایجنسیوں نے اثاثے بنا لیے ہیں تقریباً سوا سو بلین روپے کے اثاثے واپڈا اور اس کی ایجنسیوں نے بنائے ہیں اور صارف کو اضافی شرح سے ادائیگی ادا کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ہم نے نیٹ ہائیڈل پراجیکٹ کے سلسلے میں صوبہ سرحد کے مصالحتی ٹربیونل میں جانچ پڑتال کی تو اندازہ ہوا کہ بجلی کے معاملہ میں بے انتہا بدانتظامی، شگاف اور چور راستے ہیں جن کے نتیجے کے طور پر نہ ہمیں اپنا حق مل رہا ہے اور نہ صارف کو۔ اسی لیے جناب والا! میں سمجھتا ہوں کہ اتنا اہم مسئلہ ہے کہ اس کو وزیر صاحب کو کھلی بحث کے لیے قبول کرنا چاہیے۔ یہ صرف اپوزیشن کا مسئلہ نہیں ہے، یہ پورے ملک کا مسئلہ ہے اور اس کے اوپر عام آدمی اور ملکی معیشت دونوں کا انحصار ہے۔

(۹ مئی ۲۰۰۷ء)

بجلی کی قیمتوں میں اضافہ

جناب چیئرمین! ہماری اس تحریک کا مرکزی نکتہ بجلی کی قیمتوں میں اضافہ ہے پچھلے تین سال میں یہ اضافہ ۷۰ سے ۸۰ فیصد ہو چکا ہے[1] اور اس کے بعد پھر غالباً دسمبر میں یہ بات طے کی گئی کہ بغیر اعلان کیے ہر مہینے دو فیصد اضافہ کیا جائے گا جو جون تک جاری رہے گا۔ اس سلسلہ میں میرا پہلا اعتراض یہ ہے کہ جو بھی فیصلہ ہو اسے شفاف ہونا چاہیے، قوم کے سامنے آنا چاہیے اور اس پر پارلیمنٹ میں بحث ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں اس طرح بجلی کی قیمتوں میں اضافہ قواعد وضوابط، روایات اور آداب کے خلاف ہے اور خاص طور پر معاشی نقطہ نظر سے اس کے جو ہولناک اثرات اور نتائج ہیں وہ ہماری توجہ کے خصوصی مرکز ہونے چاہییں۔

جناب والا! جہاں تک بجلی کی ہماری پیداواری صلاحیت کا تعلق ہے یہ صلاحیت اس وقت ۱۹ ہزار میگاواٹ ہے[2]۔ لیکن اس صلاحت کے مقابلہ میں پیداوار اس کا نصف یا نصف سے کچھ زیادہ ہے۔ دوسری جانب بجلی کا لازمی خرچ زیادہ ہے۔ پیداوار اور خرچ سال کے مختلف حصوں میں اوپر نیچے ہوتا ہے لیکن ۲ ہزار سے ۴ ہزار میگاواٹ تک کی کمی لازماً ہوتی ہے جس کی وجہ سے لوڈشیڈنگ کرنا پڑ رہی ہے۔ یوں ہم دوہرے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف قیمتوں میں اضافہ اور دوسری طرف لوڈشیڈنگ کے سبب بجلی کی عدم دستیابی۔

مجھے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ عام شہریوں کے لیے یہ کتنا ہولناک منظر نامہ ہے۔ کچھ علاقوں میں آٹھ گھنٹے، دس گھنٹے اور حتّٰی کہ بارہ بارہ گھنٹے لوڈشیڈنگ ہو رہی ہے۔ چند مراعات یافتہ لوگوں کو چھوڑ کر غالباً کوئی بھی علاقہ ایسا نہیں ہے، جہاں پر لوڈشیڈنگ

---

[1] حالیہ عرصہ میں صرف ۲۰۱۹ء میں بجلی کی قیمتوں میں ۶۲ فیصد اضافہ کیا گیا۔

[2] سال ۲۰۲۰ء [۳۰ جون ۲۰۲۰ء] کے اعداد کے مطابق ملک کی بجلی کی پیداواری صلاحیت ۳۸۷۱۹ میگاواٹ ہے۔ لیکن بجلی کی ترسیل کے نظام کی صلاحیت صرف ۲۲۰۰۰ میگاواٹ ہے جس کی وجہ سے لوڈشیڈنگ اب بھی موجود ہے۔

نہ ہو رہی ہو۔[1] اب صورتحال یہ ہے کہ ردِ عمل میں عوام سڑکوں پر نکل رہے ہیں، ٹائر جلا رہے ہیں اور احتجاج کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پیداوار میں کمی گذشتہ تین سال میں آخر ہم کیوں پوری نہیں کر سکے۔

یہ بڑا بنیادی سوال ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے ہر سوال کے جواب میں پچھلی حکومت کا نام لے دیا جاتا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ میرے پاس جو معلومات ہیں ان کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ۲۰۰۰ء سے ۲۰۰۸ء تک ان آٹھ سالوں میں چھ سال ایسے ہیں کہ جن میں بجلی کی پیداوار اور تقسیم میں تجربہ منفی ہے اور بلاشبہ یہ پس منظر کا ایک اہم حصہ ہے لیکن یہ کوئی نامعلوم چیز نہیں تھی۔ جب ۲۰۰۸ء کے انتخاب میں پیپلز پارٹی نے حصہ لیا ہے ان کے سامنے یہ پورا پس منظر موجود تھا۔ اسی پس منظر میں انہوں نے حکومت میں آکر یہ دعویٰ کیا تھا اور بہت جلد تاریخ بھی دی تھی کہ دسمبر فلاں تک لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی۔ لیکن کوئی قابل ذکر بہتری ایک معمولی اضافے کے علاوہ اب تک نہیں ہوئی ہے۔

میری نگاہ میں صورت حال کی خرابی میں ایک بڑا اہم عامل ترسیل کے دوران ضائع ہونے والی بجلی (Line losses) کا ہے اور یہ ضیاع بھی نیا مسئلہ نہیں ہے[2]۔ کم از کم بیس سال سے تو میں اس ایوان میں یہ بات کہہ رہا ہوں اور سن رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضیاع کو کنٹرول کرنے کے لیے کوئی نمایاں بہتری نہیں ہوئی۔ ترسیل کے دوران بجلی کے ضیاع کو کنٹرول کرنے کے لیے دو چیزیں ہوتی ہیں ایک نظام کی لیکیج کو روکنا اور دوسرا بجلی چوری کو روکنا۔ چوری عام چیز ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آج اس کو چیک کرنے کے

---

[1] پچھلے ۵ سالوں [۲۰۲۰-۲۰۱۵ء] میں پاکستان میں بجلی کے نئے منصوبوں کی وجہ سے بجلی کی کمی کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے اور اس وقت [۲۰۲۱ء] میں پاکستان کے پاس طلب سے زیادہ بجلی بنانے کی صلاحیت ہے۔

[2] اب صورت حال مختلف ہے۔ بجلی کی پیداوار کا مسئلہ تو حل کر لیا گیا ہے لیکن بجلی کی ترسیل کا نظام ابھی بھی عدم توجہی کا شکار ہے۔ اس وقت [۲۰۲۱ء] بجلی کی ترسیلی استعداد صرف ۲۲۰۰۰ میگاواٹ ہے جو گرمیوں میں بجلی کی طلب [تقریباً ۲۵۰۰۰ میگاواٹ] کو پیداواری صلاحیت موجود ہونے کے باوجود پورا نہیں کر سکتی۔

لیے ٹیکنالوجی موجود ہے۔ آپ ہر علاقے کے اندر ایسے میٹر لگا سکتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس علاقے میں کل کتنی بجلی استعمال ہوئی ہے اور اس کے مقابلہ میں وصولی کے بل بھیجے گئے ہیں۔ ہمارے سامنے جو اعداد آئے ہیں ان کے مطابق چار تقسیم کار اداروں (DISCOs) میں چوری نسبتاً کم ہے جبکہ چار میں بہت زیادہ ہے اور یہ شرح ۱۷ سے ۳۷ فیصد تک اوپر نیچے جاتی ہے جو دنیا میں ریکارڈ ہے۔ اس ریکارڈ کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اس کو کنٹرول کرنے کے لیے کچھ کیا ہی نہیں جارہا ہے۔ ترسیل کے دوران بجلی کے ضیاع اور چوری کے بارے میں پالیسی کا فقدان بڑا اہم پہلو ہے۔

اگلی چیز ترقیاتی ڈھانچہ سے متعلق ہے۔ اگر آپ گہرائی میں جا کر دیکھیں تو یہ بنیادی چیز ہے۔ ترقیاتی ڈھانچہ کسی بھی سوسائٹی اور معیشت کے لیے از حد ضروری چیز ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں اور جو بھی اعداد میں نے دیکھے ہیں اس میں صاف نظر آرہا ہے کہ ترقیاتی ڈھانچے کے لیے مختص فنڈ اور وسائل میں برابر انحطاط آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو صلاحیت موجود ہے وہ صلاحیت بھی استعمال نہیں ہو پارہی۔

تیسرا مسئلہ گردشی قرضوں کا ہے۔ گردشی قرضے بھی کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے[1] اور سب کو پتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے۔ اور اس کے لیے کچھ اقدام بھی کیا گیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اقدام بہت تاخیر سے کیا گیا۔ اور جس حد پر اقدام کیا گیا، اس کے بعد کی صورت حال یہ ہے کہ گردشی قرضہ تقریباً اتنا ہی مزید رونما ہو گیا ہے جتنے پر آپ نے اسے کم کیا تھا۔ اس طرح یہ تین اہم شعبے ہیں جہاں مسائل بگڑے ہوئے ہیں۔

دوسری جانب میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ عوام کی تکلیف کے ساتھ ساتھ اس صورت حال کی وجہ سے پیداواری لاگت بڑھ رہی ہے۔ اور صنعت اپنی پیداواری صلاحیت پر

---

[1] گردشی قرضوں کا مسئلہ بڑھتا جارہا ہے۔ جون ۲۰۲۰ء میں یہ عدد ۲ء۱۶۴ کھرب روپے تھا جو بڑھ کر دسمبر ۲۰۲۰ء میں ۲ء۳۰۳ کھرب روپے ہو گیا اور اس خدشے کا اظہار کیا جارہا ہے کہ یہ عدد جون ۲۰۲۱ تک ۲ء۶ کھرب روپے تک پہنچ جائے گا۔

کام نہیں کر پا رہی ہے۔ ہماری بر آمدات اس وقت ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج ہیں۔ ان ساری خرابیوں کے باوجود توقع ہے کہ ہماری بر آمدات ۲۰ سے ۲۲ بلین ڈالرز ہوں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں اگر پیداواری صلاحیت ٹھیک ہو پیداواری لاگت اپنی حدود کے اندر رہے تو مجھے یقین ہے کہ ہم بر آمدات میں ۲۰ بلین سے با آسانی دو سال کے اندر ۳۰ بلین پر پہنچ سکتے ہیں۔ در حقیقت اگر پاکستان کی صلاحیت آپ دیکھیں تو ہمیں اس وقت تک ۴۰ اور ۵۰ بلین ڈالرز کے درمیان بر آمدات[1] پر آجانا چاہیے تھا لیکن پہلے جنرل مشرف کے دور میں وقت ضائع ہوا اور اب یہ تین سال بھی پالیسی کا فقدان رہا یا پالیسی میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے انڈسٹری اور بر آمدات متاثر ہوئیں۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ جب ہم انڈسٹری اور بر آمدات کی بات کرتے ہیں تو اس کا تعلق روزگار سے بھی ہے۔ ایک جائزے کے مطابق، ملک میں پچھلے تین سال کے اندر، ۱۸۰۰ صنعتیں مکمل طور پر بند ہو چکی ہیں۔ سال کے کچھ حصے کے لیے تو ساری کی ساری صنعتیں بند رہی ہیں۔ آپ اندازہ کیجیے کہ اس کے روزگار پر کیا اثرات ہیں، لوگوں کی ضروریات زندگی پر کیا اثرات ہیں اور خاص طور پر جو دیہاڑی دار مزدور ہوتے ہیں جن کا انحصار ہی یومیہ روزی پر ہے، ان کے لیے تو یہ ایک بڑا ہی گھمبیر مسئلہ ہے۔

جامع توانائی پالیسی کی ضرورت

جناب چیئرمین! میں ساتھ ہی یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میری نگاہ میں ایک بڑا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں توانائی کی جامع پالیسی موجود نہیں ہے۔ توانائی میں بجلی، گیس، پٹرولیم، پن بجلی، ایٹمی توانائی اور دوسرے ذرائع شامل ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک جامع اور ہمہ گیر توانائی پالیسی ہو توانائی کی ایک وزارت ہو اور اس کے مختلف ڈویژن ان مختلف شعبوں کے بارے میں ذمہ دار ہوں تاکہ ایک مربوط مجموعی پالیسی اختیار

[1] بدقسمتی سے بر آمدات کا عدد ابھی بھی ۲۰ ارب ڈالر [۲۰-۲۰۱۹ء] کی حد تک ہی ہے۔

کی جاسکے۔ خصوصاً ملک اس وقت جس معاشی بحران اور معاشی ترقی کے مراحل میں ہے، توانائی اس کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس لیے میں یہ تجویز دوں گا کہ جب ہم تنظیم نو کر رہے ہیں تو ایک مکمل وزارت توانائی ہونی چاہیے جو توانائی کے تمام ذرائع کو سامنے رکھ کر ایک مربوط پالیسی بنائے۔

دوسری بات یہ ضروری ہے کہ توانائی پالیسی سال بہ سال نہیں بلکہ طویل عرصے کے لیے ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں تو ہفتہ بہ ہفتہ اور مہینہ بہ مہینہ پالیسی بنتی ہے۔ میری نگاہ میں اسے لمبے عرصے کے لیے ہونا چاہیے۔ اس لمبے عرصے میں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ توانائی کے مختلف ذرائع کے بارے میں ترجیحات قائم کریں۔ کونسی توانائی ایسی ہے جو سستی ہے اور دوسری جانب جس کی فراہمی پر انحصار کیا جاسکتا ہے اور جس کی فراہمی کے ذرائع پاکستان میں ہیں۔ اگر ہم ان تینوں مسائل کو سامنے رکھ کر پالیسی بنائیں تو آپ دیکھیں گے کہ پن بجلی ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ سستی، سب سے زیادہ قابل اعتماد اور مکمل طور پر ملک کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ دوسری چیز کوئلہ ہے۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ تھر کے کوئلے کے بارے میں پہلی فزیبلٹی رپورٹ، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، آج سے بیس سال پہلے بنی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان بیس سالوں میں وہ کون سے عوامل ہیں اور کون سے افراد ہیں یا لابیاں ہیں جن کی وجہ سے توانائی کے اس ذریعہ کو استعمال کرنے اور اسے ملک میں توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنانے کے لیے، کوئی مؤثر اقدام نہیں ہوا ہے۔

جناب والا! اسی طرح میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہوائی چکی کے ذرائع بھی اہم ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شمسی توانائی کی معاشی طور پر پنپنے کی صلاحیت کچھ خاص مقامات پر ابھی مشکل ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شمسی توانائی کے کچھ شعبے ایسے ہیں، جس پر کیلیفورنیا میں، اسرائیل میں، ایران میں، انڈیا اور چین میں کامیاب تجربات ہوئے ہیں مثلاً سڑکوں پر روشنی۔ اسٹریٹ لائٹس کے بارے میں سارے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ شمسی توانائی کے ذریعے

ان تمام مقامات پر بہت کم لاگت سے، بہت قابل اعتماد انداز میں آپ توانائی پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بائیو گیس کا معاملہ ہے۔ آپ دیہات کو بجلی دیتے ہیں جبکہ بجلی آپ کے پاس ہے نہیں۔ اس کی بجائے آپ ایسی حکمت عملی بنائیں کہ جس سے ان دیہات میں جہاں بجلی نہیں ہے، وہاں متبادل ذرائع کو اختیار کیا جائے۔

جناب چیئر مین! میں نے ایک موقع پر جائزہ لینے کی کوشش کی کہ متبادل توانائی کے سلسلے میں کتنے ادارے ہمارے ہاں کام کر رہے ہیں۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی کارکردگی صفر ہے۔ ان اداروں پر کروڑوں روپے ہر سال خرچ کیے جارہے ہیں لیکن ان کے کام کی کوئی جانچ پڑتال نہیں۔ جہاں کہیں کوئی چیز دریافت کی گئی ہے یا تجویز کی گئی ہے، اس پر پھر عمل نہیں ہوتا۔ منصوبہ بندی کمیشن ناکام ہے، وفاقی حکومت ناکام ہے ان تمام چیزوں کے لیے کوئی باضابطہ نگرانی نہیں ہے۔ اس لیے میں کہوں گا کہ توانائی کا مسئلہ بے حد گھمبیر ہے۔ ہمارے ملک کی خوشحالی، عوام کی سہولت اور مستقبل کی معاشی ترقی کا انحصار اس کے اوپر ہے۔ اس کے لیے ایک جامع پالیسی اور ایک وزارت ہونی چاہیے جو تمام متعلقہ شاخوں کو دیکھے۔ اس کے لیے ایک ایسی پالیسی ہو جس میں توانائی کے تمام متعلقہ ذرائع کا اشتراک ہو۔ اور بیک وقت فوری اور درمیانی اور طویل المیعاد منظر نامہ سامنا رکھا جائے۔ آج کیا ہے، تین سال بعد کیا ہو گا، پانچ سال بعد اور دس سال بعد کیا ہو گا۔ طویل المیعاد وژن لے کر ہم چلیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے پاس اپنے وسائل ہوں گے اور خاص طور پر بیرونی انحصار کو ہم کم کر سکیں گے۔

میں اس کے حق میں ہوں کہ ایران سے ہمارے لیے گیس آئے۔ اس میں بھی مجھے دکھ ہے کہ تقریباً بارہ پندرہ سال ہو گئے ہیں، اب کہیں جا کر معاملہ طے ہوا ہے اور اب بھی مجھے ڈر ہے کہ ہم نے اس معاہدے کے اندر جو ہدف دیا ہے۔ لیکن اگر ۲۰۱۴ء تک ہم اپنے حصے کا کام پورا نہیں کرتے ہیں تو توانائی وصول کیے بغیر ہمیں جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ ہمیں

۲۰۱۳ء یا ۲۰۱۴ء میں نہ بتایا جائے کہ ہم نہیں کر سکے، یہ کام آج کرنے کا ہے[1]۔

جناب والا! خلاصہ کے طور پر میں کہنا چاہوں گا کہ ایک مربوط پالیسی ہو مربوط ترجیحات ہوں، مؤثر نظام ہو، طویل مدت پر اس کام کو آپ انجام دیں، پارلیمنٹ کو برابر اعتماد میں لیں اور مؤثر کارکردگی اور متواتر نگرانی کو یقینی بنانے کے لیے ہر سال بتائیں کہ ہم کہاں تک پہنچے ہیں۔ اگر ہم نے توانائی کا مسئلہ حل نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ ہم کبھی بھی اپنے معاشی بحران پر قابو نہیں پا سکیں گے اور نہ عوام کو بنیادی سہولتیں فراہم کر سکیں گے۔ (۳فروری ۲۰۱۱ء)

جناب چیئر مین! اس کے ساتھ ہی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ متبادل توانائی وقت کی ضرورت ہے لیکن یہ شعبہ پاکستان میں اب بھی بہت غیر ترقی یافتہ ہے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں اس پر کامیاب تجربات ہوئے ہیں۔ ہمیں ان تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ۲۰۰۳ء میں متبادل توانائی کے فروغ کے لیے ایک بورڈ قائم ہوا۔ ہمارے سامنے یہ آنا چاہیے کہ اس پورے عرصہ میں اس بورڈ کی کارکردگی کیا ہے اور اپنے تجربات کی روشنی میں آپ نے جو نیا قانون بنایا ہے اس میں خامیوں کو دور کرنے اور ضروریات کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ مہیا کیا گیا ہے۔

جناب چیئر مین! دوسری بات اگرچہ بڑی حساس ہے لیکن میں نے دستور کا حلف اٹھایا ہے اور میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے علم میں یہ بات لاؤں۔ مجھے پتا ہے کہ اس وقت کیا مشکلات ہیں اور میں گورنمنٹ کے کسی اچھے قدم کا راستہ روکنا نہیں چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸ویں ترمیم کے بعد متفقہ فہرست (Concurrent list) ختم ہو چکی ہے۔ توانائی اب وفاقی فہرست میں نہیں ہے، بجلی کو پارٹ II میں لایا گیا ہے لیکن متبادل توانائی صرف بجلی کی نہیں

[1] پاکستان آج یعنی ۲۰۲۱ء میں بھی اپنی طرف کی پائپ لائن بچھانے اور دیگر کام مکمل نہیں کر سکا۔ اگرچہ اس کی ایک وجہ ایران پر لگنے والی بین الاقوامی پابندیوں کی بناء پر اشتراک عمل سے گریز بھی بیان کی جاتی ہے۔

ہوتی بلکہ اس میں بائیو گیس، ونڈ پاور اور دیگر ذرائع بھی شامل ہیں جن سے پاور ہاؤس میں آئے بغیر براہ راست توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ صوبائی معاملہ ہے، اب یہ مرکزی موضوع نہیں رہا۔ مشترکہ مفادات کونسل (Council of Common Interest) بجلی کے اعتبار سے انتظامی ہے اس لیے ہمیں اپنے دستور کا احترام کرنا چاہیے۔ گاڑی آگے بڑھنی چاہیے میں راستہ نہیں روکوں گا لیکن میرا فرض ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ آپ اپنا ہوم ورک نہیں کر رہے ہیں۔ وزارت قانون، وزارت توانائی کو دستور کی روشنی میں اپنے اقدامات دیکھنا چاہیے کہ آئندہ قانون سازی کیسے ہو گی۔ کوئی چیز اگر وفاقی فہرست میں ہے تو صوبوں سے قرار داد آنا چاہیے تاکہ آپ وہاں سے اصولی قرار داد لائیں اور پھر آپ وفاقی فہرست میں شامل کر لیں۔ اس لیے ہمیں اپنے آپ کو اس نئے نظام کے لیے تیار کرنا ہے جو اب آیا ہے۔ اگر پہلے دن سے ہی ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے تو یہ بُری مثال ہو گی۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے بورڈ میں تو صوبوں کی اصطلاحات استعمال کی ہیں گو بہت ہی معمولی ہیں لیکن مجھے تعجب ہوا کہ جو رپورٹ آپ اپنی کارکردگی کی پیش کر رہے ہیں، وہ صرف مرکز تک محدود ہے۔ یہ ایک شرمناک چیز ہے۔ اس موقع پر ہی مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ آپ نے تعریف کے حصہ میں شمال مغربی صوبہ سرحد تحریر کیا ہے جبکہ وہاں کا نام اب خیبر پختونخوا ہے، این ڈبلیو ایف پی نہیں ہے۔

(۴ مئی ۲۰۱۰ء)

زراعت و خوراک کے مسائل

شکریہ جناب چیئرمین! میں سینیٹر محمد اکرم کو ہدیہ تبریک پیش کروں گا کہ انہوں نے ایک ایسی قرارداد پیش کی جو سیاسی یا حزبی نہیں بلکہ فی الحقیقت ملّی اور قومی ہے۔ بلاشبہ ہماری توجہ اس وقت بلوچستان پر ہے جو ایک نسبتاً پسماندہ علاقہ ہے اور اس اعتبار سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کی ترقی پر توجہ دی جائے۔

پانی ایک بنیادی ضرورت

پہلی بات یہ سامنے آنی چاہیے کہ پانی انسان کی ایک نہایت ہی بنیادی ضرورت ہے۔ اسلام نے جن بنیادی ضروریات کو ہر فرد کا حق قرار دیا ہے اس میں خوراک، پانی، لباس، تعلیم اور مکان شامل ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ مدینے ہجرت کے بعد ایک اہم کنواں جس پر یہودیوں کا قبضہ تھا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کو کئی مشکلات پیش آرہی تھیں، اس کے بارے میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ دعوت دی کہ اس کو خرید کر صرف اپنے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے عام کر دیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کیا۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک مسجد، مدرسہ اور کنواں یہ تین بنیادی چیزیں رہی ہیں جن کو مسلمانوں نے اپنی منصوبہ بندی اور حکمت عملی میں مرکزی اہمیت دی ہے۔ مسلمانوں کے اوقاف کے بھی یہ اہم عنوانات رہے ہیں۔ آج ہم ان چیزوں کو بھول گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مغربی محققین جو رپورٹیں پیش کر رہے ہیں اس کے ذریعہ ہم ان چیزوں کی اہمیت کو جان رہے ہیں۔ درحقیقت پانی نہ صرف روزمرہ انسانی ضرورت ہے بلکہ زراعت کے حوالہ سے بھی ہماری بنیادی ضرورت ہے اور ہماری منصوبہ بندی، علاقائی ہو، صوبائی ہو یا

مرکزی ہو، اس میں اس کو بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔

جناب والا! آج تیل کے مسئلے پر دنیا میں بڑی لے دے ہے، لیکن جتنی تحقیق اس وقت دنیا میں ہو رہی ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اگلے پچاس سال میں سب سے بڑا مسئلہ پانی کا ہو گا اور آئندہ جنگیں پانی پر ہوا کریں گی۔ اس لیے ہمیں آج اس کے لیے منصوبہ بندی اور تیاری کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح فوڈ سیکورٹی کا مسئلہ بھی ہے جو پانی کی فراہمی کے ساتھ اور یوں انسانی جانوں کے تحفظ کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔ بلوچستان ہی نہیں پورے ملک میں پانی کے مسئلہ کے مختلف پہلو ہیں لیکن ان میں سب سے پہلی ضرورت ہر فرد کے لیے پینے کے صاف پانی کی فراہمی ہے۔ اس کے بعد پھر مویشیوں کے لیے پانی اور پھر زراعت جس میں شجر کاری، پھل اور مویشی آتے ہیں۔ اس پہلو سے پانی کا مسئلہ بڑا مرکزی مسئلہ ہے۔ بلوچستان میں کاریز کا بڑا تاریخی سلسلہ تھا لیکن مختلف وجوہ سے آج وہ پوری طرح مؤثر نہیں رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جو چیز ہزاروں سال پہلے بنائی گئی تھی، آج کے حالات کی مناسبت سے اس کی دیکھ بھال اور تزئین نو کرنا اور اس کو ایک نئی شکل دینے کا کام نہیں کیا گیا۔ خاص طور پر آزادی کے ان پچاس پچپن سالوں میں ہم نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔

جناب والا! میں آپ کے توسط سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں اور میری نگاہ میں یہ ایوان کی اجتماعی رائے ہے کہ اس وقت ملک میں پانی کا بحران ہے۔ آبی گزر گاہوں کا مسئلہ آبی انتظام کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور زراعت کے لیے صرف ۶ فیصد پانی چھوڑا جانا میری نگاہ میں ایک مجرمانہ فعل ہے۔ آپ کے پاس اگر پیسے نہیں ہیں تو اپنے بیرونی سفر کم کیجیے۔ اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو ہم جو دعوتیں کرتے ہیں اور ایک ایک دعوت پر لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں، آپ اس کو ختم کریں۔ اپنا طرز زندگی تبدیل کیجیے۔ لیکن اگر آپ زراعت کے لیے صرف ۶ فیصد پانی چھوڑتے ہیں تو میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک مجرمانہ اقدام ہے جس کا احتساب ہونا چاہیے اور اس کی ذمہ داری محض

متعلقہ وزیر پر ہی نہیں بلکہ پوری حکومت پر عائد ہوتی ہے[1]۔

میں پانی کے بڑے منصوبوں کے خلاف نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑے منصوبوں کا لاگت کے اعتبار سے جو فائدہ ہے وہ اتنا نہیں ہے جتنا ہمیں بتایا جاتا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ بڑے منصوبوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے منصوبے بھی لائے جائیں جن میں ٹیوب ویل، کاریز، چھوٹے ذخائر آب اور ایسے ڈیم شامل ہوں کہ جو بیک وقت بجلی بھی پیدا کر سکیں اور زراعت کے لیے بھی استعمال کیے جا سکیں[2]۔ ان تمام چیزوں کے لیے سب سے پہلی ضرورت ایک ایسے سائنسی سروے کی ہے جس سے ہم تلاش اور نشاندہی کر لیں کہ کون کون سے مقامات اس کے لیے مفید ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیر زمین پانی کے بے پناہ وسائل ہمیں دیے ہیں، یہ ہمارا کام ہے کہ اس پر منصوبہ بندی کریں، انہیں ترقی دیں اور اس کے لیے صحیح ٹیکنیک استعمال کریں۔ آج ایسی ٹیکنالوجی موجود ہے جو چھوٹے چھوٹے محلوں اور گاؤں میں اور مقامی ذرائع کو کام میں لا کر بھی استعمال ہو سکتی ہے، ہم گیس کے ذریعے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں ان چیزوں کو کام میں لا سکتے ہیں۔

اس پہلو سے میں سمجھتا ہوں کہ صحیح سروے، مناسب منصوبہ بندی اور کم قیمت پر چھوٹے منصوبے، جو زیادہ تعداد میں ہوں اور جن کی پورے علاقے میں زیادہ دستیابی ہو، یہ ہماری وقت کی ضرورت ہیں۔ آپ ساری توجہ صرف بڑے ڈیموں پر صرف نہ کریں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش کریں کہ اس معاملے میں چھوٹے بڑے منصوبوں کا ایک جال بچھایا جائے۔ جس طرح میرے ایک ساتھی نے کہا کہ صرف آسٹریلیا اور انڈیا ہی نہیں

---

[1] (۳۱ مارچ ۲۰۱۰ء)

[2] حالیہ سالوں [۲۰۲۰-۲۰۱۳ء] میں مختلف سیاسی پارٹیوں نے چھوٹے ڈیموں کے منصوبے بنانے کے وعدے تو کیے لیکن ان پر اُس زور و شور سے عمل نہ ہو سکا۔ اس حوالہ سے سال ۲۰۲۰ء میں عالمی بینک نے ۲۰۰ ملین ڈالر کا قرضہ سندھ حکومت کو ۵ اضلاع میں چھوٹے ڈیم بنانے کے لیے دیا۔ جنوری ۲۰۲۱ء میں حکومت بلوچستان نے ۱۶ چھوٹے ڈیم بنانے کا اعلان کیا اور اسی عرصہ میں حکومت پنجاب نے صوبے میں ۱۳ نئے چھوٹے ڈیم بنانے کا اظہار کیا ہے۔

بلکہ اس معاملے میں چین نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ خاص طور پر چھوٹے ڈیموں کے بارے میں جو ان کے تجربات ہیں اس پر بڑی تحقیق سے کام ہوا ہے۔ یہاں تک بات کہی گئی ہے کہ ان ڈیموں کے ذریعے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کی جاسکتی ہے جو بجلی، زراعت اور صنعت ان تینوں کے لیے مفید ہے۔ یہ سارے تجربات موجود ہیں ان سے حقیقی انداز میں فائدہ اٹھایئے۔ ہمیں اونچی تنخواہوں پر بڑے بڑے اعزازیے لینے والے غیر ملکی مشیروں کے چکر سے نکلنا چاہیے جو صرف بڑے منصوبوں کی بات کرتے ہیں اور زمینی حقائق سے واقف نہیں ہوتے، یہ راستہ ہے اس چیلنج سے مقابلہ کرنے کا۔ (۱۲ اپریل ۲۰۰۴ء)

کھاد کی قلت

جناب چیئرمین! آپ جانتے ہیں کہ زرعی پیداوار کا انحصار بہت بڑی حد تک فرٹیلائزر پر ہے۔ درحقیقت کھاد زراعت اور خوراک کی سیکورٹی کے لیے ایک اہم ضرورت ہے اور فوڈ سیکورٹی کا مسئلہ اس وقت پاکستان ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک گھمبیر صورت اختیار کرچکا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اقوام متحدہ، انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن اور ایف اے او (FAO) سب اس بات پر پریشان ہیں کہ اجناس کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور آبادی کی مناسبت سے پیداوار نہیں بڑھ رہی ہے۔ اس طرح ہم بحران کی طرف جارہے ہیں۔

اس پس منظر میں یہ اطلاعات تشویشناک ہیں کہ حکومت کے پاس جو سٹاک ہے وہ مسلسل کم ہو رہا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ملک میں اس وقت یوریا کی پیداوار صفر پر ہے[1] اور اس کی بنیادی وجہ غالباً گیس کا بحران ہے۔ اس لیے کہ اس کی پیداوار میں گیس کا بڑا اہم عنصر ہے۔ دوسری صورت اسے درآمد کرنے کی ہے جو سعودی عرب سے ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق سعودی عرب سے امپورٹ کا معاملہ دوستی پر ہے اور اس

---

[1] اقتصادی سروے ۲۰-۲۰۱۹ء کے اعداد کے مطابق اس وقت صورتحال اس اعتبار سے بہتر ہے کہ کھاد [یوریا اور ڈی اے پی] خریف ۲۰۱۹ء کے لیے طلب کے تناسب سے وافر مقدار میں موجود تھی اور یہی معاملہ ربیع ۲۰-۲۰۱۹ء میں بھی تھا۔

میں مختلف ایسی رکاوٹیں آگئی ہیں، جن کی بناء پر معاملہ آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ حکومت نے اس سلسلے میں اسٹاک کی اس خطرناک حد تک کمی کے باوجود بر وقت امپورٹ کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کئی مہینوں سے معاملہ معلق ہے اور غالباً حالیہ کابینہ اجلاس کے اندر طے کیا گیا ہے کہ سوا دو لاکھ ٹن فور آڈر آمد کیا جائے لیکن اس کی امپورٹ میں کتنا وقت لگتا ہے؟ کہاں سے کی جاتی ہے؟ کس پرائس پر کی جاتی ہے، یہ تمام چیزیں غیر واضح ہیں۔

دوسری جانب جناب والا! اطلاعات یہ ہیں کہ یوریا کی قیمت بھی بڑھائی جا رہی ہے۔ غالباً حال ہی میں ۱۹۰ روپے فی بیگ اضافہ کیا گیا ہے۔ فوڈ سیکورٹی، قیمتوں میں اضافہ اور ذخیرہ میں کمی کے لیے کھاد کی فراہمی کی جو پوزیشن ہونی چاہیے، اس کا فقدان، امپورٹ کے معاملے میں دردِ سر بن گیا ہے۔ یہ وہ چاروں عوامل ہیں جن کی بنا پر ہم کھاد کے میدان میں بہت ہی نازک اور بحرانی صورت سے دوچار ہیں۔ اس لیے میں جاننا چاہوں گا کہ حکومت اس معاملے میں کیا کر رہی ہے اور اسی سلسلے میں مجھے یہ بات بھی کہنے کی اجازت دیجیے کہ گیس سپلائی جو کہ ۴۵ دن لازماً ہونی چاہییں، وہ صرف ۳۰ دن اور وہ بھی لوڈشیڈنگ کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اس پہلو کو بھی سامنے رکھا جائے کہ گیس سپلائی کی یقین دہانی حکومت کس طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے؟ (۴ فروری ۲۰۱۱ء)

غیر معیاری زرعی ادویات

جناب والا! میں صرف دو چیزوں کی طرف وزیر محترم کی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ سندھ اور پنجاب میں جتنی بڑی تعداد میں غیر معیاری زرعی ادویات پائی گئی ہیں۔ اس کے بعد کیا حکومت نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ درآمد کنندگان جو اس پورے معاملے کا اصل ذریعہ بنتے ہیں ان کے بارے میں قواعد و ضوابط میں کوئی تبدیلی کریں۔ قانون بلاشبہ سینیٹ اور قومی اسمبلی بناتی ہے مگر اقدام کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ جب صورتحال ایسی گھمبیر ہے تو اس کے لیے کوئی اقدامات کیے جائیں۔

آپ کی یہ بات صحیح ہے کہ عملدرآمد کا انحصار صوبائی حکومت کے اوپر ہے لیکن کیا حکومت اس بات پر غور کرنے کے لیے تیار ہے کہ کوئی نہ کوئی نظام ایسا بنے جس کے تحت اس صورت حال کے ذمہ داران کے خلاف ایف آئی آر کاٹی جائے۔ اس بارے میں کیا ایکشن لیا گیا اس کی کوئی نہ کوئی رپورٹ لازماً سامنے آنی چاہیے۔ صوبے میں آئے، مرکز میں آئے اور یا صوبائی رابطہ کی وزارت کے سپرد یہ کام کیا جائے۔ میرے خیال میں نظام کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ یہ مسئلہ بہت خطرناک ہے۔ (۷ مئی ۲۰۰۸ء)

سندھ، بلوچستان میں آٹے کی قلت

میں وزیر خوراک وزراعت کی توجہ خصوصیت سے صوبہ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں گیہوں اور آٹے کی قلت پر مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ گو ہمارے پاس معمول کے ذخائر موجود ہیں لیکن یہ سال اس پہلو سے مشکل رہا ہے کہ جو فصل متوقع تھی، اس سے کم ہوئی ہے۔ آپ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ اس میدان میں سمگلنگ بھی بہت ہوتی رہی ہے۔ اس کی وجہ سے سندھ میں خصوصیت سے تقریباً پانچ لاکھ ٹن کی کمی ہے۔ نتیجتاً سرحد، بلوچستان میں بھی آٹے کی قیمت بڑھ رہی ہے۔ لوگ ذخیرہ کرتے ہیں اس سے اور زیادہ طلب بڑھ جاتی ہے تو مصنوعی قلت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور مارکیٹ کی قیمتیں متاثر ہوتی ہیں۔ اس دوران بازار سے فراہمی کی جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہو رہی ہے۔ جو معلومات اخبارات میں آئی ہیں ان کی رو سے سرحد اور سندھ میں گندم کی جتنی ضرورت ہے اس سے ایک چوتھائی سے کم سپلائی ہو رہی ہے۔ مجھے علم ہے کہ اقتصادی رابطہ کمیٹی نے گندم درآمد کرنے کی کوشش کی ہے اور غالباً اس سلسلے میں ایک آدھ آرڈر دے بھی دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود میری نگاہ میں یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ اس سلسلے میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ:

۱۔ خوراک کے معاملات میں ہماری نسبتاً درمیانی مدت کی پالیسی ہونی چاہیے۔ تین سال

پہلے آپ کے پاس زائد از ضرورت گندم موجود تھی۔ اصولاً ذخیرہ کی گئی خوراک کی لازمی مقدار اس طرح ہونی چاہیے کہ تین سے پانچ سال کے اندر فصلوں کی پیداوار کے اندر جو بھی کمی بیشی ہو، اس کو ہم برداشت کر سکیں۔ دنیا کے تمام مقامات پر یہ کام ہوتا ہے۔ آخر ہمارے ہاں یہ کیوں نہیں ہوتا۔ بے بنیاد اطلاعات کی وجہ سے جس وقت گڑبڑ ہوئی تو گندم برآمد کر دی گئی[1]۔ چینی کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے، گندم کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ ایک مربوط پالیسی کی ضرورت ہے۔ جب اس قسم کے مسائل پیدا ہو جائیں تو افسر شاہی کا سرخ فیتہ اور کاہلی جنم لیتی ہے۔ یہ خوراک کا مسئلہ ہے۔ تازہ ترین رپورٹس کی رو سے سرحد اور سندھ دونوں کے پاس فروری کے آگے کی سپلائی نہیں ہے۔ اگر یہ اطلاعات صحیح ہیں تو یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے۔ جناب والا! میں یہ چاہوں گا کہ اس بارے میں حقائق ہمارے سامنے لائے جائیں۔

۲۔ جن جن علاقوں میں رکاوٹیں ہیں اور بروقت گندم کی فراہمی نہیں ہو پا رہی ہے، وفاق اس معاملے میں اپنا کردار ادا کرے اور جس صوبے کے پاس زائد از ضرورت گندم موجود ہے، حتّٰی کہ حکومت کے پاس جو لازمی ذخائر ہیں ان میں سے بھی ایک منصوبے کے تحت بروقت گندم جاری کی جائے۔ ان چیزوں کے لیے رسل ورسائل کے انتظامات ہوں۔

۳۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ اس بارے میں کم از کم ایک درمیانی مدت کی پالیسی بنائیں نیز خوراک کی قیمتوں کے فیصلے بروقت کیے جائیں یعنی اس طرز عمل کو تبدیل کریں کہ جس قیمت پر آپ فصل اٹھاتے ہیں اس کے بارے میں فیصلے بعد از خرابی بسیار ہوتے

---

[1] گندم کی پیداوار پچھلے ۵ سالوں [۲۰۱۵ سے ۲۰۲۰ء] میں بھی تنزلی کا شکار ہے۔ ۱۶-۲۰۱۵ء میں ۲۵ء۶۳ ملین ٹن گندم پیدا ہوئی جبکہ سال ۲۰-۲۰۱۹ء میں یہ عدد کم ہو کر ۲۴ء۹۴ ملین ٹن پر آ گیا۔ اس کے مقابلے میں سال ۲۰۱۶ء میں ۲۴ء۵ ملین ٹن کی کھپت تھی جو بڑھ کر سال ۲۰۲۰ میں ۲۵ء۸ ملین ٹن پر آ گئی۔ اسی وجہ سے سال ۲۰۲۰ء میں پاکستان نے ۲ء۵ ملین ٹن سے زیادہ گندم درآمد کی۔

ہوں۔ اگر آپ بروقت خریداری کا اعلان کر دیں تو پھر کاشت کار معاشی اشارے وصول کرتا ہے اور اسے استعمال کرتا ہے لیکن آپ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہیں کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بار بار اس نوعیت کا بحران پیدا ہوتا ہے۔

(۲۱ جنوری ۲۰۰۴ء)

چینی کی خریداری کا معاہدہ

جناب والا! میرے پوائنٹ آف آرڈر کا تعلق چینی کی درآمد کے مسئلے کے متعلق ہے۔ آج کے "دی نیوز" کے مطابق ملک میں پانچ لاکھ ٹن چینی درآمد کی جانی ہے۔ اگرچہ اب تک اس کا معاہدہ نہیں ہوا ہے، البتہ جو ٹینڈر کھلے ہیں ان کے مطابق کم ترین ٹینڈر ۵۸۵ ڈالر فی ٹن ہے لیکن جو منظور کیا گیا ہے وہ ۸۴۹ ڈالر فی ٹن کا ہے لیکن اطلاع یہ ہے کہ دبئی میں خلیجی حکومت کا سرکاری شعبہ اور ہمارا سرکاری شعبہ، یہ دونوں ایک معاہدہ کو حتمی شکل دے رہے ہیں اور غالباً جو قیمت طے کی جارہی ہے وہ ۸۰۰ ڈالر فی ٹن ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تقریباً ڈیڑھ سو ڈالر فی ٹن جو کم ترین پیشکش تھی اس سے زیادہ کی قیمت طے کی جارہی ہے۔

جناب والا! اگر یہ معلومات درست ہیں تو پہلی بات تو یہ اصول ہے کہ جب آپ ٹینڈر کرتے ہیں تو فراہم کنندگان کی فہرست مختصر کر کے کرتے ہیں اور یہ کام کمپنی کی نتیجہ خیزی اور اس کی قابل اعتماد ہونے کی اہلیت کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ اس سے آپ ضمانت لیتے ہیں، مزید ضمانت آپ لیجیے لیکن جو کم ترین ٹینڈر رہے اس کو نظر انداز کر کے اونچی قیمت کے ٹینڈر اور وہ بھی خاص طور پر گورنمنٹ اداروں کے درمیان، یہ معمول کے طریقہ کار اور اصولوں کے منافی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر اس ملک کی خطیر رقم کا نقصان ہوگا دوسری جانب اگر آپ اونچی قیمت پر چینی درآمد کریں گے تو عوام کو بھی مہنگی قیمت پر دیں گے۔ یوں یہ بوجھ پوری قوم پر پڑے گا۔ (۱۸ فروری ۲۰۱۰ء)

ادویات کی قیمت، قلت اور معیار

جناب والا! یہ صورت حال افسوسناک ہے کہ حکومتی دعوؤں کے برعکس ادویات کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ قیمتوں میں اس اضافہ کے پیچھے قواعد وضوابط کا خاتمہ بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شاید کچھ عوامل بھی ہیں۔ حکومت نے جو دعوے کیے ہیں اور مارکیٹ سے جو اطلاعات ہمیں مل رہی ہیں ان دونوں میں مطابقت نہیں ہو رہی۔ حکومت کا دعویٰ یہ ہے کہ صرف چند چیزوں میں ۵ فیصد سے ۲۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ مارکیٹ یہ کہتی ہے کہ ۲۰ فیصدی نہیں کچھ چیزوں میں تو ۱۰۰ فیصدی، کچھ میں ۲۰۰ فیصدی اور چند چیزیں ایسی ہیں جن میں ۹۰۰ فیصدی اضافہ ہوا ہے اور یہ سارا ڈیٹا اخبارات کے اندر شائع ہوا ہے میں نے اپنی تحریک کے ساتھ بھی اخباری تراشہ لگایا ہے اور میرے پاس وہ ساری تفصیلات موجود بھی ہیں۔

دوسرا پہلو اس پورے معاملے کی ہینڈلنگ سے متعلق ہے۔ ہوا یہ ہے کہ پہلے ایک نوٹیفکیشن جاری ہوا، اس کو واپس لے لیا گیا اور پھر اس کے بعد ایک نیا نوٹیفکیشن آیا۔ لگتا ہے کہ کچھ خاص مفادات تھے جو معاملات کو چالاکی سے اپنے حق میں استعمال کر رہے تھے۔ بلاشبہ یہ بیک گراؤنڈ ہے اور آپ کے آنے سے پہلے ہوا ہے۔ لیکن یہ ساری چیزیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ نوٹیفکیشن کا آنا اور اس کا واپس لیا جانا اور پھر اس کا دوبارہ جاری ہونا یہ تمام چیزیں دستاویزی طور پر میرے پاس موجود ہیں۔ ان قیمتوں کے بڑھنے سے کم قیمت جعلی ادویات کا ایک دم سیلاب آگیا۔ اس کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ جس کے نتیجے کے طور پر جان بچانے والی بہت سی جعلی ادویات بھی مارکیٹ میں دستیاب ہیں اور یہ نقلی ادویات مسلسل پھیلائی جا رہی ہیں۔

اب شاید بعض مقامات پر چھاپے مارے گئے ہیں جو بذات خود پیچیدگیوں کا سبب بن رہے ہیں۔ چنانچہ کراچی، لاہور اور راولپنڈی سے بھی اور اس کے بعد پھر مختلف فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے لوگوں نے مجھے اصلاح احوال کے لیے آواز اٹھانے کے لیے اپروچ کیا ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس معاملہ سے پورے ملک کے لوگوں کی زندگی کا تعلق ہے ادویات کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اسے آسانی سے چھوڑ دیا جائے۔ پھر میں یہ بھی یاد دلاؤں گا کہ آج سے چند سال پہلے جب اسی قسم کی صورت حال تھی تو سینیٹ نے اس مرحلے پر ایک تحریک قبول کی تھی۔ اس پر بحث ہوئی اور اس کے بعد ایک خصوصی کمیٹی بنائی گئی تھی اس کمیٹی نے ڈیڑھ سال تک کام کر کے اپنی رپورٹ پیش کی تھی۔ یہ اتنا اہم مسئلہ ہے کہ اس سے پہلے بھی سینیٹ میں ایڈمٹ ہو چکا ہے اور اب پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ تازہ صورت حال کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے۔ ابتداً ہم مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ اس تحریک کو قبول فرمائیں تاکہ سینیٹ میں بحث ہو سکے پھر اگر بحث کے دوران ہم نے محسوس کیا کہ سابقہ کمیٹی کو بحال کرنا ہے یا نئی کمیٹی کا بنانا ضروری ہے تو پھر اس سلسلے میں تجاویز ہم بعد میں لائیں گے۔ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ وزیر صاحب کو ہماری اس تحریک کو قبول کرنا چاہیے اور سینیٹ کو موقع دینا چاہیے کہ وہ ڈرگ پالیسی یا جو نیا قانون آیا ہے، اور یا اس میں نوٹیفکیشن ہوئے ہیں اور مارکیٹ میں جو ردعمل ہوا ہے ان تمام کو سامنے رکھ کر کے اس پر تفصیلی غور کرے۔ (۵ ستمبر ۱۹۹۳ء)

ادویات کی قلت

جناب چیئرمین! اخباری اطلاعات کے مطابق ۸۰ فیصد ضروری ادویات عام مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔ گذشتہ کئی سالوں سے یہ ادویات سستے داموں دستیاب نہیں تھیں لیکن اب تو مارکیٹ سے غائب ہی کر دی گئی ہیں۔ یہ ایک اہم قومی مسئلہ ہے جس کا تعلق عوام کی صحت سے ہے۔

جناب والا! جہاں تک اس کے قابل بحث ہونے کا تعلق ہے اس سلسلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک نہیں متعدد اخبارات میں اور ادویات کی نشاندہی کے ساتھ یہ بات شائع ہوئی کہ یہ دوائیں مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہیں جس سے لوگوں کو شدید مشکل پیش آرہی ہے۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کچھ ادویات کی قیمتیں تو حکومت نے بڑھادی ہیں لیکن باقی قیمتیں بڑھانے کے لیے مارکیٹ میں غیر فطری طور پر یہ کمیابی پیدا کی جارہی ہے اور اس کے دونوں پہلو ہیں۔ یعنی دواؤں کا نہ ملنا اور پھر اس کے پیچھے غالباً یہ محرک کہ اس طرح اہم ادویات کی قیمتیں مزید بڑھ جائیں۔ جناب والا! یہ بات بھی آپ کے سامنے ہوگی کہ پچھلے دو تین سال میں دواؤں کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے کچھ ادویات کی قیمتوں میں تو یہ اضافہ ۱۵۰ فیصد اور ۲۰۰ فیصد تک ہے[1]۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات پر نگاہ رکھے کہ محض کھلی مارکیٹ کے نام پر ادویات جیسی اشیاء کی مصنوعی قلت یا قیمتوں میں کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہونا چاہیے۔

درحقیقت مسئلہ بہت اہم ہے اور اس کا تعلق افراد کی زندگیوں سے ہے۔ اگر بروقت دوا نہ ملے تو اس سے انسانوں کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ بیماری خود ایک ایسی چیز ہے جو قومی مسئلہ ہے اور اس کو ریلیف دینا مرکزی اور صوبائی حکومتوں، دونوں کی ذمہ داری ہے۔ حکومت کی جانب سے امر واقعہ سے انکار نہیں کیا گیا ہے کہ قیمتیں بڑھی ہیں، اس سے بھی انکار نہیں کیا گیا ہے کہ ڈرگ اسٹوروں پر ادویات نہیں مل رہی ہیں۔ یہ چیز مسلسل اخبارات اور ان رپورٹوں اور اداریوں میں بھی آرہی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قیمتوں میں اضافہ ایک مسلسل عمل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات درست نہیں ہے۔

---

[1] حالیہ سالوں میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ بڑھا ہے۔ ستمبر ۲۰۲۰ء میں ایک ہی حکم نامہ کے ذریعہ جان بچانے والی ۹۶ ادویات کی قیمتوں میں ۲۶۰ فیصد تک اضافہ کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ عمل ادویات کی قلت کے مسئلہ کو حل کر دے گا۔

دوسری جانب میں جس اہم بات کی نشاندہی کر رہا ہوں وہ ان ادویات کی کمیابی اور ان کا دستیاب نہ ہونا اور دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے جانوں کو خطرہ پیش آنا ہے۔ اور یہ کوئی مسلسل عمل نہیں بلکہ حالیہ واقعہ ہے۔ بلاشبہ یہ مسئلہ مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے کہ ڈرگ پالیسی پر عملدرآمد مرکز کے پاس ہے نفاذ چاہے صوبے کے پاس ہو لیکن اس کی نگرانی اور عملدرآمد کا جو کردار ہے اور پالیسی بنانے کا جو رول ہے یہ مرکز کی ذمہ داری ہے۔ خاص طور پر قومی اور غیر ملکی ادویات کی کمپنیوں سے جو ڈائریکٹ ربط اور اس کو کنٹرول کرنا ہے یہ مرکز کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر پہلو سے یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اسے بحث کے لیے قبول کیا جانا چاہیے اور اس کو حل کرنا چاہیے۔ ساتھ میں یہ بھی کہہ دوں کہ اس سے پہلے بھی اس ہاوس میں ادویات کی قیمتوں ان کے معیار اور ان کی دستیابی کا مسئلہ جب بھی زیر غور آیا ہے تو اس ایوان نے اس کو ہمیشہ مرکزی ذمہ داری سمجھا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا ایک کمیٹی بنی تھی سینیٹر جاوید جبار کی صدارت میں، میں بھی اس کا ممبر تھا۔ اس کمیٹی نے تمام معاملات کا تجزیہ کر کے ایک پالیسی دی تھی۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ادویات کی دستیابی، ان کی قیمتیں، ان کی کوالٹی یہ وہ مسائل ہیں جن سے ہمارا براہ راست تعلق ہے ہم نے ماضی میں اس پر بات کی ہے اور آج بھی کمیابی کی بناء پر یہ نیا مسئلہ پیدا ہوا ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔

جناب چیئرمین! ان چیزوں کا براہ راست تعلق حکومتی پالیسی سے ہے اس لیے کہ حکومت ہی دیکھتی ہے کہ کون سی دوائیں یہاں آنی چاہییں۔ اس پورے عمل کو ریگولیٹ کرتی ہے اور اس کو جانچتی ہے، اجازت دیتی ہے، کمپنیوں سے معاملہ کرتی ہے اور پھر یہ دیکھتی ہے کہ قیمتیں ان کی کیا ہونی چاہییں۔ یعنی بلاشبہ فری مارکیٹ کے ہم بھی قائل ہیں لیکن فری مارکیٹ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حکومت اس بات پر نگاہ نہ رکھے کہ ضرورت کی جو چیزیں ہیں وہ ملک میں آ رہی ہیں یا نہیں۔ (۱۱ جولائی ۱۹۹۵ء)

ناکارہ ادویات کا مسئلہ

جناب چیئر مین! ناکارہ اور جعلی ادویات کے حوالہ سے پہلی چیز یہ ہے کہ ۱۹۷۶ء کا جو قانون ہے[1] اس پر نظر ثانی کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ اس میں جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں اور تفتیش کا جو طریقہ کار ہے وہ بہت کمزور ہے۔ اس لیے میں پہلی سفارش یہ دوں گا کہ محترم وزیر صحت اس قانون پر نظر ثانی کریں اور اسے مؤثر بنائیں۔ دوسری جانب اس موقع پر یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ پہلی مرتبہ نہیں آرہا بلکہ سینیٹ میں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں جاوید جبار کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنی تھی، میں بھی اس کا ممبر تھا۔ ہم نے اس پورے مسئلے کا جائزہ لیا تھا، دواؤں کی صنعت کا دورہ کیا تھا اور رپورٹ حکومت کو پہنچائی تھی لیکن جیسا کہ ہمارے ملک کا قاعدہ ہے کہ ایسی تمام سفارشات کو یا تو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے یا وہ الماریوں میں پڑی رہتی ہیں۔ میں انہیں مشورہ دوں گا کہ اس رپورٹ کو بھی نکالیں اور یہ دیکھیں کہ اس میں کیا کیا تجاویز دی گئی تھیں۔

تیسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری دواؤں کی صنعت الحمد للہ ایک کامیاب اور ذمہ دار انڈسٹری ہے۔ ہم نے اس کا معائنہ کیا اور اس کو دیکھا تو ہمیں خوشی ہوئی کہ پیشہ وارانہ کام جو وہ کر رہے ہیں وہ قابل اعتماد اور قابل فخر ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ایک مافیا ہے، ایک زیر زمین صنعت جس کا کوئی تعلق ملک کی ادویات کی صنعت سے نہیں، ان کی فیکٹریاں ہیں، ان کے بھتے لگے ہوئے ہیں، ان کے ایجنٹ ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں ہیں لیکن ان پر گرفت نہیں کی جاتی۔ مسئلہ ادویات کی صنعت میں نہیں نگرانی اور پکڑ کے اس نظام میں ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ جو زیر زمین سرگرمی ہے اس پر مضبوط گرفت کی جائے۔

ایک اور چیز میں اس موقع پر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دراصل وزارت صحت (مرکز میں

---

[1] The Drug Act, 1976

بھی اور صوبوں میں بھی) کی ذمہ داری ہے کہ ڈرگ کو کنٹرول کریں، لائسنس دیں، نگرانی کروائیں، سزائیں دیں اور اس کے علاوہ دیگر متعلقہ امور کو بھی دیکھیں۔ مخدوم شہاب الدین کو یہاں لایا ہی اسی لیے گیا ہے کہ اس سے پہلے کے دور میں اس شعبے میں پتا نہیں کیا کیا گل کھلائے جا رہے تھے۔ مجھے توقع ہے کہ وہ اس معاملے میں ذمہ داری سے مؤثر اقدام کریں گے اور سب سے پہلے اپنے گھر کو ٹھیک کرنے کے اصول پر اپنی وزارت اور ڈرگ کنٹرول کا جو نظام ہے اسے درست کریں گے۔ بدقسمتی سے ہمارے ماہرین ادویات اور کیمسٹوں کا کردار بھی اس معاملے میں ٹھیک نہیں ہے۔ یہ نقلی ادویات انہی کی دکانوں کے ذریعے بکتی ہیں اور اس طرح لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ خطرناک کھیل کھیلا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈرگ انسپکٹر حضرات وقفہ وقفہ سے دورہ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اگر سب کچھ ہو رہا ہے تو اسے ملی بھگت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اس لیے جناب والا! اس بات کا اہتمام بھی کرنا پڑے گا کہ کیمسٹ ذمہ داری سے اپنا کام کریں اور جو کیمسٹ ذریعہ بن رہے ہیں نقلی ادویات کے عوام تک پہنچنے کا ان پر بھی اسی طرح بھرپور گرفت کی جائے جس طرح زیر زمین صنعت پر گرفت کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ان تینوں سطح پر یعنی مرکزی اور صوبائی نظام جہاں یہ بنائی جا رہی ہیں اور جہاں یہ بیچی جا رہی ہیں ان تینوں مقامات پر گرفت مضبوط کرنی ہو گی اور مثالی سزائیں دینا ہوں گی، اس کے بغیر معاملات درست نہیں ہو سکتے۔ (۶ اپریل ۲۰۱۰ء)

ٹرانسپورٹ، مائیگریشن اور ہاؤسنگ پالیسی

ٹرانسپورٹ پالیسی

جناب چیئرمین! پہلی بات یہ ہے کہ اس ملک میں ایک صحیح ٹرانسپورٹ پالیسی کی شدید کمی ہے۔ ٹرانسپورٹ پالیسی کسی ملک کی ترقی کے لیے نہایت ہی اہم عامل ہے اور دنیا میں کہیں بھی ہمہ گیر معاشی ترقی ٹرانسپورٹ کی ترقی کے بغیر نہیں ہوتی۔ آپ یہ خیال ہے کیجیے کہ برصغیر میں شیر شاہ سوری نے کس زمانے میں سڑکوں کا جال پھیلایا۔ برطانوی دور اقتدار میں شاہراہوں کو ترقی دی گئی لیکن اس دور میں اصل زور ریلوے پر رہا۔ اور یہ اس معاشی تعلق کی ریڑھ کی ہڈی تھی جو نو آبادیات اور حکمران ملک کے درمیان قائم ہوئی۔ یہی صورت حال آپ کو دنیا کے تمام ممالک میں نظر آتی ہے۔

جناب والا! ہمارے ملک میں ریل، روڈ ٹرانسپورٹ اور پھر شہری ٹرانسپورٹ یعنی پبلک ٹرانسپورٹ کے ساتھ بعض نجی کاریں اور دوسرے ذرائع آمدورفت موجود ہیں۔ یہ سب باہم مربوط چیزیں ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے حالات کو سامنے رکھ کر ان میں ترجیحات کے لیے حکمت عملی بنائی جائے۔ مثلاً تیل ہماری مجبوری ہے اور آج سے سات، آٹھ سال پہلے ہم اپنی ضروریات کا ۳۰ فیصد خود پیدا کر رہے تھے لیکن چونکہ اب مانگ بڑھ رہی ہے اور فراہمی نہیں بڑھی ہے تو یہ تناسب ۲۰ فیصد پر آگیا ہے۔ یہ رفتار اگر جاری رہتی ہے تو یہ تناسب اور نیچے جائے گا۔ جس کے نتیجے کے طور پر معیشت پر شدید دباؤ ہو گا۔ کیونکہ ایک طرف بین الاقوامی منڈیوں میں تیل کی قیمت بڑھ رہی ہے دوسری جانب آپ کی طلب بڑھ رہی ہے۔ جس رفتار سے آپ گاڑیاں بنا رہے ہیں اور بڑی اور پر تعیش گاڑیاں جن

میں خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے در آمد کر رہے ہیں یہ کسی طرح بھی متوازن رویہ نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک سے اگر آپ موازنہ کریں تو اس وقت امریکہ تک میں جو رجحان ہے وہ یہ ہے کہ کس طریقے سے بڑی گاڑی کے مقابلے میں چھوٹی گاڑی کی طرف آیا ہے۔

جناب والا! ہندوستان کی بڑی مثالیں آپ دیتے ہیں لیکن وہاں وزیر اعظم، صدر، وزراء اور اراکین پارلیمنٹ چھوٹی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اس سے ان کی کوئی عزت کم نہیں ہو جاتی اس لیے کہ عزت کا معیار گاڑی نہیں، عزت کا معیار آپ کا کردار اور آپ کی خدمات ہیں، جو بد قسمتی سے ہمارے یہاں ناپید ہے۔ یہاں ہم سمجھتے ہیں کہ عزت کے لیے ضروری ہے مرسڈیز اور بی ایم ڈبلیو کا ایک کارواں اپنے پیچھے لگوایا جائے۔ آپ نے اسی بجٹ میں دیکھا ہے کہ دو بلین روپے کی صرف مرسڈیز اور لگژری گاڑیاں ایک سال میں منگوائی گئی ہیں۔ درآمد کا مجموعی رجحان بھی یہ ہے کہ اس سال ڈیڑھ بلین ڈالر آپ نے کاروں کی درآمد پر خرچ کیا ہے۔ یہ سارے حالات سامنے رکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ صحت مند ٹرانسپورٹ پالیسی کی ضرورت ہے اور اس کا ایک اہم عنصر یہ ہونا چاہیے کہ لگژری گاڑیوں کی درآمد پر پابندی ہو۔ اگر پابندی نہیں لگاتے ہیں تو کم از کم اس کے اوپر نمایاں شرح سے ڈیوٹی عائد ہو۔

آپ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں آمدنی چاہیے، چنانچہ جب ہم کہتے ہیں کہ آپ چینی، چائے اور پٹرول جیسی عام ضرورت کی اشیاء پر محصولات کم کیجیے تو آپ دہائی دیتے ہیں کہ خزانے کا اتنا نقصان ہو رہا ہے۔ ہم آمدنی کو بڑھانے کے لیے راستے بتاتے ہیں تو آپ انھیں اختیار نہیں کرتے۔ ہم نے تجویز دی تھی کہ آپ صرف جائیداد کے ٹرانسفر پر ہی نہیں بلکہ اس کے ہر مرحلے کے اوپر ٹیکس لگائیے۔ ٹھیک ہے چھوٹے مکان اور زمین کو چھوڑ دیجیے لیکن یہ جو ایک اشرافیہ ہے اور جو دولت کی ایک قسم کی نمائش کر رہے ہیں ان پر ٹیکس ہونے چاہییں۔ ان کی وجہ سے سوسائٹی میں تقسیم بڑھ رہی ہے، ان پر ٹیکس لگائیے۔ اور اپنی شاہ خرچیوں کو ختم کیجیے۔ بہت سے معاملات میں جو کھلے اور ڈھکے اخراجات ہیں، انہیں

کنٹرول کیجیے۔ اس طرح کے راستے موجود ہیں، لیکن ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھارہے ہیں اس کے ذریعے آپ کو آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ملے گا۔ یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ یہ کسی بھی بین الاقوامی معاہدے کے خلاف ہے۔ ڈبلیو ٹی او میں یہ بات بطور اصول لکھی ہوئی ہے کہ تمام اشیائے تعیش پر آپ اضافی ڈیوٹی لگا سکتے ہیں اور دنیا کے بیشتر ممالک میں یہ ڈیوٹیاں لگی ہوئی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم یہ راستہ اختیار نہیں کرتے۔ اگر یہ راستہ اختیار نہیں کرتے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے سامنے دراصل خوشحال طبقات اور، نو دولتیوں کے مطالبات کو پورا کرنا ہے۔

جناب والا! ضروریات کا پورا کرنا ایک صحت مند معاشی نظام کی ضرورت ہے اور تعیش کے پیچھے پڑنا تباہی کا راستہ ہے۔ ہم نے تعیش کی کوشش کی ہے اور ضرورت سے ہم ہٹ رہے ہیں۔ جو حقیقی ضرورت ہے، وہ سستے ٹرانسپورٹ کی ہے۔ ریلوے ٹرانسپورٹ تیار کریں۔ آپ سڑکیں زیادہ بنائیں اور کاروں کی امپورٹ اور کاروں کے ذریعے سے ماحولیاتی آلودگی کے امکانات کو باقاعدہ کریں۔ تو یہ ایک معمولی سی تجویز ہے، لیکن اس کی حیثیت صحیح سمت میں پہلے قدم کی سی ہے، ایک پیغام کی ہے اور وہ پیغام یہ ہے کہ امراء تعاون کریں ملک کے عام شہریوں، غریبوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اور ملک میں دولت کی نمائش کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ شکنی کی جائے۔ اس کے مقابلے میں جو حقیقی ضروریات ہیں، ان کے پورا کرنے کو آسان بنایا جائے۔ (۱۲جون ۲۰۰۶ء)

شہروں کی طرف مائیگریشن اور ہاؤسنگ پالیسی

جناب چیئرمین! آج ہم ایک ایسے مسئلے پر غور کر رہے ہیں جس کا تعلق ملک کی غریب آبادی اور خصوصیت سے بڑے شہروں سے متعلق ہے۔ دوسری جانب یہ مسئلہ انسانی اعتبار سے اور امن وامان کے اعتبار سے بھی بڑا اہم بن گیا ہے۔ جناب چیئرمین! سر چھپانے کا حق ایک بنیادی حق ہے۔ اس بات کو پاکستان کی ریاست، پاکستان کی قوم اور دستور پاکستان کو

قبول کرنا چاہیے کہ ہر خاندان کا حق ہے کہ اسے سر چھپانے کے لیے مکان فراہم کیا جائے۔ جو لوگ از خود رہائش لے سکتے ہیں، ان کے لیے مواقع موجود ہوں اور جو نہیں لے سکتے، ان کے لیے اجتماعی تکافل کے نظام میں اس کا اہتمام کیا جائے۔

جناب چیئر مین! میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اسلامی فقہ میں ایک بڑی اہم چیز یہ ملتی ہے کہ جو شخص صاحب نصاب نہیں ہے وہ زکوٰۃ سے مدد لے سکتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص اپنے مکان کا مالک ہے تو یہ جائیداد اس کا حق ہے اور اگر جائیداد ہونے کے باوجود وہ ضرورت مند ہے تو وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مکان کی ملکیت استثنٰی ہے، یہ اس کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس کی ملکیت کی بناء پر اس کی امارت اور اس کی دولت کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس اہم اصول کی روشنی میں مکان کا حق میری نگاہ میں ایک بنیادی حق ہے اس کو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے اور پھر اس کے لیے دستوری تحفظ بھی ہو اور معاشی پالیسی بھی ایسی ہو کہ ہم شہریوں کے لیے اس کا اہتمام کر سکیں۔

جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں خاص کر کراچی میں کچی آبادیوں کا جو معاملہ ہے ۴۸-۱۹۴۷ء سے چل رہا ہے۔ بہت سی آبادیوں کو ریگولرائز بھی کیا گیا ہے لیکن مسئلہ ایک بار پھر پیدا ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ عالمی بینک کی ایک رپورٹ میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ کراچی میں تیس فیصد لوگ کسی نہ کسی شکل میں کچی آبادیوں میں رہ رہے ہیں جہاں بنیادی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ سڑکیں، پانی اور سیوریج نہ ہونے کی وجہ سے شہر ایسے خطرات میں گھر گیا ہے کہ جس سے صحت، صفائی، معاشی ترقی یہ سب متاثر ہو رہی ہیں۔ اس وقت ہم دو مسائل پر توجہ چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ غریب طبقات کو بحال کیا جائے۔ اس وقت مکان فراہم کرنے کی کوئی پالیسی موجود نہیں ہے۔ بڑے بڑے مینشن بن رہے ہیں جو اصراف کی علامت ہیں۔ اسی اصراف کا کھلے بندوں مظاہرہ شادیوں پر اور دیگر تقریبات میں کیا جا رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف ایک بڑی آبادی ایسی ہے کہ جس کے

پاس سر چھپانے کے لیے بھی جگہ نہیں ہے[1]۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ ایک ایک کمرے میں بارہ بارہ افراد رہتے ہیں اور وہ بھی کسی سہولت کے بغیر۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک جامع پالیسی درکار ہے۔ معاشی پالیسی، ہاؤسنگ پالیسی اور شہری ترقیاتی پالیسی ان سب کے مربوط تصور کے اندر آپ کو اس مسئلہ کو دیکھنا پڑے گا۔ دوسری جانب اس وقت جو حقیقی آبادیاں ہیں انہیں آپ کو ریگولرائز کرنا ہوگا۔ ریگولرائز کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کا انخلاء نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں نئی شہری منصوبہ بندی کے ذریعے انہیں رہنے کے لائق بنایا جائے اور اس معاملے میں ان کی قرار واقعی مدد کی جائے۔

جناب والا! اسی سے جڑا دوسرا پہلو لینڈ مافیا کا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کچی آبادیوں کو کچھ بااثر اور صاحب اقتدار لوگوں نے اپنے تصرف میں لانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس وقت جو کچھ اطلاعات ہمیں مل رہی ہیں، بالخصوص کراچی میں جس طرح آپریشن کیا جارہا ہے، یہ ظلم کی ایک شکل ہے۔ اس ظلم کے پیچھے کون لوگ ہیں، اس کا تعین کرنے کی ضرورت ہے۔ آپریشن روکنا چاہیے اور آگے جو بھی کام ہوں حق اور انصاف کے مطابق حالات کو دیکھ کر کیے جائیں۔ بلاشبہ میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ جب چاہیں ایک لہر آجائے اور جس کا جی چاہے کسی کی زمین پر قبضہ کرلے۔ یہ بیک وقت امن و امان اور حکمرانی کا مسئلہ ہے۔ لیکن دوسری جانب جو آبادیاں بن چکی ہیں ان کو اس طرح آپریشن کے ذریعے منتشر کرنا میں سمجھتا ہوں کہ سراسر ظلم ہے اس کو فوری رکنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ جہاں ایک صحیح معاشی پالیسی اور ہاؤسنگ پالیسی درکار ہے وہیں اس بات پر بھی تحقیق کی ضرورت ہے کہ جو شہر کاری اور ہجرت ہورہی ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔ ہجرت تاریخ کا ایک معروف عمل ہے لیکن وہ

---

[1] اس وقت کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۲ کروڑ کی آبادی کے ملک میں تقریباً ایک کروڑ لوگوں کے پاس کوئی مناسب گھر موجود نہیں ہے جبکہ ہر سال ۶ لاکھ نئے گھروں کی ضرورت پیش آرہی ہے۔

اس طرح ہو نا چاہیے کہ دونوں مقامات پر، جہاں سے لوگ منتقل ہو رہے ہیں اور جہاں جا رہے ہیں، وہاں مشکلات پیدا نہ کریں۔ مربوط ترقیاتی قواعد ہماری بہت بڑی ضرورت ہیں۔ اگر ہم نے اس کو نظر انداز کیا یا جیسے بے ڈھب انداز میں اسے کیا جا رہا ہے تو یہ نئے اور پیچیدہ تر مسائل کا سبب بنے گا۔ جناب والا! آبادی کی منتقلی کا ایک سبب ہماری ناقص زرعی پالیسی ہے۔ زراعت جو ہماری جی ڈی پی کا تقریباً تیس فیصد حصہ ہے اور ایک بڑی آبادی کا اس پر انحصار اس کے لیے ہمارے پاس آج تک کوئی مربوط پالیسی نہیں ہے جس کی بناء پر زراعت بڑھے، زرعی بنیادوں پر صنعتیں قائم ہوں اور گھریلو صنعتیں بڑھیں۔ کھیت سے منڈی تک سڑکیں بنائی جائیں اور وہاں لوگوں کو ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں کہ وہ نقل مکانی نہ کریں اور اس طرح ہماری جو دیہی ثقافت ہے وہ بھی آگے بڑھے، اس کا معیار بلند ہو اور وہ پورے ملک کے ساتھ جڑ جائے۔ دوسری طرف جو صنعتی علاقے ہیں وہاں قدرتی طور پر ہجرت ہو گی لیکن قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ صنعت کے ساتھ ساتھ یہ اس منصوبے کا حصہ ہو کہ وہاں مزدوروں کے رہنے اور ان کے بچوں کی تعلیم اور صحت کے لیے بروقت انتظام کیا جائے۔ ہو یہ رہا ہے کہ تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے انڈسٹری قائم ہوتی ہے اور اس کے بعد کچی آبادیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ اس تناظر میں معاشی اصولوں پر مبنی ایک پالیسی کی ضرورت ہے۔ جب تک آپ اس طرف توجہ نہیں دیتے اصل مسئلے کے جو اسباب ہیں ان کو حل نہیں کر سکیں گے اور جیسا کہ ہو رہا ہے ہم ایک بحران کے بعد دوسرے بحران کا سامنا کریں گے اور کبھی بھی اس مشکل سے نہیں نکل سکتے۔

(۲۹مارچ ۲۰۱۰ء)

اشاریہ

آ

آبادکار,۶۹

آبی توانائی,۸۹

آبی گزر گاہوں کا مسئلہ,۲۴۴

آٹے کی قلت,۲۴۸

آزاد ماہرین معیشت,۱۲۶,۱۶۰,۱۶۱

آزادی,V,۸,۳۹,۱۰۳,۱۲۰,۱۳۵,۱۵۲,۱۵۷,۲۴۴

آسٹریا,۱۳۷

آسٹریلیا,۲۴۵

آصف علی زرداری (صدر) پیپلز پارٹی کے چیئرمین,۳۱

آغاخان فاؤنڈیشن,۱۳۷

آکسفورڈ یورسٹی,۸۸

آمریت,۶

آندھرا پردیش,۲۱۵

آئی ایل او,۱۹

آئی ایم ایف,۴,۹,۱۱,۲۰,۲۳,۲۶,۲۸,۳۲,۳۳,۳۴, ۳۸, ۳۹, ۴۳, ۱۱۹, ۱۳۴, ۱۷۹, ۱۸۱, ۱۸۲, ۱۸۸, ۱۸۹,۱۹۸,۲۰۰,۲۰۱,۲۲۶

آئینی ترمیم ۱۸ویں,۹۱,۱۹۵,۲۰۴,۲۴۱

آئی ٹی کی مصنوعات,۱۳۰

ا

اتصالات,۱۰۲

اٹامک انرجی کمیشن,۸۵

اٹلی,۱۳۷

اجتماعی تکافل,۲۶۰

اجرت وضروریات کمیٹی,۱۳۸ / اجرتی آمدنی پالیسی,۲۱۶

احتساب,۶,۱۸,۲۹,۳۱,۳۶,۸۶,۱۰۷,۱۱۰,۱۲۸,۱۶۶, ۲۰۹,۲۲۷,۲۴۴

اختیارات کی منتقلی کا عمل,۵۹

ادائیگیوں کا توازن,۱۳,۶۵,۶۶,۸۱,۱۵۳,۱۵۴,۱۵۸, ۱۸۰,۲۰۲

ادویات کی قلت,۲۰۸,۲۵۲,۲۵۳ / ادویات کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ,۲۵۱

ارجنٹائن,۲۱۸

استحصالی معیشت کی علامت,۵۱

استحکامی فنڈ,۵۴

استعماری گرفت,VI / استعماری نظام کے شکنجے,V

اسٹاک ایکسچینج,۵۲,۷۰,۷۸,۱۶۶,۱۷۵

اسٹیٹ بینک,۲۲,۲۳,۳۳,۵۲,۸۰,۹۷,۹۹,۱۳۶,۱۵۴, ۱۵۸, ۱۸۰, ۲۲۸ / اسٹیٹ بینک کا گورنر, ۲۳ / اسٹیٹ بینک کی خودمختاری,۲۲

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ,۱۱

اسرائیل,۱۰۶,۲۳۹

اسلام,VI,۹,۲۱,۲۹,۱۲۹,۱۳۵,۱۳۶,۱۳۷,۲۱۸,۲۲۵, ۲۴۳

اسلام آباد,۹,۱۲۹

اسلام کا معاشی نظام,۱۳۶ / اسلامک بینکنگ,۱۳۶

اسلامی فقہ,۲۶۰ / اسلامی قدروں کی بیخ کنی,۲۸

اسلامی معاشرہ,۵۲

اسلامی معیشت,۱۳۶

اشتراکی نظام,۱۹

اشرافیہ کی معیشت,۸۰,۱۲۲,۱۲۳ / اعلیٰ اشرافیہ کلچر, ۲۰۰

اشیائے تعیش,۲۵۹

اشیائے صرف کی پیداوار,۵۱

اعداد وشمار کی اہمیت,VIII / اعداد وشمار کی صحت,۱۲۶ /
اعداد وشمار کا دھوکہ,۱۴۸
افتخار اللہ بابر,۱۴۳
افراط زر,۱۶,۱۷,۲۲,۲۸,۳۲,۳۳,۴۱,۴۲,۴۳,۴۴,
۶۵,۶۶,۷۶,۹۸,۹۹,۱۲۰,۱۵۱,۱۵۸,۱۵۹,۱۸۰,
۱۸۸,۲۰۲,۲۰۳,۲۱۴,۲۱۵,۲۱۷,۲۲۵
افریقہ,۹
افغانستان,۱۵۹
اقتصادی پیکیج ایک تباہ کن ایجنڈا, ۲۷/اقتصادی
صورتحال کا جائزہ, ۸۷/اقتصادی آزادی, ۱۱/
اقتصادی بادشاہت, ۱۲۹/اقتصادی بحالی, ۱۹۷/
اقتصادی بحران, ۱۵۸/اقتصادی پالیسی, ۱۳۹,
۱۶۰/اقتصادی پالیسی کے ماڈل, ۱۳۹/اقتصادی
ترقیاتی ڈھانچہ, ۱۳۳/اقتصادی ثمرات, ۱۳۹/
اقتصادی جائزہ, ۹۵,۱۰۷,۱۳۸,۱۹۸,۱۹۹,۲۲۹/
اقتصادی رابطہ کمیٹی,۲۴۸/اقتصادی سروے,۱۳,
۹۵,۹۷,۱۹۷, ۲۴۶/اقتصادی فیصلہ سازی, ۱۱/
اقتصادی مسائل کی سیاسی وجوہات,۱۶۱/اقتصادی
منصوبہ بندی کی اپروچ,IX
اقوام متحدہ,۱۹۰,۲۴۶
الہامی ہدایت,V,VI
امریکہ,۱۰,۱۲,۱۵,۱۸,۲۲,۲۹,۳۴,۳۸,۳۹,۴۱,۴۶,
۴۷,۵۰,۷۴,۷۸,۱۰۲,۱۰۶,۱۰۸,۱۱۱,۱۲۵,۱۲۸,
۱۵۳,۱۸۷,۱۸۸,۱۹۸,۱۹۹,۲۱۵,۲۲۶,۲۵۸
امریکہ کا سنٹرل بینک,۲۲/امریکی بینک,۷۸
امریکہ کی ٹیکسٹائل انڈسٹری,۱۰
امریکی پارلیمنٹ,۱۱۱/امریکی سفیر,۱۱
امن وامان کا مسئلہ,۴۴
انتخابات(۱۹۷۰ء),۶۴
اندرون ملک بے گھر افراد,۱۸۴
انڈر انوائسنگ,۲۰۳
انڈونیشیا,۲۱۵
انرجی پالیسی,۴۷
انسانیت کا ارتقا,V
انسانی وسائل کی ترقی,۷۷,۲۰۱
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز,VI,X
انگلستان,۱۵,۷۹,۱۰۲,۱۳۸
اوبامہ، بارک(Barack Obama)امریکی صدر,۴۶
اوگرا(OGRA),۲۱۳
اے بی این ایمرو بینک,۱۳۱
اے جی پی آر,۱۰۶
ایبٹ آباد,۱۷۶
ایٹمی تجربات(۱۹۹۸ء),۹۳/ایٹمی دفاعی صلاحیت,۲۸
ایڈہاک ازم کا مسئلہ,۱۹۶
ایران,۲۳۹,۲۴۰,۲۴۱
ایس ایم ای(SME) چھوٹے اور درمیانے درجے کے
کاروبار,۳۷,۱۰۰,۱۵۳
ایشیائی ترقیاتی بینک,۴۲,۶۸,۱۰۱,۱۸۱
ایف بی آر(FBR),۲۰,۱۸۲,۲۰۳,۲۰۵
ایف اے او(FAO),۲۴۶
ایف سولہ(F-16)جہاز,۱۰۶,۱۰۷
ایکسائز ڈیوٹی,۳۶,۵۶,۵۷,۵۸,۲۲۶
ایم ایم اے(متحدہ مجلس عمل),۱۴۰,۱۴۲
این ایف سی,۱۷۱
این ڈبلیو پیٹرسن(سفیر) Ambassador Anne.
W. Patterson,۴۷
ایوان صدر کی تزئین,۱۸۴
ایئر فورس کا بجٹ,۱۱۲

ب

بادشاہت,۶,۷,۱۲۹
باضابطہ(Regulated)معیشت,۱۵۲

بالواسطہ ٹیکس,۲۰,۵۵,۵۶,۶۹,۱۶۶,۱۷۳,۲۰۳
بائیوگیس,۲۴۰,۲۴۲
بجٹ ایک پالیسی دستاویز,۹۲/بجٹ بنانے کا عمل,۸۳,۱۷۰/بجٹ خسارہ,۳۲,۳۳,۹۸,۱۵۸,۲۱۴/بجٹ سازی کا طریقہ کار,۸۷,۱۳۷/بجٹ سازی میں پارلیمنٹ کا کردار,۸۳,۱۴۲/بجٹ کا آئی ایم ایف ماڈل,۱۷۹/بجٹ کا فلاحی پہلو,۱۲۱/بجٹ کمیٹی,۱۳۸/بجٹ کی پیشکش کا طریقہ کار,۱۴۵/بجٹ کے اوپر پارلیمنٹ کا کنٹرول,۱۷۸/بجٹ کی ترقیاتی حکمت عملی,۱۶۸/بجٹ کے ماڈلز,۸۴
بجلی چوری,۲۳۶/بجلی کی پیداواری صلاحیت,۲۳۵/بجلی کی پیداواری لاگت,۲۳۴/بجلی کی ترسیل کے نظام کی صلاحیت,۲۳۵/بجلی کی قیمتوں میں اضافہ,۲۰۸,۲۳۳,۲۳۵
بچت کی شرح,۳۳,۹۹,۱۷۵
بحریہ کا کل بجٹ,۱۱۲
برآمدات کا ہدف,۶۶
برازیل,۱۳۷
برطانوی امپائر,۸۴/برطانوی دور اقتدار,۲۵۷/برطانوی دور کے ایکٹ ۱۹۳۵ء,۱۲۸
برطانیہ,۳۴,۳۵,۶۰,۸۴,۱۲۹,۲۲۳
برطانیہ میں ٹیکس دہندگان کی تعداد,۱۲۹
برقی ذرائع ابلاغ,۱۶۸
برما,۱۲۵
بش، جارج ڈبلیو(George W. Bush) امریکی صدر,۴۶,۱۲۸
بلا اجرت خاندانی ملازم,۱۵۱
بلوچستان,۶۷,۹۰,۹۱,۱۷۲,۲۴۳,۲۴۴,۲۴۵,۲۴۸
بلوچستان کی ترقی,۱۷۲/بلوچستان میں کاریز,۲۴۴
بنگلہ دیش,۶۰,۱۲۷,۱۵۹
بنیادی مالیاتی اختیار,۵۹
بورڈ آف ریونیو,۱۸۱
بے روزگاری,۱۰,۱۹,۷۹,۹۶,۱۲۵,۱۲۷,۱۹۷,۱۹۸,۲۲۵
بے نظیر (بھٹو),۱۲,۲۷,۴۵,۱۶۳,۱۸۴
بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام,۴۵,۱۸۴
بیت المال,۷۶
بیٹ مین کلچر,۱۲۹
بیروزگاری,۲۴,۴۴,۹۶,۱۲۵,۱۲۶,۱۲۷,۱۴۸
بیرونی اکاؤنٹس میں پاکستانی سرمایہ,۳۸
بیرونی امداد,۱۲,۱۴,۴۹
بیرونی ترسیلات زر,۷۳,۱۰۱,۱۵۳,۱۵۷/بیرونی ترسیلات زر کے لیے جامع پالیسی,۱۰۱
بیرونی سرمایہ کاری,۷۱,۲۰۱
بیرونی قرضے,۱۰,۴۴,۴۵,۸۶,۱۳۴,۱۳۵,۱۵۸,۱۸۳
بیرونی مفادات کا تحفظ,۱۵۴
بیلجیم,۱۳۷
بیمہ کمپنیاں,۳۵
بین الاقوامی آزاد ماہرین معیشت,۱۴۹
بین الاقوامی مارکیٹ,۱۳,۱۴,۲۱۲,۲۲۶/بین الاقوامی مافیا,۳۶
بین الاقوامی معاشی معاہدے,۱۷۰
بین الاقوامی کارپوریشن,۱۳۱/بین الاقوامی ساہو کار,۹/بین الاقوامی منڈیاں,۵۱,۲۵۷
بین الاقوامی امدادی ادارے (International donor agencies),۴۸
بینک آف انگلینڈ,۲۲
بینک کے کھاتوں کی تفصیل,۵۲/بینکاری کا پھیلاؤ,۱۷۴
بینکنگ کا منفی کردار,۱۵۳
بھارت (انڈیا),۳۳,۳۶,۶۰,۱۰۲,۱۰۷,۱۲۴,۱۲۸,۱۵۳,۲۱۵,۲۳۹,۲۴۵/روشن انڈیا,۱۲۸/بھارت کے سرمایہ دار,۱۰۲/بھارت کی شرح بچت,۳۳/بھارت

میں سیلز ٹیکس کی پالیسی, ۶۰/ بھارتی مال, ۴۷/
ہندوستان, ۲۸, ۵۳, ۵۳, ۷۵, ۱۰۸, ۱۲۸, ۱۳۸, ۱۵۹,
۱۸۷, ۲۱۵, ۲۵۸/ ہندوستان کی بالادستی, ۲۸
بھٹو (ذوالفقار علی), ۵۰
بھوٹان, ۱۵۹

پ

پارلیمانی کمیٹی, ۱۰۶
پارلیمنٹ کا استحقاق, ۷
پارلیمنٹ کا کام قانون سازی, ۲۵
پارلیمنٹ کا کردار, ۱, ۸۳, ۸۴, ۱۰۵, ۱۴۲
پاک امریکہ تعاون, VI
پاکستان ادارہ برائے شماریات, ۱۲۵
پاکستان اسٹیٹ آئل, ۲۲۳, ۲۲۴
پاکستان اکنامک سروے, ۶۷, ۹۴
پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیویلپمنٹ اکنامکس, ۱۴۹
پاکستان ایک اسلامی ملک, ۲۱۸
پاکستان آبزرور, ۱۲۶
پاکستان کے اثاثے, ۹۷
پاکستان کی تیل کی کھپت, ۳۶
پاکستان کی سیاسی و معاشی تاریخ, X
پاکستان کی گروتھ, VII
پاکستانی معیشت, VII, VIII
پاکستان کی نظریاتی اساس, VI
پاکستان کا ٹیکس سسٹم, ۱۲۹
پاکستان کے نگران وزیر اعظم, ۳
پاکستان میں بجلی کے نئے منصوبے, ۲۳۶
پاکستان میں غربت, ۴۵
پاکستانی پاسپورٹ, ۴
پاکستانی سیاست, ۳, ۱۰۵
پانی کا بحران, ۲۴۴
پبلک اکاؤنٹس کمیٹی, ۸۸, ۱۰۶, ۱۱۵, ۱۷۰
پبلک ٹرانسپورٹ, ۱۵۲, ۲۵۷
پٹرولیم ترقیاتی فنڈ, ۲۲۸/ پٹرولیم سرچارج, ۲۲۹
پٹرول کی قیمت, ۱۸۵, ۲۰۹, ۲۲۵, ۲۲۸/ پٹرول کی قیمت کے تعین کا طریقہ کار, ۲۲۸/ پٹرولیم لیوی, ۴۳/ پٹرولیم مصنوعات, ۵۴, ۱۶, ۲۳۰
پرائیوٹائزیشن, ۹۷, ۱۰۱
پلاننگ کمیشن, ۶۷, ۹۴, ۱۰۱
پنجاب, ۵۰, ۶۷, ۱۶۳, ۲۱۵, ۲۴۵, ۲۴۷
پولیس کی رہائش گاہیں, ۱۸۴
پی ایس ڈی پی, ۱۶۵, ۱۸۴, ۱۸۱/ مرکزی PSDP کا بجٹ, ۴۴
پی آئی یو (PIU) Produce Index Unit, ۲۱
پیپلز پارٹی, ۳۱, ۱۲۰
پی ٹی سی ایل, ۹۷, ۱۰۲
پیداواری شعبہ, ۳۲, ۵۲, ۷۲
پیداواری لاگت, ۷, ۱۵, ۱۷, ۳۱, ۴۳, ۱۳۰, ۲۱۴, ۲۲۵, ۲۳۳, ۲۳۴, ۲۳۷
پی سی (ہوٹل), ۱۴۸
پیشہ ور معیشت دان, ۱۵۱, ۱۹۴, ۱۹۵, ۱۹۶
پیلی ٹیکسی, ۱۴

ت

تاج برطانیہ, ۸۴
تجارت اور ادائیگیوں میں عدم توازن, ۳۲
تجارتی بینک, ۱۸۷
تجارتی پالیسی, ۱۵۳/ تجارتی توازن, ۴۳, ۱۵۸/ تجارتی خسارہ, ۳۷, ۳۸, ۶۵, ۶۶, ۱۵۳, ۱۸۰/ تجارتی خسارے کا ہدف, ۶۶
تحلیل کنندہ, ۱۱
تخفیف آبادی و غربت پروگرام, ۱۰۷
ترسیل کے دوران بجلی کے ضیاع, ۲۳۶

ترقی پذیر ٹیکس, ۵۹/ترقی فریم ورک دستاویز, ۱۰۱/ ترقیاتی اہداف,۲۰۱/ترقیاتی بجٹ,۴۴,۱۲۲,۱۲۷, ۲۰۲/ترقیاتی منصوبوں کی صورت حال,۱۶۵
ترقی یافتہ ممالک,۱۶۶
ترکی,۴,۷,۱۰۶
تعلیم کے بجٹ,۱۷۷
تعمیراتی صنعت,۹۶
تقسیم دولت کا مسئلہ,۶۹
تہذیبوں کے تصادم,۱۱۱
توانائی پالیسی, ۴۷, ۲۲۱, ۲۳۸, ۲۳۹/توانائی کا بحران, ۲۰۱/توانائی کی قائمہ کمیٹی, ۲۲۳/توانائی کے گردشی قرضے,۲۶/توانائی و آبی وسائل,۱۶۹/تھر کے کوئلے,۲۳۹
تیسری دنیا کے ممالک,۳۴,۱۶۶
تیل کی پالیسی,۲۲۱,۲۲۳,۲۲۴/تیل کی قیمتیں,۴۳, ۵۳,۲۱۲,۲۲۱,۲۲۳/تیل کی مصنوعات,۲۳۳
تھائی لینڈ,۱۲۵
تھر ڈورلڈ,۲۰

ٹ

ٹاکسٹی(Toxicity), ۱۸۵
ٹرانسپورٹ پالیسی,۱۵۲,۲۵۷,۲۵۸
ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل,۷۷,۱۲۹,۱۸۷,۲۰۳
ٹریڈنگ کارپوریشن,۲۱۲
ٹیکس اصلاحات کی ضرورت, ۱۲۹/ ٹیکس پالیسی, ۱۶۶/ ٹیکس دہندگان کی کل تعداد, ۱۲۹/ ٹیکس کا ڈھانچہ, ۵۱,۵۲/ ٹیکس کا نظام,۱۶۶/ ٹیکس گیپ,۱۸۱,۱۸۲
ٹیکسوں کا نظام,۵۱,۲۰۲
ٹیکسٹائل انڈسٹری,۷۱
ٹیکسٹائل اور دیگر برآمدی صنعتیں,۷۱
ٹیکنالوجی ٹرانسفر,۱۰۶
ٹیکنالوجیکل برتری,۱۱۲

ث

ثمرات کی نچلی سطح پر بتدریج منتقلی,۱۳۹

ج

جاپان,۱۵,۱۳۷,۱۶۴,۱۸۷,۲۱۵
جاپان کے ماڈل,۱۶۴
جائیداد پر ٹیکس,۱۷۶/ جائیداد کا کاروبار,۵۲
جہاز F-18,۱۰۷
جراحی کے آلات کی صنعت,۷۲
جرمنی,۱۵,۲۲,۳۵
جعلی ادویات,۲۵۱,۲۵۵
جمہوریت,۴,۵,۶,۸۳,۱۰۷,۱۰۸
جنرل پرویز مشرف,۳۱,۸۵,۱۸۳,۱۹۳,۱۹۹,۲۳۸
جنوبی ایشیاء,۶۱
جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا سربراہ,۱۰۸
جوزف اسٹگلٹز(Joseph Stiglitz) چیف اکنامسٹ, ۱۲۰,۱۵۱
جوہری توانائی کمیشن,۸۸
جی ایٹ,۲۱۸
جی ڈی پی,۱۹,۳۳,۶۶,۷۰,۷۳,۷۷,۹۳,۹۴,۹۶,۹۹,۱۲۱, ۱۲۵,۱۲۷,۱۵۸,۱۷۷,۱۷۸,۱۸۸,۱۹۸,۲۰۱,۲۶۲

چ

چین,۱۵,۳۳,۶۰,۹۹,۱۲۵,۲۱۳,۲۱۵,۲۳۹,۲۴۶
چینی کی درآمد, ۲۵۰/ چینی کی قیمتیں, ۲۱۰/ چینی کی کھپت کے اعدادوشمار,۲۱۲
چھوٹے ڈیم,۲۴۵
چھوٹی صنعتوں کے لیے سازگار ماحول,۱۲۳

ح

حبیب بینک,۷۸

حضرتِ آدم علیہ السلام,V

حضرت عثمانؓ,۲۴۳

حضرت عمر فاروقؓ,۱۶۴

حضرت محمد ﷺ (آخری پیغمبر),V

حفاظتی والو,۲۳۱

حقیقی اجرت اور تنخواہ کا موازنہ,۲۱۳

حقیقی اجرت میں کمی,۹۶,۲۱۳

حکومت بلوچستان,۲۴۵

حکومت پنجاب,۲۴۵

حکومت کی مالیاتی پالیسی,۴۳

حیوانی مصنوعات,۱۴۸

خ

خالد رحمٰن,VI, X

خرد مالیات,۱۲۳/ خرد مالیاتی استحصال,۱۲۳

خریف ۲۰۱۹ء,۲۴۶

خفیہ اخراجات,۱۲۸

خلیجی حکومت,۲۵۰/ خلیجی ملک,۱۰۲

خود انحصاری,۱۱,۱۲,۲۴,۳۷,۴۹,۷۸,۱۰۳,۱۳۴,۱۳۵,۱۳,
۱۶۸,۱۷۳,۱۹۹,۲۰۳,۲۲۱/ خود انحصاری کمیٹی,۱۱,
۲۴/ خود انحصار معیشت,۱۳۴

خود تشخیص,۱۸۰

خودکشی,۶۴,۷۰,۲۱۴

خوراک کی عالمی منڈی,۱۸۶

خوشحال پاکستان پروگرام,۴۳

خوشحالی بینک,۲۱۸

خیبر پختونخوا,۸۹,۱۲۹,۲۴۲

د

داخلی پالیسی کی ناکامی,۱۶۱

دبئی,۲۵۰

درآمدی ڈیوٹی,۷۶,۱۷۶,۱۸۰

دستور کی روح,۱۰۸,۱۴۶

دستور کی مشترکہ فہرست,۹۱,۱۹۵

دستوری ادارے,۶,۱۰۸

دستوری اصلاحات کمیٹی,۱۱۴

دفاعی اہمیت کے ادارے,۳۵/ دفاعی بجٹ,۸۵,۱۰۶,
۱۱۰,۱۱۲,۱۱۳,۱۱۵,۱۲۸/ دفاعی پیداوار,۸۵

دوایوانی نظام,۱۳۸

دواؤں کی صنعت,۲۵۵

دوسری عالمی جنگ,۱۱۱

دہشت گردی کے خلاف جنگ,VI,۴۵,۴۹,۱۹۹

دہلی کا پورا ٹرانسپورٹ سسٹم,۱۸۵

دولت کی تقسیم,۵۰,۶۹,۱۲۷,۱۳۲,۲۰۱

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم میں اضافہ,۱۲۰

دولت کی نامساویانہ تقسیم,۱۳۹

دی نیوز (The News),۲۵۰

دیت,۲۲۶

ڈ

ڈان (Dawn),۷۷,۲۱۰

ڈبلیو ٹی او,۱۳۱,۱۵۳,۲۱۸,۲۵۹

ڈرگ انسپکٹر,۲۵۶

ڈرگ پالیسی,۲۵۲,۲۵۴

ڈنمارک,۱۳۷

ڈیرہ بگٹی,۹۲

ڈیزل کی قیمتیں,۲۲۵

ڈیفنس اخراجات,۸۸

ڈیفنس ڈویژن کا خرچہ,۸۵
ڈیفنس سوسائیٹیز,۱۰۷
ڈیوچے بنڈیز بنکDeutsche Bundesbank,۲۲

ذ

ذخیرہ اندوزی,۱۵۳

ر

رینجرز,۸۶
راہداری,۴۶
ربیع۲۰۱۹-۲۰ء,۲۴۶
رضا باقر (گورنر اسٹیٹ بینک),۲۳
روپے کی قدر میں کمی,۱۳,۱۴,۱۵,۱۶,۱۷,۲۷,۱۸۸
روزگار کی فراہمی,۴۴,۱۲۴/ روزگار کی تعریف,۱۲۶,۱۵۰
رونلڈ ریگن (سابق امریکی صدر),۱۸
ریاستی پالیسی کے رہنما اصول,۱۳۶
ریفرنڈم,۶۴
ریلوے ٹرانسپورٹ,۲۵۹

ز

زرتلافی,۱۰,۱۶,۲۸,۵۴,۶۹,۷۵,۷۶,۱۸۸,۲۰۲,۲۱۴,
۲۱۵
زرمبادلہ کے ذخائر,۱۳
زراعت پر توجہ,۹۸,۱۲۱/ زراعت سے متعلق امور,۱۶۲/
زراعت کی ترقی,۱۹/ زراعت کی حقیقی ضروریات,
۱۹/ زراعتی و صنعتی آلات,۳۳,۲۱۵/ زرعی صنعت,
۱۷/ زرعی استعمال کی اشیاء,۱۹,۶۸,۱۵۴
زرعی آمدنی,۲۰,۲۲/ زرعی آمدنی پر ٹیکس,۲۲/ زرعی
پالیسی,۱۶۳,۲۱۵,۲۶۲/ زرعی پیداوار,۲۱,۳۲,
۶۷,۱۴۹,۱۶۳,۲۱۵,۲۴۶/ زرعی قرضے,۱۶۳,
۱۷۴,۱۸۶
زرعی ترقیاتی بینک,۱۷۴
زرمبادلہ کی صورت حال,۲۷
زکوٰۃ,۲۱,۱۳۶,۱۳۷,۱۶۴,۲۶۰/ زکوٰۃ اور ٹیکس کا نظام,
۲۱/ زکوٰۃ فنڈ,۱۳۷/ زکوٰۃ کا نفاذ,۱۳۶/ زکوٰۃ کا
نظام,۱۶۴
زلزلہ (اکتوبر ۲۰۰۵ء),۲۱۷
زیرزمین پانی,۲۴۵

س

ساختی اصلاح,۲۱۴
سالانہ معاشی جائزہ,۱۵۸
سپریم کورٹ,۴۳,۱۶۱,۱۸۵,۲۳۰
سپلیمنٹری گرانٹس کا مسئلہ,۱۴۶
سٹاک ایکسچینج,۳۷,۱۲۳
سٹیٹ بینک,۹,۲۳,۳۹,۱۰۰,۱۲۲,۱۷۴
سرکاری ٹرانسپورٹ پالیسی,۱۵۲
سرمایہ دارانہ ماڈل,۱۷۳/ سرمایہ دارانہ منڈیاں,۳۴/
سرمایہ دارانہ نظام,۱۹,۳۵,۵۰,۱۲۲
سرمایہ کاری کا ماحول,۱۸۷/ سرمایہ کاری کی شرح,۹۹,
۲۰۲
سری لنکا,۱۵۹
سعودی عرب,۱۶۷,۲۲۱,۲۴۶
سلامتی کونسل,۱۰۸,۱۰۹
سلامتی کے معاملات,۱۱۳
سماجی تحفظ,۱۷۳
سماجی انتشار,۱۲۰,۲۱۴/ سماجی انتشار کی اخلاقی وجوہ,۲۱۴
سماجی بہبود کا وفاقی بجٹ,۲۱۶
سماجی بہبود/ زکوٰۃ,۲۱۶
سماجی شعبہ,۱۲۷,۱۸۴,۲۰۱
سمال انڈسٹری,۱۲۳,۱۲۴

سمیڈا SMEDA,۱۰۰,۱۲۴

سندھ,۵۰,۷۶,۹۰,۹۲,۱۶۳,۱۶۵,۱۹۳,۲۴۵,۲۴۷, ۲۴۸,۲۴۹/ سندھ کی حکومت,۹۰

سنگاپور,۱۲۵

سود,۹,۱۰,۱۵,۳۸,۳۹,۵۳,۷۲,۱۲۳,۱۳۰,۱۳۴,۱۳۵, ۱۳۶,۱۳۷,۱۴۱,۱۵۸,۱۷۳,۱۸۳,۱۸۷,۱۹۸,۲۰۲

سود کا خاتمہ,۱۳۶

سود کی بنیاد پر قرض,۱۳۵

سوشل ایکشن پلان,۱۸

سول ملٹری تعلقات,۱۰۵

سی این جی,۱۸۵

سی ڈی اے,۱۸۴

سیاسی غلامی,۲۸

سیرینا,۱۴۸

سیکولر معاشرہ,۲۱۴

سیلز ٹیکس,۳۶,۵۶,۵۷,۵۸,۵۹,۶۰,۶۱,۶۲,۷۶,۱۳۰, ۱۷۶,۱۸۲,۲۰۳,۲۰۵,۲۲۶,۲۲۸

سیلز ٹیکس کی شرح,۵۹,۶۱,۶۲

سینیٹ آف پاکستان,VII,۶۳

سینیٹ کی ڈبلیو ٹی او کمیٹی,۱۳۱

سینیٹ کی مالیاتی کمیٹی,۱۴۲

سینیٹر اسحاق ڈار (وزیر خزانہ),۳۷,۷۶,۷۷,۹۲,۱۲۵

سینیٹر انور بھنڈر,۱۴۳

سینیٹر ایس ایم ظفر,۸۴

سینیٹر پروفیسر خورشید احمد,VI, VII, IX, X,۳,۱۲, ۳۱,۴۱,۵۱,۶۳,۱۰۵,۱۱۷,۱۱۹,۱۳۸,۱۴۶,۱۵۷, ۱۹۳

سینیٹر خورشید شاہ,۱۸۷

سینیٹر جاوید جبار,۲۵۴

سینیٹر رحمت اللہ کاکڑ,۵۹

سینیٹر طارق عظیم,۲۳۰

سینیٹر فاروق نائیک,۵۹

سینیٹر کامل علی آغا,۵۸

سینیٹر محمد اکرم,۲۴۳

سینیٹر میاں رضا ربانی,۵۴,۵۸,۱۵۹,۱۶۵

سینیٹر نثار میمن,۴۷

سینیٹر وسیم سجاد,۶۳,۶۴,۶۷,۷۱,۷۲,۱۸۵

ش

شپنگ ایجنٹس,۱۳۰

شماریاتی بیورو,۱۷۲

شمسی توانائی,۲۳۹

شہر کاری,۲۶۱

شہروں کی طرف مائیگریشن,۲۵۹

شہری ترقیاتی پالیسی,۲۶۱

شوکت عزیز (وزیر اعظم),۳۱,۴۲,۶۶,۱۳۷,۱۴۵,۱۶۰

شوگر پالیسی,۲۰۹

شیر شاہ سوری,۲۵۷

ص

صارفین کے مفادات کا تحفظ,۸۰

صدارتی فنڈ,۲۱۷

صنعت کاری,۷,۱۰,۱۵,۹۷/ صنعتوں کا بحران,۱۸۶/ صنعتی پیداوار,۶۵,۶۷,۱۴۹,۱۸۷,۱۸۸/ صنعتی ترقی,۷۰,۱۸۶,۱۸۷

صوابدیدی اختیار,۱۸۰

صوبائی خود مختاری,۲۲,۹۱,۱۷۲,۱۹۵

صوبہ سرحد (خیبر پختون خوا),۵۰,۷۶,۸۹,۹۰,۹۱,۹۲, ۱۲۹,۱۷۱,۲۳۴,۲۴۲,۲۴۸,۲۴۹/ شمال مغربی صوبہ سرحد,۲۴۲/ سرحد کا پن بجلی منافع,۱۷۱/ صوبوں پر قرضوں کا بوجھ,۱۴۱/ این ڈبلیو ایف

پی(KPK),۱۴۱
صوبوں کے درمیان انصاف اور توازن,۱۵۵

ع

عالمگیریت,۵۲,۷۹,۱۲۰
عالمی بینک (ورلڈ بینک),۳,۴,۹,۱۱,۲۰,۲۶,۲۸,۳۹, ۴۲,۷۷,۹۳,۱۱۹,۱۵۱,۱۶۰,۱۶۵,۱۸۲,۱۹۳, ۲۰۳,۲۱۶,۲۴۵,۲۶۰
عبدالحفیظ شیخ (وزیر خزانہ),۱۹۳
عدلیہ پر حملہ,۱۵۸
عدم مرکزیت,۹۱
عراق,۴۶/ عراق کویت جنگ,۴۶/ عراق کی جنگ, ۴۷
عشرت حسین، ڈاکٹر (گورنر اسٹیٹ بینک),۱۲۲
عشر کا نظام,۲۱
علاقائی عدم مساوات کا خاتمہ,۱۰۰
عمران خان (وزیر اعظم),۱۲۲
عمر ایوب خان (وزیر خزانہ),۱۴۵
عوام کی بنیادی ضروریات,۱۵۴
عوام کی قوت خرید,۲۱۷

غ

غربت,۱۰,۲۰,۲۱,۴۲,۴۵,۴۹,۶۷,۶۸,۷۰,۷۹,۹۴, ۹۶,۹۹,۱۰۰,۱۰۷,۱۲۰,۱۲۶,۱۲۷,۱۳۱,۱۳۷, ۱۴۸,۱۴۹,۱۶۰,۱۶۱,۱۶۳,۱۶۴,۱۶۷,۱۶۸,۱۷۴, ۱۸۲,۱۹۰,۱۹۷,۲۰۱,۲۰۹
غربت اور آمدنی کی تقسیم,۹۹/ غربت کے اعداد و شمار, ۶۷/ غربت کے بارے میں حقائق,۶۷/ غربت کے خاتمے کے پروگرام,۱۰۷/ غربت کی سطح,۴۲, ۹۴/ غربت کی لکیر,۶۷,۶۸,۱۴۹,۱۹۰,۱۹۷/
غربت میں کمی,۴۵,۴۹,۶۷,۹۵,۹۶,۱۳۲,۱۶۰, ۱۶۴/ غریب پرور بجٹ,۱۵۱
غلام اسحاق خان (صدر),۳
غیر ترقیاتی اخراجات,۴۵,۷۶,۱۱۵,۱۶۶,۱۶۷,۱۸۵, ۱۸۶
غیر معیاری زرعی ادویات,۲۴۷
غیر ملکی قرضے,۴۴,۱۴۱,۱۴۲
غیر سودی بینکاری,۱۳۰
غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر,۳۷

ف

فارسی,۶۵
فارماسیوٹیکل کمپنیوں,۲۵۲/ فارمیسی کی صنعت,۲۲۲
فرانس,۳۵,۱۳۷
فرٹیلائزر,۲۴۶
فرنٹیئر کانسٹیبلری,۸۶
فضائی آلودگی,۱۸۵
فکسڈ رجسٹریشن ٹیکس,۱۲۵
فن لینڈ,۱۳۷
فنانس بل,۸,۱۴۰,۱۴۶,۱۸۰
فنانس کمیٹی,۱۴۳,۱۵۷,۱۶۹,۱۷۲
فنی و تکنیکی تعلیمی مقتدرہ,۱۴۱
فوج اور سول تعلقات,۱۱۱
فوج کا بجٹ,۸۴,۸۸/ فوج کا سیاست میں ملوث رہنا, ۱۰۷/ فوج کا سیاسی کردار,۱۱۴/ فوجی صلاحیت کا خاتمہ,۲۸/
فوڈ سیکورٹی کا مسئلہ,۲۴۴,۲۴۶
فی کس آمدنی,۶۷,۱۴۸

ق

قادر پور گیس فیلڈ,۳۶
قائمہ کمیٹی برائے مالیات,۱۳۵
قحط سالی,۱۶۰/ خشک سالی,۱۴۹
قرآن پاک,V,۱۳۶,۲۱۹,۲۲۵/ قرآن و سنت,V
قرض بمقابلہ معاشی منصوبے,۳۸/ قرض کی شرائط,
۱۳۴/ قرضوں کے اخراجات, ۸۶, ۱۵۸, ۱۸۳/
قرضوں کے معاہدے,۱۷۰/ قرضوں کی معیشت,
۱۳۵/ قرضے اثاثے بنانے کیلیے,۱۳۴
قومی احتساب,۸۶
قومی انتخابات,۳۱
قومی آمدنی,۶۹,۹۳,۹۴
قومی بجٹ میں دفاعی اخراجات,۱,۱۰۵
قومی سلامتی کونسل,۱۰۸,۱۰۹
قومی سوشل سیکورٹی سسٹم,۱۶۳
قومی مالیاتی ایوارڈ,۴۸,۸۹,۹۲,۱۷۱
قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ,۸۹
قومی انشورنس,۱۷۳
قومیائے گئے بینکوں,۲۲
قیمتوں میں استحکام کا فنڈ,۲۳۱
قیمتوں میں اضافہ,۹,۲۶,۴۳,۴۹,۲۰۹,۲۱۰,۲۲۶,
۲۲۷,۲۳۵,۲۴۷

ک

کابینہ کی دفاعی کمیٹی,۱۰۸
کاربن سرچارج,۲۳۰
کانگریس,۲۱۵
کپاس کے بیج پر سیلز ٹیکس,۱۳۰
کپاس کی پیداوار,۱۳
کپڑے کی صنعت,۴۴,۱۰۰
کترینہ طوفان,۲۲۶
کثیر القومی ادارے,۲۲۲,۲۲۳/ کثیر القومی کمپنیاں,
۱۵۳
کچی آبادیاں,۲۰۸,۲۶۰
کراچی,۱۲,۴۷,۱۷۶,۲۱۰,۲۲۷,۲۵۲,۲۶۰,۲۶۱
کرونا وبا,۴۳/ وبائی مرض کورونا,۵۷
کساد بازاری,۳۲
کشمیر,۲۸
کل ترقیاتی بجٹ,۴۴
کل وقتی صدر,۹۸,۲۰۹
کل وقتی وزیر اعظم,۲۰۹
کل وقتی چیف آف آرمی اسٹاف,۲۰۹
کلفٹن,۱۸,۱۷۶
کھلی منڈی,۱۹۸
کم از کم اجرت کی شرح,۱۸۹
کمرشل بینکوں,۲۲
کمیٹی کی رپورٹ,۱۲,۲۰,۲۴
کنٹرولڈ بہاؤ,۱۳
کنسٹرکشن انڈسٹری,۹۵
کوسٹ گارڈز,۸۶
کویت,۴۶,۱۳۷,۲۲۱
کے-الیکٹرک,۵۷/ کے ای ایس سی,۵۷
کیپٹل گین ٹیکس,۵۳,۵۷,۱۶۶,۱۷۷
کیپٹل ویلیو ٹیکس,۵۶,۱۳۰,۱۷۵,۱۷۷
کھیلوں کی صنعت,۲۷
کیلیفورنیا,۲۳۹
کینیڈا,۱۳۷

گ

گردشی قرضوں کا مسئلہ,۲۳۷
گندم کی پیداوار,۲۴۹

گورنر سٹیٹ بینک,۱۲۲
گیس اور تیل کی کثیر بین الاقوامی کمپنیاں,۳۶
گیس رائلٹی، بلوچستان کا حق,۱۷۲
گیس کا بڑا اہم عنصر,۲۴۶
گھریلو صنعتیں,۱۶۴,۱۲۴

ل

لاطینی امریکہ,۹,۲۱۸
لاہور,۹۳,۱۰۰,۱۸۴,۲۵۲
لندن,۲۲۶
لوڈشیڈنگ,۴۷,۱۸۴,۱۸۷,۲۳۵,۲۴۷
لوکل باڈیز,۱۰۹
لیاری,۱۷۶
لیاقت علی خان (وزیر اعظم),۱۴۵
لیبر سروے,۹۵,۹۶/ لیبر فورس,۱۹,۹۷/ لیبر آرگنائزیشن (انٹر نیشنل),۲۴۶
لیڈر آف دی ہاؤس,۱۴۳
لینڈ مافیا,۵۰,۲۶۱

م

ماحولیاتی آلودگی,۲۵۹
مارشل لاء,۱۱۰
مال مویشی,۱۴۸,۱۴۹
مالدیپ,۱۵۹
مالیاتی اختیارات کی منتقلی, ۵۹/مالیاتی بد نظمی, ۲۰۰/ مالیاتی بل,۵۴,۵۵,۱۴۷,۱۶۱,۱۷۰/مالیاتی پالیسی, ۳۲,۴۳,۵۲,۷۲,۹۸,۹۹,۱۵۱,۱۵۳,۱۸۱,۱۸۲, ۱۸۷,۱۸۹/مالیاتی خسارہ, ۱۵۹,۱۶۶, ۱۸۰/مالیاتی نظم وضبط,۷۶,۸۰,۹۷,۱۱۵,۱۵۹/مالیاتی وبینکاری خدمات,۱۷۴
مبسوط استحکام,۱۱۹/ مبسوط وسیع استحکام,۹۷,۱۲۰,۱۳۲
متبادل توانائی کے فروغ کے لیے ایک بورڈ,۲۴۱
متحدہ عرب امارات,۱۰۲
متناسب نمائندگی,۱۳۸
مجلس منتظمہ,۲۲۳
محنت مزدوری کا جائزہ,۹۵
مخدوم شہاب الدین (سابق وزیر صحت),۲۵۶
مدینے ہجرت,۲۴۳
مڈل ایسٹ,۲۲۶
مرسڈیز (کار),۲۵۸
مرکزی شماریاتی,۹۷
مذاہب عالم,VII
مسز تھیچر (سابق وزیر اعظم برطانیہ),۷۹
مسلم لیگ (ق),۶۳
مسلم لیگ (ن),۶۳
مسلمان معاشرے,۱۳۶,۲۱۴
مسلمانوں کے لیے وقف,۲۴۳
مشترکہ مفادات کونسل,۲۴۲
مشرقی پاکستان,۱۰۰
مصالحت,۱۳۹,۱۴۰
مصر,۴۶,۱۹۴
مصنوعی ترقی کا دور,۱۷۹
مضاربہ ایکٹ,۱۷۰
مطالبات زر,۸۴,۲۰۴
معاشی استحکام,۱۸۹
معاشی آزادی اور عالمی اداروں کا کردار, ۸/معاشی ترغیبات, ۲۱۴/معاشی حکمت عملی, IX, ۱۱۷, ۱۳۶/معاشی خود مختاری, ۱۳۵/معاشی سرگرمی کے لیے قواعد وضوابط,۱۲۰/ معاشی صورت حال, VI, VII/معاشی عدم مساوات , ۱۸۲/معاشی غلامی کا راستہ, ۲۸/ معاشی منصوبہ بندی, IX/

معاشی وجوہ کی بناء پر خود کشی کے واقعات, ۲۲۵
معیشت پر سرمایہ داروں کی گرفت, ۱۲۰/ معیشت کا دباؤ, VII/ معیشت کے پالیسی, ۷۱/ معیشت کی توسیع, ۱۸۲
معین الدین قریشی (نگراں وزیر اعظم), ۳, ۴, ۱۲
مغربی پاکستان, ۱۰۰
مقبوضہ کشمیر, ۷۵
مقدس گائے, ۱۰۶
مکہ, ۱۳۶
ملائشیا, ۳۳, ۳۶
ملتان, ۱۸۴
ملک کی سلامتی کے تقاضے, ۱۱۱
ملکی برآمدات کی نمو, ۶۶
ملکی معیشت میں منفی شرح نمو, ۵۷
ممبران پارلیمنٹ کا کوٹہ, ۲۴
منڈی کی معیشت, ۳۴, ۳۵, ۱۲۰, ۱۹۹/ منڈی کی معیشت اور نجکاری, ۳۴, ۱۵۳
منصوبہ بندی کمیشن, ۴۴, ۷۷, ۹۵, ۱۳۵, ۱۶۵, ۱۶۹, ۱۸۷, ۱۹۰, ۲۴۰
منقولہ اثاثہ جات, ۵۳
مواصلات, ۷۱, ۱۳۳
میریٹ (ہوٹل), ۱۴۸
میکرو استحکام (Macro Economic Stability), ۳۳
میمورنڈم کا شیڈول, ۸۴

ن

ناروے, ۱۳۷
نائن الیون, ۱۶۱
نجکاری, ۱۰, ۲۸, ۳۴, ۳۵, ۳۷, ۷۵, ۸۷, ۹۷, ۱۰۱, ۱۰۲, ۱۲۰, ۱۵۲, ۱۷۳, ۱۹۳, ۱۹۸, ۲۲۳, ۲۲۴/ نجکاری پالیسی, ۱۰۲, ۱۷۳/ نجکاری کا معاملہ, ۸۷/ نجکاری کی پالیسی پر نظر ثانی, ۱۰۱
نجی شعبہ کا کردار, ۱۹۸
نچلی سطح پر اختیارات کی منتقلی, ۹۱
نظریاتی تحفظ, ۱۱۳
نقد امدادی بے نظیر کارڈ, ۱۶۳
نکارا گوا, ۲۱۸
نگراں وزیر اعظم کے اقتصادی پیکج, ۳۱
نو آبادیاتی دور, ۸۴
نواز شریف، میاں محمد (وزیر اعظم), ۳, ۱۲, ۲۷
نیب (قومی احتساب بیورو), ۲۱۲
نیپال, ۱۵۹
نیٹ ہائیڈل پراجیکٹ, ۲۳۴
نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی, ۴۷
نیلم جہلم ڈیم, ۴۷
نیوزی لینڈ, ۱۳۷

و

واپڈا, ۲۵, ۲۶, ۷۵, ۸۹, ۹۰, ۲۳۳, ۲۳۴
وحی, V
واشنگٹن, ۹, ۱۷, ۲۰, ۹۸, ۱۲۰, ۱۲۱, ۲۱۸
واشنگٹن اتفاق رائے, ۹۸, ۱۲۰, ۱۲۱
وائسرائے, ۸۴
ودہولڈنگ ٹیکس, ۲۰۳
ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن, ۱۳۱, ۱۵۳
وزارت تجارت, ۱۳۱
وزارت توانائی, ۲۳۹, ۲۴۲
وزارت صحت, ۲۵۵
وزارت قانون, ۲۰۵, ۲۴۲
وزیر اعظم کے اخراجات, ۱۸۳
وزیر اعظم سیکرٹریٹ, ۱۸۳

ونڈ پاور, ۲۴۲
وی اے جعفری (اکنامک ایڈوائزر), ۲۷
ویلیو ایڈڈ ٹیکس بنگلہ دیش میں, ۶۰

ہ

ہارورڈ (یونیورسٹی), ۱۱۱,۸۸
ہاؤسنگ پالیسی, ۲۶۱,۲۵۹,۲۵۷
ہجرت, ۲۶۱,۲۰۸
ہوائی چکی, ۲۳۹

ی

یوٹیلٹی سٹور, ۲۱۲,۷۵
یورپ, ۲۱۵,۱۹۸,۱۸۸,۱۸۷,۱۶۴,۱۵۳,۳۸,۳۴
یورپی اقتصادی برادری, ۱۰
یورپی یونین, ۱۲۵,۹۳ / یورپی یونین کی زرعی پالیسی, 215
یوروبانڈ, ۱۳۴
یوروگوئے, ۱۰
یوریا اور ڈی اے پی, ۲۴۶
یوریا کی پیداوار, ۲۴۶
یوسف رضا گیلانی (وزیراعظم), ۱۶۱,۴۷,۳۱
یونائیٹڈ بینک, ۷۸
یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز, ۵